SHBLI KI NASR KA TANQIDI MOTALA

ABSTRACT

SUBMITTED FOR THE AWARD OF THE DEGREE OF

Doctor of Philosophy

IN

URDU

By

KHIZAR HAYAT

Under the Supervision of

Prof. QAZI JAMAL HUSSAIN

DEPARTMENT OF URDU
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH (INDIA)

2004

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

شبلی کی نثر کا تنقیدی مطالعہ

تلخیص

برائے پی ایچ -ڈی

نگراں

پروفیسر قاضی جمال حسین

مقالہ نگار

خضر حیات

شعبۂ اردو

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۲۰۰۴ء

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

T-7234

Maulana Azad Library, Aligrh Muslim University

تلخیص

شبلی کی نثر کا تنقیدی مطالعہ

علامہ شبلی کی ایک ہی وقت میں تین حیثیتیں ہیں۔ وہ بہت بڑے فاضل اور علامہ تھے۔ اردو نثر نگاری میں اساطین اربعہ میں ان کا بھی شمار تھا اور اردو شاعری کو نئے رجحانات اور نئے نمونے سے آشنا کیا۔

شبلی کی علمی قابلیت اور ملی خدمات روزِ روشن کی طرح واضح ہیں۔ شبلی کو قدرت نے ایسے دور میں پیدا کیا جب کہ ملت اسلامیہ کو ان جیسی شخصیت کی بڑی ضرورت تھی۔ غدر کے بعد ہندوستان کی علمی دنیا میں قحط الرجالی کا دور دورہ تھا اسلامی علوم وفنون، اسلامی کتب خانوں اور اسلاف کے کارناموں کی روز بروز بے وقعتی ہوتی جارہی تھی۔

ایسے دور میں اسلام کا صحیح داعی اور ترجمان کوئی ہوسکتا تھا تو وہ صرف شبلی تھے۔ شبلی نے شروع میں سرسید کے ساتھ اشتراک عمل کیا لیکن دونوں کے نظریات میں بنیادی فرق تھا۔ سرسید کا نظریہ یہ تھا کہ دین کے (دین کے وسیع معنی میں لیں جو پورے نظام حیات پر حاوی ہے بلکہ اس معنی میں کہ صلوۃ وصوم ہی تک اس کا دائرہ ہے) علاوہ ہر چیز میں اہل مغرب کی پیروی کرنے سے ہماری ترقی ہوسکتی ہے لیکن شبلی کا خیال تھا کہ ہماری ترقی کا انحصار صرف تیرہ سو سال پیچھے ہٹنے پر منحصر ہے اسی نظریہ نے شبلی کو بہت دنوں تک علی گڑھ سے منسلک نہیں رہنے دیا اس کے علاوہ شبلی اسلامی علوم وفنون کے یگانہ روزگار تھے۔ اسگر کسی کو اس دور میں زمانہ کے مذاق کے مطابق اسلام کی نمائندگی کرنے کا حق تھا تو وہ صرف شبلی تھے۔ شبلی کی تصانیف کا لٹریچر کا ایک ایک لفظ اس کا شاہد ہے آئندہ نسلیں اس سے اسی طرح مستفید ہوں گی جیسا کہ شبلی کے دور میں استفادہ کیا گیا شبلی یورپین تہذیب سے نہ کبھی مرعوب ہوئے اور نہ انہیں کبھی اپنی بے مائگی اور کمتری کا احساس ہوا۔ ان کو یہ یقین تھا کہ اپنا ماضی اور اپنا تمدن اس سے بھی زیادہ روشن اور درخشاں ہے ان کو اپنے مذہب پر ناز تھا، اپنے تمدن پر فخر تھا اور اپنی تہذیب سے عشق تھا اسی بنا پر ان کا خیال ہوا کہ اسلامی علوم وفنون اور اسلاف کے کارناموں کی

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

تجدید نو ہو جائے اور یہ ذخیرہ ایک جدید شکل میں ملت کے سامنے آجائے اس کے لئے انہوں نے جو بیڑا اٹھایا تھا، اس کے احسان سے قوم قیامت تک زیر بار رہے گی۔

شبلی کی علمی اور ادبی کاوشوں کے مرتب اور تجزیاتی مطالعہ کے لئے موضوع کو حسب ذیل ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

پہلے باب میں نثر کے مفہوم اور خصوصیات کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس کے لئے نثر کی مختلف اقسام کے بارے میں مختصراً بتایا گیا ہے اور علمی نثر دوسری نثر سے کیسے مختلف ہوتی ہے۔ اس کو بھی واضح کیا گیا ہے۔ اور علمی نثر کے مفہوم اور خصوصیات پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔

دوسرے باب میں شبلی کی تاریخ نویسی اور سوانح نگاری کا ذکر ہے۔ اس میں پہلے یہ بتایا ہے کہ تاریخ کسے کہتے ہیں۔ اچھی تاریخ کی کیا شرائط ہیں اور شبلی کی تاریخ نویسی کی کیا خصوصیات ہیں اس کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے بعد شبلی کے'' اسلوب پر روشنی ڈالی گئی ہے، الفاروق، المامون، الغزالی اور سوانح مولانا روم کے پیش نظر شبلی کی سوانح نگاری کی خصوصیات متعین کی گئی ہیں اور ان کا تحقیقی مطالعہ کیا گیا ہے۔ شبلی نے اپنے مضامین اور مقالات میں تاریخی عناصر کی آمیزش کی ہے۔ ان عناصر کے بارے میں اظہار خیال کیا گیا ہے۔

تیسرے باب میں شبلی کی تنقید نگاری پر اظہار خیال کیا گیا ہے، پہلے تنقید کیا ہے یہ بتانے کی کوشش کی ہے اور پھر تنقید کی زبان اور اسلوب کیا ہونا چاہئے یہ بتایا ہے شبلی کی تنقید نگاری کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ شعر العجم شبلی کی مایہ ناز تصنیف ہے اس پر نکتہ چینی کا حق تو نہیں ہے لیکن چونکہ تیسرے باب کا ایک موضوع ہے اس لئے ممتاز نقادوں کی آراء کی روشنی میں اس کا تنقیدی جائزہ لینے کی سعی کی گئی ہے۔ موازنہ انیس و دبیر پر جانبداری کا الزام لگایا جاتا ہے اور اس میں کسی حد تک سچائی بھی ہے اس کو عملی تنقید کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے اور ساتھ ہی اس کا ادبی محاکمہ بھی پیش کیا گیا ہے ادبی تنقید کی روشنی میں شبلی کے خطبات اور مقالات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

چوتھے باب میں شبلی نے علم کلام کی تعریف بیان کی ہے اور بتایا ہے کہ مذہبی عقائد کو، عقلی دلائل کے ذریعے ثابت کرنے کو علم کلام کہتے ہیں پھر اس کے بعد اس کی اہمیت اور ضرورت پر روشنی ڈالی ہے علم کلام کی تاریخ متعین کی گئی ہے۔ اور شبلی کی علم کلام کی اہم خصوصیات کا بیان ہے۔

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

پانچویں باب میں شبلی کے مقالات کی ادبی اور تاریخی حیثیت پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے شبلی نے ہر موضوع پر مضامین لکھے ہیں اور وہ اپنا ایک منفرد اسلوب رکھتے ہیں جسکی جھلکیاں انکے مضامین میں ملتی ہیں۔

چھٹے باب میں شبلی کی متفرق خدمات کا تذکرہ ہے شبلی نے ہر میدان میں طبع آزمائی کی ہے اور ہر میدان میں اپنے نمایاں نقوش چھوڑے ہیں جن سے بعد کے لکھنے والوں نے رہنمائی حاصل کی ہے اسمیں سفرنامہ رسائل وخطبات اور دیگر نثری تحریریں شامل ہیں۔

شبلی کے علمی کارناموں کے ساتھ ان کی علمی جدتیں بھی اپنی مثال آپ ہیں۔شبلی نے علمی دنیا میں دو بڑی جدتیں کیں۔ایک سیرۃ النبیؐ کی تصنیف میں نئے دھنگ اور نئے طریقہ کی ایجاد اب تک یہ ہوتا رہا تھا کہ ان ہی تاریخی واقعات کو دہرایا جاتا تھا جو مستند اور غیر مستند کتابوں میں مذکور تھے۔فن تحریر بھی بالکل فرسودہ طریقہ پر تھا، جس میں کسی قسم کی بھی جدت نہیں تھی۔ان واقعات میں موضوعات کا بھی بڑا انبار تھا۔جن کو پیش کر کے مستشرقین اسلام پر اعتراضات وارد کرتے تھے۔شبلی نے سیرت کا اولین ماخذ قرآن وحدیث کو قرار دیا اور واقعات کی تحقیق کے لئے محدثانہ اصول انتخاب کیا جو دنیائے تحقیق کا مستند ترین اصول ہے اور تحریر کا اسلوب وترتیب ایسا اختیار کیا کہ اعتراضات کا ذکر کئے بغیر معترض کا پورا پورا جواب آجائے اس حیثیت سے سیرۃ النبیؐ کامیاب ترین اور بے نظیر تصنیف ہے۔

دوسری یہ کہ اس وقت تک تصنیف وتالیف کا طرز یہ تھا کہ دوران کتاب میں ادھر ادھر سے عبارتیں بھی نقل کی جاتی تھیں۔دوسروں کے افکار وخیالات کو بھی لیا جاتا تھا لیکن ماخذ کو بتانے اور حوالہ دینے کا رواج نہیں تھا تمدن جدید کی تصنیفی دنیا میں یہ بڑا نقص تھا اس کے علاوہ اس سے بددیانتیاں بھی زیادہ ہوتی تھیں۔شبلی نے اپنی تحریر میں ہر بات کا حوالہ دینے اور ماخذ بتانے کا رواج ڈالا۔

شبلی کے ذریعہ اردو میں بڑا انقلاب ہوا سرسید کے دور تک اردو زبان شعروشاعری کی زبان تھی اگرچہ علمی کتابیں بھی تصنیف ہوئیں لیکن ان کا کوئی وزن نہیں تھا، سرسید نے سب سے پہلے اردو کو علمی مضامین سے آشنا کیا اور جدید اسلوب پیش کیا۔جو کہ آسان اور سادہ تھا اسی دور میں محمد حسین آزاد کی رنگین زبان نے اردو کو اور زیادہ خوبصورت زبان بنایا۔حالی کی زبان بھی خاص طرز اور اسلوب کی تھی ان تینوں کے ہوتے ہوئے شبلی کا طرز اسلوب اپنی نوعیت میں یکتا اور بہت سی حیثیتوں سے سب پر فائق اور سدابہار ہے۔محققین کا ماننا ہے کہ نثر نگاری صرف تمدن کی پیداوار ہوتی ہے۔تمدن کے عروج کے ساتھ ترقی کرتی ہے۔علوم وفنون

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

جوں جوں ترقی کرتے جاتے ہیں۔ اسی نسبت سے اس میں شائستگی اور حسن پیدا ہوتا ہے اور اسی رفتار سے زبان منجھتی ہے اور اعلیٰ سے اعلیٰ ہوتی جاتی ہے۔

شبلی کی تحریر کی سنجیدگی، ان کے الفاظ و معنی کی صحت اور ان میں پختگی عبارت کی چستی اور اس میں روانی اور شستگی، ان خصوصیات کا الفاظ میں بیان نہیں ہوسکتا۔ شبلی کا اسلوب عرصۂ دراز تک ادباء کا نمونہ بنا رہے گا شبلی کی تحریر کی ہر مکتب فکر کے لوگ پیروی کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کو اپنے لئے مثال اور نمونہ تصور کرتے ہیں۔

اردو پر شبلی کا بڑا احسان ہے۔ شبلی نے ایک زندہ و جاوید اسلوب ہی نہیں دیا بلکہ اردو زبان کو علمی حیثیت سے بھی شرف بخشا ہے۔ شبلی سے پہلے اردو کی وہ حیثیت نہیں تھی جو شبلی کے بعد حاصل ہوئی۔ شبلی نے اردو زبان کو جو قیمتی علمی سرمایہ عطا کیا ہے اس کا بڑا حصہ ایسا ہے، جس کی مثال کسی دوسری زبان میں نہیں ملے گی۔ انہوں نے جس تحقیقی سرمایہ کا اضافہ کیا ہے، اس پر اردو زبان ہمیشہ فخر کرسکتی ہے اس سے دوسری زبانیں بھی اپنا دامن بھر سکتی ہیں۔ آج اردو اس قابل ہوئی کہ دنیا کی متمدن زبانوں سے آنکھیں ملا سکتی ہے۔

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

SHBLI KI NASR KA TANQIDI MOTALA

THESIS

SUBMITTED FOR THE AWARD OF THE DEGREE OF

Doctor of Philosophy

IN

URDU

By

KHIZAR HAYAT

Under the Supervision of

Prof. QAZI JAMAL HUSSAIN

DEPARTMENT OF URDU
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH (INDIA)

2004

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

شبلی کی نثر کا تنقیدی مطالعہ

مقالہ

برائے پی ایچ -ڈی

نگراں

پروفیسر قاضی جمال حسین

مقالہ نگار

خضر حیات

شعبۂ اردو

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۲۰۰۴ء

Maulana Azad Library, Aligrh Muslim University

TH-UBS18

Maulana Azad Library, Aligrh Muslim University

G 7234

Department of Urdu

ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY, ALIGARH-202002 (India)

Tel : { 700920,921
{Extn. 1631

Dated: 12.1.2005

Certified that this thesis entitled "**SHIBLI KI NASR KA TANQIDI MOTALA**" by **Mr. Khizar Hayat** is an original Research Work and has not been submitted for any other degree of this or any other University.

Counter signature

(Prof. Qazi Afzal Husain)
Chairman
Chairman,
Department of Urdu
A.M.U., Aligarh

(Prof. Qazi Jamal Husain)
Supervisor
Supervisor
Department of Urdu
A.M.U., Aligarh

Maulana Azad Library, Aligrh Muslim University

فہرست

پہلا باب

نثر ۶-۲۱

مفہوم اور خصوصیات

دوسرا باب

شبلی کی تاریخ نویسی اور سوانح نگاری ۲۴-۹۹

ا- تاریخ نویسی کے مطالبات۔

ب- نثر کا اسٹائل۔

ج- الفاروق اور المامون کا تاریخی اور تحقیقی مطالعہ۔

ح- الغزالی اور مولانا روم ۔

د- مضامین اور مقالات میں تاریخی عناصر۔

تیسرا باب

شبلی کی تنقید نگاری ۱۰۱-۱۶۷

ا- تنقید کی زبان اور اسلوب

ب- شعر العجم کا تنقیدی جائزہ

ج- موازنۂ انیس و دبیر اور عملی تنقید کے مطالبات

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

چوتھا باب

علم کلام ۱۶۹-۱۸۵

ا-علم کلام کی اہمیت اور ضرورت شبلی کی نظر میں

ب-تاریخی پس منظر

ج-شبلی کے علم کلام کے امتیازات

پانچواں باب

مقالات اور مضامین ۱۸۷-۱۹۴

ا- مقالات کی ادبی اور تاریخی حیثیت

ب- موضوعات اور اسلوب بیان

چھٹا باب

متفرقات ۱۹۶-۲۱۶

ا- سفرنامہ-تحقیقی اور تنقیدی جائزہ

ب- رسائل اور خطبات

ج- دیگر نثری تحریریں

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

حرف آغاز

اردو کی ادبی تاریخ میں شبلی کا نام ان کی کثیر الجہات اور بلند پایہ ادبی مرتبہ کے سبب کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ شبلی نے اردو میں تاریخ، تنقید، تحقیق اور سیرت نگاری کے میدان میں جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں وہ زبان کا گراں قدر سرمایہ ہیں۔ علمی اور ادبی خدمات کے علاوہ شبلی کا مخصوص طرز نگارش مطالعہ کا ایک مستقل موضوع ہے۔ شبلی کی حیات، ان کی شخصیت اور ان کے کارناموں پر یوں تو کئی اہم اور لائقِ ذکر کام ہو چکے ہیں اور ان کے سوانح نگاروں اور ناقدین نے شبلی کی ادبی قدر و قیمت کا حق ادا کیا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ شبلی کی کثیر الجہات علمی خدمات کا احاطہ ایک دشوار عمل ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان پیش رو نقادوں اور سوانح نگاروں کے خیالات کی روشنی میں شبلی کی علمی اور ادبی کاوشوں کا از سرِ نو تجزیاتی مطالعہ کیا جائے تا کہ بدلتے ہوئے ادبی تناظر میں شبلی کی تحریروں کی معنویت نمایاں ہو سکے۔ اس ضرورت کے پیش نظر ''شبلی کی نثر کا تنقیدی مطالعہ'' مقالہ کا موضوع منتخب کیا گیا ہے۔

شبلی اور ان کے رفقاء ایک نظام شمسی کی طرح اپنے اپنے محور پر گردش کرتے نظر آتے ہیں اور ان کا مرکز کشش اسلام ہے۔ شبلی مسلمانوں کی اصلاح، تنظیم و تعلیم کا مقصد لے کر آگے بڑھے۔ اور جہاں تک ہو سکا انہوں نے اپنے عمل اور تصانیف سے اس خدمت کو انجام دیا سر سیّد، حالؔی، آزاد، نذیر احمد، محسن الملک، وقار الملک، سب کی علمی و عملی کوششوں کا مقصد مسلمانوں کی فلاح اور بہبود تھا، لیکن ان میں سب سے جامع ہستی شبلی کی ہے۔

مولانا شبلی کی شخصیت ہمہ گیر تھی ان کے کارنامے علمی اور عملی دونوں میدانوں میں یکساں ہیں مسلمانوں کی تاریخ، ان کے علوم و فنون، عربی زبان، فارسی ادب، جدید و قدیم فلسفہ پر شبلی کی نظر ان کے معاصرین میں سب سے زیادہ وسیع تھی۔ اسلام پر یورپ کے معترضین کا جواب دینے کے لئے جس وسعتِ نظر، ذوقِ تلاش، طرز استدلال اور نکتہ سنجی کی ضرورت تھی اس کی مثال شبلی کے علاوہ دوسری نہیں ملتی۔

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

اسلام کی حمایت اور قوم کی فلاح و بہبود کا جذبہ شبلی کے رگ و پے میں اس طرح سرایت کر گیا تھا کہ ہر وقت قوم کے تنزل اور مسلمانوں کی زبوں حالی کا سبب سوچتے اور مداوا تلاش کرتے مرض معلوم کرتے اور دوا تجویز کرتے اور اس ذوق وشوق میں عمر عزیز صرف کر دی۔

شبلی کی اصلاحات کا دائرہ بہت وسیع تھا اور میدان میں انہیں کسی نہ کسی حد تک کامیابی ضرور ملی انہوں نے اردو زبان کو ایک مختصر سی مدت میں اس مقام و مرتبہ پر پہنچا دیا۔ معاصر ادب اور انشا پردازوں پر شبلی کے ہمہ گیر اثرات پڑے۔

مقالے کے بحث ونظر کو حسبِ ذیل چھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں نثر کا مفہوم اور خصوصیات ہیں۔ دوسرے باب میں شبلی کی تاریخ نویسی اور سوانح نگاری پر بحث ہے۔ تیسرے باب میں شبلی کی تنقید نگاری پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ چوتھے باب میں علم کلام پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ پانچویں باب میں شبلی کے مقالات اور مضامین کا تذکرہ ہے چھٹے باب میں شبلی کی متفرق خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

پہلے باب میں سب سے پہلے یہ بتایا گیا ہے کہ نثر کس کو کہتے ہیں اچھی نثر میں کیا خصوصیات ہوتی ہیں۔ پھر اس کے بعد لغوی اور معنوی اعتبار سے نثری اقسام کا بیان کیا گیا ہے۔ ادبی نثر تخلیقی نثر اور علمی نثر کسے کہتے ہیں اس کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور پھر علمی نثر کے مفہوا اور خصوصیات متعین کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

دوسرے باب کو پانچ ذیلی عنوانات میں بانٹا گیا ہے اس میں تاریخ نویسی کے کیا مطالبات ہیں، شبلی کی نثر کا کیا اسٹائل تھا، الفاروق، المامون، الغزالی اور سوانح مولانا روم کا تاریخی اور تحقیقی مطالعہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور مقالات اور مضامین میں جو تاریخی عناصر پائے جاتے ہیں ان کی نشاندہی کی گئی ہے۔

تیسرے باب میں شبلی کی تنقید کی زبان اور اسلوب کیا ہے، شعرالعجم کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے، موازنۂ انیس و دبیر اور عملی تنقید کے کیا مطالبات ہیں، موازنۂ انیس و دبیر پر اعتراضات کا ادبی محاکمہ کیا گیا ہے اور خطبات اور مقالات میں ادبی تنقید کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

چوتھے باب میں سب سے پہلے یہ بتایا ہے کہ شبلی کی نظر میں علم کلام کی کیا اہمیت اور ضرورت ہے علمِ کلام کا تاریخی پس منظر پیش کیا گیا ہے اور اس کے بعد شبلی کے علمِ کلام کے امتیازات کی وضاحت کی گئی ہے۔

پانچویں باب میں مقالات کی ادبی اور تاریخی حیثیت کا مطالعہ کیا گیا ہے اور مضامین کے موضوعات اور اسلوبِ بیان کیا ہونا چاہئے، اس پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

چھٹے باب میں شبلی کے سفرنامے کا تحقیقی اور تنقید جائزہ لیا گیا ہے، رسائل خطبات کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہیں اور شبلی کی دیگر نثری تحریروں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

شبلی کی ادبی خدمات پر ایک تنقیدی مطالعہ سپرد قلم کرنے کا عزم اول تو مادرِ علمی قرطبۂ ہند علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور اس کے تاریخی شعبۂ اردو سے میری پڑھائی کی طویل وابستگی کا نتیجہ ہے۔ دوسرے اس موضوع پر باقاعدہ ایسی تصنیف کے نہ ہونے کا احساس بھی کہ جس میں شبلی کے تمام تر علمی کارناموں، امتیازات اور انفرادیت پر معروضی، حقیقت پسندانہ اور معتدل انداز سے لکھا گیا ہو۔

افراط وتفریط کے رویے نے شبلی کے ادبی مرتبہ کو افسوس کی حد تک دھندلا کر دیا ہے۔ کسی نے وہ ثابت کر دکھایا ہے جو وہ نہیں تھے، کسی نے اس سے بھی انکار کیا ہے جو وہ تھے اور یہ سب کچھ حقیقت پسندی اور ادبی دیانت کے نام پر ہوتا رہا ہے۔ اس مقالہ میں شبلی کی علمی نثر کا تنقیدی مطالعہ کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ حالانکہ میں اس کا اہل نہیں تھا۔ لیکن چونکہ مقالہ کا یہ عنوان میرے لئے مشورہ سے طے کیا گیا تھا اور مشورہ میں اللہ نے سراسر خیر رکھی ہے اس لئے مجھے اس ذمہ داری کو پورا کرنا تھا، میں نے غیر جانبدار رہتے ہوئے اور بیجا خارافگنی سے بچ کر یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ شبلی کیا تھے اور ان کا ادبی مرتبہ کیا ہے۔

اس مقالہ کی تیاری میں شبلی کی جن تصانیف سے خاص کر استفادہ کیا ہے اس میں سید سلیمان ندوی کی ''حیاتِ شبلی، اختر وقار عظیم کی ''شبلی بحیثیت مؤرخ''، شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں'' عبداللطیف اعظمی کی اور ناز صدیقی کی ''شبلی نقادوں کی نظر میں''۔

مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ مقالہ میں بعض نامساعد حالات کی بنا پر نظم وضبط اور ایجاز واختصار کا وہ حسن نہ پیدا ہو سکا جو میرے پیش نظر تھا بہر حال آج اس مقالہ کو مرحلۂ تکمیل تک پہنچاتے ہوئے میرے دل میں ان تمام محسنین اور معاونین کے لئے جذبۂ تشکر موجود ہے۔ جن کی اعانت کے بغیر اس مقالہ کو مرحلۂ تکمیل تک پہنچانا آسان نہیں تھا۔

سب سے پہلے اپنے نگراں کار پروفیسر قاضی جمال حسین صاحب کے لئے ممنونیت کا اظہار کرتا ہوں جنہوں نے دورانِ تحقیق میری بہترین رہنمائی فرمائی۔ بحیثیت ریسرچ اسکالر آپ کے ساتھ کام کرتے ہوئے مجھے بارہا محسوس ہوا کہ آپ بہترین استاد اور کامیاب نگراں تحقیق کے علاوہ بعض دوستانہ صداقتوں کے علمبردار بھی ہیں۔ شخصیت اور اسلوب کا جو حسن اور توازن آپ کی ذاتِ گرامی میں پایا جاتا ہے وہ نئے لکھنے والوں

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

اور طلباء کے لئے آئیڈیل کی حیثیت رکھتا ہے۔

یوں تو شعبۂ اردو کے تمام اساتذہ کے لئے میرے دل میں عقیدت اور احترام ہے لیکن پروفیسر قاضی افضال حسین صاحب، ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی صاحب، پروفیسر سید ہاشم صاحب، پروفیسر نادر علی خاں صاحب (ریٹائرڈ) پروفیسر نورالحسن نقوی صاحب (ریٹائرڈ) کا شکر گزار ہی نہیں ممنونِ احسان بھی ہوں کہ آپ نے دورانِ تعلیم و تحقیق بحیثیت استاد کے علاوہ ذاتی طور پر بھی میرے احوال و مسائل میں دلچسپی لی۔

میں محترمہ رابعہ سہیل صاحبہ کا تہہ دل سے شکر گذار ہوں جنہوں نے نہ صرف سیمینار لائبریری شعبۂ اردو کی نگراں کی حیثیت سے بلکہ ایک والدہ کی حیثیت سے بھی میری ہر طرح کی مدد فرمائی۔ ان کے علاوہ مولانا آزاد لائبریری کے شعبۂ اردو کے اسٹاف کا، بڑی بہن حنا آفرین آپا کا اور بھائیوں معراج بھائی، حسان احمد اور محمد اختر کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور دعاؤں کی درخواست کرتا ہوں۔

برادر محترم عثمان صاحب نے جس اپنائیت اور خلوص کا ثبوت دیا اور میرے مسودہ کو ٹائپ کا حسن عطا کرنے کی ذمہ داری قبول کی اس کا بیان الفاظ میں نہیں کیا جا سکتا ہے۔

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

پہلا باب

نثر ۶-۲۱

مفہوم اور خصوصیات

Maulana Azad Library, Aligrh Muslim University

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کسی بھی زبان کا شعری سرمایہ خواہ کتنا ہی اعلیٰ ہو، اس زبان کی ترقی کا ثبوت نہیں ہوسکتا ہے۔ جب ہم دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ زبانوں کے عروج وارتقاء میں شاعری سے زیادہ نثر کا حصہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو شاعری دوسری ہند آریائی زبانوں کے مقابلہ میں زیادہ بلند مرتبہ رکھتی ہے اور اردو شاعری کا یہ قیمتی سرمایہ اس زبان کے بولنے والوں کے لئے فخر کا سبب ہے لیکن نثری اصناف اور اردو کا نثری سرمایہ بھی کم لائق توجہ نہیں ہمارے ادیبوں نے اس کی طرف جتنی توجہ صرف کرنی چاہیئے تھی، نہیں کی۔

اس رائے سے تو سب کو اتفاق ہوگا کہ کسی زبان کے ارتقاء کے لئے کافی وقت درکار ہوتا ہے اور یہ بات بھی سچ ہے کہ نثر پر بہت عرصے تک شاعری کا رنگ غالب رہتا ہے۔ برسوں کی محنت کے بعد ہی نثر شاعری کے اثرات سے اپنے کو الگ کر پاتی ہے اور اس کے بعد ہی نثر کا اصل آہنگ ہمارے سامنے آتا ہے۔

تجربہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ فن کا کچھ حصہ ایسا بھی ہوتا ہے جسے ہم شاعری میں بیان نہیں کر سکتے ہیں۔ ایسے فنی مواد کو ہم نثر کا نام دے سکتے ہیں۔ ٹی-ایس-ایلیٹ نے اپنے ایک مضمون میں شاعری کو مقامی اور نثر کو عمومی اور عالمگیر بتایا ہے۔

اردو چونکہ نسبتاً کم عمر زبان ہے، اس لیے اس کے کسی قدر اچھے نمونے ہمیں ماضی قریب ہی میں ملتے ہیں۔ اردو نثر کے بنیادی اسلوب سے یہ مراد نہیں ہے کہ اس میں صرف فارسی یا ہندی الفاظ کی مناسب ترتیب کو استعمال میں لایا جائے۔ اردو میں اچھی نثر کے نمونے کم ملتے ہیں۔ عموماً نثر پر شاعری اور جذبات کا زور رہا ہے۔ اردو نثر میں زیادہ تر خطابت پیکر نگاری، پینتروں اور جذبات کی کارفرمائی رہی ہے۔

مشہور انگریزی نقاد کالرج نے نثر اور نظم کے فرق کو ان الفاظ میں واضح کیا ہے:

''نثر الفاظ کی مناسب ترین ترتیب ہے اور شاعری بہترین الفاظ کی بہترین ترتیب''۔[1]

اس میں سب سے اہم لفظ ترتیب ہے۔ ترتیب سے ہمارا دھیان فوراً اس طرف چلتا ہے کہ ہر فنی کارنامہ چاہے وہ نثر ہو یا شاعری ایک ARTEFACT ہے۔ دیکھا جائے تو ہر طرح کی تخلیق شعوری اور

---

[1] ادب اور تنقید-اسلوب احمد انصاری، صفحہ ۱۰۷

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

غیر شعوری عناصر سے وجود میں آتی ہے۔ بقول ٹی-ایس-ایلیٹ:-

''اس میں تجربہ کی شیرازہ بندی کا وہ خاموش اور نا قابل فہم عمل بھی پایا جاتا ہے جسے ہم غیر شعوری عنصر سے متعلق کر سکتے ہیں اور فنی اہتمام اور انصرام بھی، جو شعوری اور پیہم توجہ اور کوشش چاہتا ہے۔ جس نقطے پر یہ دونوں عناصر ملتے ہیں، وہیں فنی کارنامہ ظاہر ہو جاتا ہے۔''[1]

عمومی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نثر تعمیری صلاحیت اور قدرت کا مظہر ہوتی ہے۔

نثر میں اقتباس کا تصور پایا جاتا ہے، جو مختلف جملوں کی مدد سے ظہور میں آتا ہے۔ ان جملوں کو مزید الفاظ کے روپ میں تقسیم کر دیا جاتا ہے یہ الفاظ اپنے اپنے معنی رکھتے ہیں اچھی نثر سالوں ارتقائی منازل طے کرنے کے بعد وجود میں آتی ہے۔ اس کے لیے وہ مختلف اسالیب ادب مثلاً ناول، افسانہ، ڈرامہ، سوانح، تاریخ، تنقید، کہانیوں وغیرہ میں استعمال ہوتی ہے۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ الفاظ مختلف سیاق وسباق میں استعمال ہونے کے بعد اپنا مفہوم متعین کر لیتے ہیں۔ یونانی زبان میں نثر کے لیے برہنہ کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے یعنی کہ جو الفاظ نثر میں استعمال ہوتے ہیں ان کے مطالب محدود ہوتے ہیں ان میں ایک خاص صفت شفافیت (TRANSPARENCY) کی ہے۔ ہم ان کے آر پار آسانی سے دیکھ سکتے ہیں۔

نثر کو اس کی ساخت، آہنگ، الفاظ اور جملوں کی نحوی ترتیب کے لحاظ سے مندرجہ ذیل اقسام میں بانٹا گیا ہے۔

(۱) نثر مرجّز (۲) نثر مرصع

(۳) نثر مقفّٰی (۴) نثر عاری

(۱) نثر مرجّز:

نثر مرجز کی تعریف غالب نے ایک خط میں، جو انھوں نے صاحب عالم مارہروی کے نام لکھا تھا کچھ اس طرح بیان کی ہے:

''نثر مرجز وہ ہے کہ وزن ہو اور قافیہ نہ ہو''[2]

---

[1] درس بلاغت صفحہ ۱۵۹

[2] ادب اور تنقید-اسلوب احمد انصاری، صفحہ ۱۰۷

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

اور پھر آگے اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:

''نثر مرجز اس کو کہتے ہیں کہ وزن ہو اور قافیہ نہ ہو اور یہاں یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ وزن میں قیدِ نظامی اور ظہوری کی نثر کے اوزان منظور نہیں۔ مثلاً حضرت نظامی کی نثر کا وزن یہ ہے۔ مفعول، مفاعیلن۔ حضرت ظہوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ''رائیلش سرو بن گلشن تخ فجرش واہی دریائے ظفر'' یہ نثر مرجز ہے۔ وزن اس کا فعلاطن فعلاتن فعلن ہوا۔ کاتبوں نے مقفّٰی کرنے کے واسطے صورت بدل دی ہے اور کچھ تصرّف کیا ہے کہ نثر نہ مرجز رہی نہ مقفّٰی چنانچہ اساتذہ فن ''لن تنالوا البر حتی تنفقوا'' اس آیت سراسر ہدایت کو نثر مرجز کہتے ہیں اور اس کا وزن یہ ہے فاعلاتن فاعلاتن۔ ''ویرزق من حسیث لا یحتسب'' اس کا وزن فعولن فعولن فعول''۔[1]

پھر نثر مرجز کی مثال آگے غالبؔ اس طرح دیتے ہیں:

''ہاں یہ نثر مرجز اور مرصع ہے صاحب مشفقا شفیق دلی، زیر الطافکم الی الابر بغیر تبلیغ بندگی ونیاز پر ضمیر منیر روشن باد''۔[2]

اوپر کی عبارت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مرجز نثر وہ نثر ہے جس میں وزن تو ہوتا ہے مگر قافیہ نہیں ہوتا ہے۔ نثر مرجز اور مرصع میں ایک واضح فرق ہوتا ہے۔ مرجز میں صرف وزن پایا جاتا ہے جب کہ مسجع میں وزن کے ساتھ ساتھ فقرے کا آخری لفظ ہم قافیہ بھی ہوتا ہے مثلاً

''دیوان حقیقت کے مطلع کے ہیں دو مصرعے۔ اک خمر الٰہی ہے، اک نعت پیمبر ہے۔ اس مطلع روشن کے معنی منور سے ہر ذرہ بھی ہے واقف سنتے ہیں ازل سے سب پر مطلع نورانی ہر اس کے سوا اب تک اس ساری غزل میں سے اک شعر نہیں پایا۔ لیکن مجھے ہاتھ آیا اس وقت غنی موقع میں سب کو سناتا ہوں۔ اس مطلع یکتا کا حسن ازل سے ہے اس وقت موافق میں کیوں کر نہ تنا خواں ہوں''۔[3]

(تقریظ ہر انتخاب یادگار: مولفہ امیر مینائی)

---

[1] درس بلاغت صفحہ ۱۵۹

[2] درس بلاغت صفحہ ۱۶۰

[3] بحوالہ درس بلاغت صفحہ ۱۵۹

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

اوپر کی عبارت پوری کی پوری یکساوزن (مفعول مفاعلین) کے ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ہے یہاں تک کہ اس کو نثر کہنے میں بھی تکلف معلوم ہوتا ہے وزن کی وجہ سے یہ عبارت غیر فطری بھی معلوم ہوتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بہ تکلف لکھی گئی ہے۔

(۲) نثر مرصع

ایسی نثر جس کے دونوں فقرے ہم قافیہ اور ہم وزن ہوتے ہیں۔ مرصع نثر کہلاتی ہے۔

بعض لوگ مسجع کو نثر کی ایک علیحدہ قسم تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں وہ اس کو مقفی کا ہی ایک روپ مانتے ہیں لغوی اعتبار سے مرصع کے معنی ہیں ایسے الفاظ یا فقرے استعمال کرنا جن میں حرکت اور وزن دونوں برابر ہوں۔ غالب کے یہاں اس کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ دو سطریں۔

''قسم ہے اس خالق حقیقی کی اوتنا ہے اس صانع بدیعی کی، جو ارض وسما کا نور ہے، جو عرش وفرش کا ظہور ہے''[1]

اس عبارت میں جو ارض وسما کا نور ہے، جو عرش وفرش کا ظہور ہے ہم قافیہ اور ہم وزن ہیں۔

(۳) نثر مقفٰی

وہ نثر جس میں وزن نہیں ہوتا ہے۔ مگر آخری لفظ ہم قافیہ ہوتا ہے۔ آخری لفظ کے علاوہ کسی اور لفظ میں قافیہ یا وزن نہیں ہوتا ہے۔

نثر مقفٰی مرجز کے برعکس ہوتی اور نثر مسجع سے مماثلت بھی رکھتی ہے کیونکہ اس میں قافیہ ہوتا ہے لیکن اس میں صرف آخری لفظ کا ہی مقفی ہونا کافی نہیں بلکہ درمیان میں بھی مقفٰی الفاظ ہوں۔ مثلاً

''مجمع جود وکرم صاحب سیف وعلم حضرت سلطان عالم زید اللہ عشقہ بڑا ہے یہ ظلم وستم کہ تم نے محبت نامہ نہ کیا رقم سچ کہو تمھیں خدا کی قسم کیوں ہو گئے ہم سے برہم ہم کو اس کا بہت ہے غم۔ کس نے الفت کی ہے کم اپنا تو فرقت سے نکلتا ہے دم کہ خیریت سے لائے تم کو رب اکرم پھر ہم تم ہوں باہم اور نور چشم نگیں آرا بیگم تسلیم کرتی ہیں ہو گر خم۔''[2]

---

[1] درس بلاغت صفحہ ۱۵۹

[2] اردو اسالیب نثر = امر اللہ خاں شاہین صفحہ ۳۸

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

مندرجہ بالا اقتباس میں آخری لفظ کرم، علم، عالم، ستم، رقم، وغیرہ ہم قافیہ ہیں مگر وزن سے یکسر عاری ہیں۔

(۴) نثر عاری

وہ نثر جس میں نہ تو وزن کی قید ہوتی ہے اور نہ ہی قافیہ کی اس میں رعایات ومناسبات لفظی بھی نہیں ہوتے ہیں۔ البتہ فصاحت اور بلاغت سنجیدگی ومتانت میں یہ نثر اعلیٰ درجہ کی سمجھی جاتی ہے۔

اس میں مرجز، مرصع اور مقفی کے عناصر نہیں ہوتے ہیں بلکہ یہ نثر بالکل سادہ فطری اور عام فہم ہوتی ہے۔ سلاست اور دل نشینی البتہ اس میں پائی جاتی ہے۔ یہ نثر زبان اور قواعد کے اصولوں کے مطابق ہوتے ہوئے برجستہ اور بے ساختہ بھی ہوتی ہے۔

یہ نثر کی جامع، واضح اور مفید ترین شکل ہے۔ جو غیر ضروری جکڑ بندیوں سے آزاد ہے۔ اس میں بہت وسعت ہے کیونکہ یہ روزمرّہ کی ضروریات کی تکمیل کرتی ہے۔ اس قسم کی نثر کی مثالیں سرسید، حالی اور ماسٹر رام چندر وغیرہ کی تحریروں سے دی جاسکتی ہیں۔ نثر عاری کو روزمرہ بھی کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر ''آب حیات'' کا درج ذیل اقتباس:

> ''اسی زبان کو ریختہ بھی کہتے ہیں کیونکہ مختلف زبانوں نے اسے ریختہ کیا ہے جیسے دیوار کو اینٹ، مٹی، چونا سفیدی وغیرہ ریختہ کرتے ہیں۔ یا یہ کہ ریختہ کے معنے میں گری پڑی، پریشان چیز۔ چوں کہ اس میں الفاظ پریشاں جمع ہیں اسی لیے اسے ریختہ کہتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اس میں عربی، فارسی، ترکی وغیرہ کتنی زبانوں کے الفاظ شامل ہیں اور اب انگریزی بھی شامل ہوتی جاتی ہے۔ اور ایک وقت ہوگا کہ عربی، فارسی کی طرح انگریزی زبان قابض ہوجائے گی۔''[۱]

(آب حیات محمد حسین آزاد)

یہ اقتباس فصاحت، بلاغت، متانت وسنجیدگی کی اعلیٰ مثال ہے اس میں الفاظ بظاہر سادہ استعمال ہوئے ہیں مگر ان کے تناسب استعمال نے اس عبارت کو کمال بخشا ہے ریختہ کا لفظ عبارت میں پانچ بار آیا ہے۔ مگر اس مہارت سے استعمال ہوا ہے کہ پڑھنے والے کو برا نہیں معلوم ہوتا ہے۔

---

[۱] اردو اسالیب - امیر اللہ خاں شاہین، صفحہ ۳۸

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

نثر کے ہمہ گیر، ٹھوس اور انسانی زندگی سے وابستہ تصور اور اس کی وسعتوں کے پیش نظر الفاظ کے محل کے اعتبار اور معانی کے لحاظ سے اس کی تقسیم درج ذیل انداز میں کی گئی ہے۔

(۱) سلیس (۲) دقیق

پھر ان دونوں کی بھی دو دو قسمیں بتائی گئی ہیں:-

(۱) سلیس

(۱) سلیس سادہ

(۲) سلیس رنگین

(۲) دقیق

(۱) دقیق سادہ

(۲) دقیق رنگین

(۱) سلیس

وہ نثر جس کے معنی آسانی سے سمجھ میں آجاتے ہیں اس میں الفاظ وہی استعمال ہوتے ہیں جو مروج اور مانوس ہوتے ہیں۔ تشبیہ و استعارہ بھی سہل و قریبی ہی منتخب کئے جاتے ہیں۔ یہ عام فہم ہوتی ہے اور معانی کے اظہار کے لیے نامانوس مشکل و بوجھل نہیں ہوتی۔ مثلاً

> ''مجھ کو تو برسات کی یہ ادا بھاتی ہے کہ مینہ برس کے کھل جاتا ہے اور صاف آسمان کی رات گذر جاتی ہے تو صبح کے وقت درختوں، پھولوں اور جنگل کی گھاس کی عجب شان ہوتی ہے اوس کے قطرے پھولوں کی پتیوں پر ایسے چپ چاپ نظر آتے ہیں جیسے رات کو آسمان کے تارے تھے کیا خبر کہ رات کے وقت تارے ٹوٹ پڑے ہوں۔ یہ انھی کی گل افشانیاں ہیں''[۱]

مندرجہ بالا عبارت میں ایک بھی لفظ ایسا نہیں ہے ہم کو جس کے معنی نہ معلوم ہوں۔ اوس کی بوندوں کو تاروں سے تشبیہ دی ہے۔

۱۔ اردو اسالیب نثر = امیر اللہ خاں شاہین صفحہ ۳۹

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

(۱) سلیس سادہ:-

وہ نثر جو لفظ و معنی کے اعتبار سے سہل ہو مناسب محاورہ اور روز مرّہ کا استعمال کیا گیا ہو۔ تشبیہات واستعارات بھی ایسے استعمال کیے گئے ہوں جن کو آسانی سے سمجھا جا سکے۔ مثال کے طور پر

''سرسید نے اصلاح کا بیڑا اس وقت اٹھایا جب کہ قوم کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ اور مسلمانوں پر افسردگی اور مردنی چھائی ہوئی تھی۔ طرح طرح کے توہمات، تعصبات اور اختلافات میں مبتلا تھے۔ انھوں نے اس کے دیکھتے ہوئے پھوڑے اس طرح چھیڑے کہ لوگ بلبلا اٹھے اور آمادۂ پیکار ہو گئے۔''[۱]

عبارت سہل ہے۔ دو محاورے بیڑا اٹھانا اور شیرازہ بکھرنا استعمال ہوئے ہیں۔

(۲) سلیس رنگین:-

ایسی نثر جو لفظ و معنی کے اعتبار سے تو آسان ہو لیکن اس میں رعایت لفظی اور صنائع بدائع کی آمیزش ہو مثلاً

''بندہ حرارت قلب کے عارضہ سے حیران و منتشر رہتا ہی تھا۔ اب ضعف دماغ کی بیماری نے اور بھی عاجز اور زچ کر دیا ہے۔ ہر دم یہی سوچ اور منصوبہ آتا تھا کہ کدھر جاؤں اور کون ایسی چال چلوں کہ یہ عارضہ بڑھنے نہ پائے۔ بارے ان دنوں حکیم شاہ رخ مرزا جب اس شہر میں وارد ہوئے۔ ان کی تعریف بہت سنی تھی کہ ان کے نزدیک بادشاہ اور وزیر اور فقیر اور امیر فیل نشین برابر ہیں مریضوں کی خبر گیری کے واسطے بارہ دری میں شطرنج بچھائے بیٹھے رہتے ہیں''[۲] (رقعہ غلام امام شہید)

اس عبارت میں بہت سے ایسے الفاظ ہیں جو شطرنج کے ساتھ مناسبت رکھتے ہیں۔ ان الفاظ کے نیچے لائن کھینچ دی گئی ہے۔

(۲) دقیق

ایسی نثر جس کے معنی ذرا دیر سے سمجھ میں آتے ہیں۔ اس میں غیر مروجہ، غیر مانوس الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں تشبیہ واستعارہ بھی دور از کار استعمال کئے جاتے ہیں۔ مثلاً

---

۱ چند ہم عصر = مولوی عبدالحق صفحہ ۲۳۴

۲ بحوالہ درس بلاغت صفحہ ۱۶۱

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

''بلمس اظہار۔فیض آثار۔مجب عظم۔صدیق عشعمشم''[1]

(۱) دقیق سادہ:-

ایسی نثر جو الفاظ اور معنی دونوں اعتبار سے مشکل سے سمجھ میں آئے۔مگر اس میں صنائع بدائع، رعایت، مناسبت کو استعمال میں نہ لایا گیا ہو۔مثلاً

''مراد جسم انسانی کی تفتیش ایسا عقرہ لاینحل ہے جسے کوئی فرد ایسی منزل ظلمات میں مطع الارض کرے''[2]

(۲) دقیق رنگین:-

ایسی عبارت جو الفاظ اور معنی دونوں اعتبار سے مشکل سے سمجھ میں آتی ہے اور اس میں رعایت ومناسبات، صنائع لفظی ومعنوی دونوں دوراز کار استعمال ہوتی ہیں۔مثلاً

''ادب اور تواضع ایک جامہ ہے اس کے قامت احوال پر راست اور خلق ومروت ایک ذخیرہ ہے۔اس کے گنجینہ طبع میں بے کم وکاست ضمیر صافی اور مروع مشرق اور آفتاب، شوخی فکر اور طبع لمعہ برق اور اسحاب''[3]

انھیں ہم عمل اور معانی کے اعتبار سے نثر کی اقسام قرار دیتے ہیں چونکہ نثر انسانی زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھتی ہے، اس بنا پر اس کے موضوعات کی کوئی گنتی نہیں ہے۔اور تمام موضوعات کے لئے ایک ہی انداز نہیں اختیار کیا جاسکتا ہے۔بلکہ اپنے موضوعات کی رنگارنگی اور وضاحت کے لئے نثر کا منفرد اور مخصوص لہجہ ہے لہٰذا موضوع کے اعتبار سے ہم نثر کو مختلف قسموں اور مختلف ناموں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔دوسرے الفاظ میں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ مختلف علوم وفنون کے لحاظ سے نثر کے مختلف لہجے ہمارے سامنے آتے ہیں۔مثال کے طور پر ایک مورخ ایک سائنسداں کے مقابلہ جداگانہ انداز بیان رکھتا ہے۔اسی طرح جغرافیہ، نجوم، طب وغیرہ ہر مضمون اور ہر موضوع کی مناسبت سے نثر کی زبان میں تبدیلی پیدا ہوجاتی ہے۔نثر کی ہمہ گیری اور اس کی لوچ، اس کا اہم وصف ہے۔

---

[1] درس بلاغت صفحہ ۱۶۱

[2] اردو اسالیب نثر۔امیر اللہ خاں شاہین صفحہ ۴۰

[3] آئینہ بلاغت۔مرزا محمد عسکری، صفحہ ۶۲

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

انسائیکلو پیڈیا برٹینکا میں یہ تقسیم کچھ اس طرح ملتی ہے:

''نثر عموماً تین طرح کی ہوتی ہے۔ بیانیہ (کام، لوگ یا چیزوں سے متعلق) تشریحی اور تفصیلی۔ سوئم جذباتی''۔[1]

کسی ایک نثر پارے میں یہ تینوں اقسام پائی جاسکتی ہیں۔ جیسے تشریحی نثر کا اصلی جز بیانیہ ہونا چاہیے۔ مگر اس میں تفصیلی اور جذباتی بھی شامل ہوسکتے ہیں۔ بیانیہ نثر میں ہر قسم کے واقعات کا تذکرہ ہوسکتا ہے۔ مثلاً اس میں نثری، رومانی ناول، مختصر افسانہ یا ناول کی مختلف اشکال جیسے سربستہ زار یا جاسوسی قصہ، سائنسی، افسانہ، بچوں کے لئے مخصوص کتب سوانح حیات یا مضمون یا ڈائری، خطوط، سرگزشت، سفرنامہ اور سیاحوں کے کارنامے اور سائنس کی وہ کتب یا مضامین بھی شامل ہوسکتے ہیں جن میں دنیا کے واقعات کے اسباب سمجھانے کے بجائے بیان کرنے کی طرف توجہ رہتی ہے۔ تشریحی نثر میں سائنس، قانون، فلسفہ، دینیات، اخلاقیات، سیاسیات، تاریخ اور تنقید شامل ہیں۔ اس میں بیانیہ یا تعلیمی یا تبلیغی پہلو بھی ہوسکتا ہے اور اس میں تفصیلی اجزاء بھی شامل ہوسکتے ہیں۔ جیسے سائنس اور تواریخ کی کتب ..... تشریحی نثر بلا واسطگی اور سادگی سے ہم رشتہ ہوتے ہوئے بھی بعض اوقات نظم کی بلندی تک پہنچ جاتی ہے۔

جذباتی نثر میں بجائے تخیل پیدا کرنے کے احساس کو ابھارنے کا پہلو نمایاں ہوتا ہے جیسے ہجو یا وعظ یا تواریخی، سائنسی، فلسفہ اور تنقیدی کتب ہیں۔

اخباروں کی نثر صورت میں بیانیہ اور تشریحی ہوتی ہے مگر اس کا منشا جذباتی ہوتا ہے۔ ''بائبل'' کی نثر کا منشا بھی بنیادی طور پر جذباتی ہے۔

اس بات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اسلوب یا انداز بیان کے وجود میں آنے میں موضوع اور خیال کی نوعیت کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔ مختلف موضوعات مثلاً صحافت، تاریخی بیانات، افسانہ وغیرہ کے لیے جداگانہ لہجہ اور مختلف اسالیب پائے جاتے ہیں۔

انسانی ضرورتوں کے پیش نظر ہی نثر کا جنم ہوا ہے۔ نثر کی مدد سے ہی ہم اپنی تمدنی و تہذیبی ضروریات پوری کرتے ہیں۔ اس لیے اس کا تعلق فرد سے زیادہ افراد اور سماج کے ساتھ ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تہذیب انسانی کے ساتھ نثر کا بہت مضبوط رشتہ ہے۔ دوسرے الفاظ یا دوسرے انداز میں ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں

---

[1] ادبی نثر کا ارتقاء - شہناز انجم، صفحہ ۴۳

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

کہ نثر کو انسانی دور تمدن کی پیداوار بھی کہا جا سکتا ہے۔ لہٰذا جیسے جیسے انسانی سماج میں ترقی ہوتی گئی اس کی قدروں میں تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ ان سب کو نثر نے بھی انگیز کیا یہی وجہ ہے کہ بہت بعد میں وجود میں آنے یا نمو پذیر ہونے کے باوجود دنیا کی تمام ترقی یافتہ قوموں کے ساتھ ہے۔ آج نثر کو سماج کی شیرازہ بندی اور تہذیب وتمدن کا اہم ذریعہ اور امین قرار دیا جا سکتا ہے۔ نثر میں آج بے شمار موضوعات اور مختلف ومتنوع اسالیب کی شمولیت ہوگئی ہے۔ تمام جذبات اور افکار وخیالات کی ترسیل ہم محض شاعری کی مدد سے نہیں کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے ہم مختلف خصوصیات سے آراستہ صنف ''نثر'' کو ہی کام میں لاتے ہیں۔ عموماً نثر کو ہم اس کے مختلف موضوعات اور مختلف لہجوں کی بنیاد پر تین حصوں میں بانٹتے ہیں۔ ایک وہ نثر ہے جسے ہم عام بول چال کے لیے استعمال کرتے ہیں اور جسے ہم روزمرّہ بھی کہتے ہیں۔ دوسری وہ نثر ہے جس کا تعلق علوم وفنون سے ہے اور اس کا استعمال عام طور پر درسگاہوں اور کتابوں میں ہوتا ہے اور تیسری نثر وہ جو شائستہ اور شگفتہ نثر کہلاتی ہے اور جس کا استعمال اعلیٰ محفلوں اور مجلسوں میں ہوتا ہے۔ آل احمد سرور صاحب نثر کی ان اقسام کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

زبان کی تین قسمیں کی گئی ہیں۔ پہلی بول چال کی زبان جس کا سیدھا سادہ کاروباری مقصد ہے۔ دوسری سائنسی یا علوم کی زبان جس کا مقصد معلومات بہم پہنچانا اور تیسری ادبی جس کا مقصد لطف ومسرت کے ذریعہ سے متاثر کرنا ہے۔

آل احمد سرور نے صرف نثر کے دائرے میں یہ تقسیم نہیں کی ہے بلکہ مجموعی طور پر زبان کی تقسیم کی ہے، جس میں غیر سائنسی زبان یا شاعری بھی داخل ہے۔

دوسری بات یہ کہ بول چال کی زبان صرف کاروباری یا افادی مقصد تک محدود نہیں ہے، اس کا بیان بہت وسیع ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ زبان کی دوسری اقسام بھی اس میں داخل ہو جاتی ہیں۔

تیسرے یہ کہ ادبی زبان محض لطف ومسرت کے لیے نہیں کام میں لائی جاتی ہے۔ ادبی زبان کا تعلق زندگی کے بہت سے پہلوؤں سے ہے۔ ادبی زبان کے روپ میں ہماری تہذیب وتمدن کی بڑی روایت محفوظ ہے۔

زبان کو آہنگ کے اعتبار سے تین حصّوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ آہنگ زبان کی فطری ضرورت ہے اور زبان کے دونوں حصّوں (نثر اور نظم) میں پایا جاتا ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ دونوں میں آہنگ کا توازن الگ الگ ہوتا ہے اور کہیں کہیں تو بالکل محسوس ہی نہیں ہوتا ہے۔

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

(۱)علمی نثر (۲)بول چال کی نثر (۳)تخلیقی نثر

علمی نثر میں موسیقیت کے عناصر کم پائے جاتے ہیں۔ بول چال کی نثر میں پوری طرح سے محسوس نہیں ہوتے ہیں اور تخلیقی نثر میں واضح طور پر پائے جاتے ہیں۔ تخلیقی نثر ادبی نثر کا ایک حصّہ ہے۔اس کے لئے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان اقسام کا مطالعہ کیا جائے۔اور نثر کی دوسری اقسام کا بھی اجمالی طور پر تذکرہ ہو۔ اس سلسلے میں ہم نثر کی تقسیم کچھ اس طرح کر سکتے ہیں۔

۱- بول چال کی نثر

۲- ادبی نثر۔(یہ دو اقسام میں بانٹی جاسکتی ہے)۔

(۱) سادہ ادبی نثر

(۲) ادبی تخلیقی نثر

(۳)علمی نثر (اس کے تحت فلسفہ، منطق، سائنس وغیرہ)

۱- بول چال کی نثر:۔

آئی۔اے۔رچرڈ نے بول چال کی زبان کو''ترسیلی زبان'' کا نام دیا ہے۔ کیونکہ اس سے خیالات اور جذبات کی ترسیل کا کام لیا جاتا ہے۔اس کو ہم عوامی زبان کا نام بھی دے سکتے ہیں۔اس کو ہم کسی کو قائل کرنے، متاثر کرنے یا ایک خاص قسم کی معلومات فراہم کرنے کے لئے نہیں استعمال کرتے ہیں۔

اس نثر میں معنی آفرینی یا الفاظ کی شان وشوکت پر بھی زیادہ زور نہیں پایا جاتا ہے۔اس میں مانوس اور عام فہم الفاظ سادہ طریقے سے ہی استعمال میں لائے جاتے ہیں۔البتہ بے تکلفی، برجستگی اور سادگی کی جھلکیاں ہم جگہ جگہ دیکھ سکتے ہیں۔فکر کی گہرائی اور خیال کی بلندی پر اس میں اتنا زیادہ دھیان نہیں دیا جاتا ہے۔دوسرے یہ کہ انسانی اعضاء کی مختلف حرکات (مثال کے طور پر ہاتھ، آنکھ وغیرہ) سے بھی جملوں اور الفاظ کی تشریح ہوتی ہے اور بات کو سمجھانے میں مدد کرتی ہیں۔سادگی اور بے تکلفی اس کا ایک اہم وصف ہے اور ابلاغ کا مقصد سامنے رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ بول چال کی نثر کو ہم سیدھی سادی اور براہ راست نثر سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

اس کی سادگی کے باوجود ہم اس کی شیرینی، گھلاوٹ، لہجہ کا لوچ اور لسانی امنگ سے انکار نہیں کر سکتے ہیں۔اس کی بہترین مثالیں ہم ان ضرب الامثال اور محاورں میں دیکھ سکتے ہیں، جنھیں ہم روزمرّہ بول چال

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

کی زبان (نثر) کا اہم حصّہ قرار دے سکتے ہیں۔ ہربرٹ ریڈ نے اس کو الفاظ میں ظاہر کیا ہے۔

''نثر کا وجود ترکیب کے بغیر ممکن نہیں ہے اور ہر ترکیب کسی نہ کسی طرح کی نغمگی ضرور رکھتی ہے''۔[1] (انگلش پرواز اسٹائل-۱۹۶۳ء لندن، صفحہ ۱۱)

اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ نغمگی بول چال کی زبان کا اہم وصف ہے۔ اس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں گھریلو، دفتری، کاروباری اور بچوں کی سبھی زبانیں شامل ہیں۔ اس میں ترسیل و ابلاغ کی کافی گنجائش ہوتی ہے۔ اس میں ہر جذبہ کو اجاگر کرنے اور ہر قسم کے موضوع کو واضح کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اس میں نہ ہی کسی قواعد و عروض کا خاص لحاظ رکھا جاتا ہے اور نہ کسی خاص اصول کی پابندی کی جاتی ہے۔

ادبی نثر

ادبی نثر میں قطعیت کے ساتھ تہ داری اور لچک، جامعیت و ابہام، الفاظ کے لغوی استعمال کے ساتھ تشبیہ و استعارہ کا دلکش امتزاج بھی ہوتا ہے۔ اس نثر کو مجلسی نثر بھی کہتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ عام بولی اور نثر سے بلند مرتبہ رکھتی ہے۔ یہاں منطقی استدلال کے ساتھ ساتھ ایمائی قوتیں بھی پائی جاتی ہیں۔ اس میں سنجیدگی کی تہ میں جذبہ کے داخلی آہنگ کی لہریں بھی ہیں جن سے خیالات کے ساتھ احساسات بھی متاثر ہوتے ہیں۔ ادبی نثر میں علاقائی زبان سے تجربوں کے اظہار میں مدد حاصل کی جاتی ہے۔

ادبی نثر سے بصیرت کے ساتھ مسرت بھی حاصل ہوتی ہے۔ اس کے لہجے میں رعنائی و شگفتگی پائی جاتی ہے۔ اور اسی مسرت بخش پہلو کے مدنظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ادبی نثر صالح ادبی روایات کی حفاظت کرتی ہے اور ان کو ادب کا جز بناتی ہے۔ لہٰذا ادبی نثر کی مدد سے ہم قوموں کی تہذیبی، سماجی، معاشی، سیاسی اور ذہنی ترقیوں کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔

لیکن اس سچ سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ادبی نثر کے تحت بہترین اور مخصوص ادبی موضوعات کو ہی پیش کر سکتے ہیں علمی مقاصد یا عام کاروباری معاملات کے لئے ادبی نثر مفید ثابت نہیں ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے ہم دوسری نثری اقسام میں ادبی نثر کی جھلک دیکھ سکتے ہیں لیکن ادبی نثر میں ان موضوعات کی تلاش لاحاصل ہے۔ مختصر طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ادبی زبان بول چال کی زبان اور سائنسی زبان میں کچھ عناصر

---

[1] بحوالہ ادبی نثر کا ارتقاء - شہناز انجم، صفحہ ۴۶

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

مشترک ہو سکتے ہیں۔لیکن ادبی زبان کے عناصر مزاج اور مقصد کی بنیاد پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ادبی نثر اپنا ایک الگ وجود رکھتی ہے۔

ادبی نثر کی دو قسمیں ہیں:

۱- سادہ ادبی نثر- اس زمرے میں تنقید و تحقیق، تجزیاتی زبان اور خاکہ، تاثراتی تحریریں، مکاتیب اور انشائیے وغیرہ شامل ہیں جن میں منطقی ربط ہوتا ہے۔

۲- ادبی تخلیقی نثر- اس میں ایک طرف ادب لطیف اور شعری نثر شامل کی جاسکتی ہے، تو دوسری طرف تخلیقی افسانہ ناول وغیرہ کا شمار بھی اسی میں کیا جاتا ہے۔

علمی نثر

ناقدین کے یہاں تقسیم نثر میں علمی نثر کو ایک منفرد حیثیت عطا کی گئی ہے۔بعض ناقدین نے اسے استدلالی نثر کہا ہے تو کسی نے توضیحی نثر کی ایک شاخ بتایا ہے۔یہ بات غور طلب ہے کہ بہت ہی کم ناقدین اور نثر نگاروں نے علمی نثر کی تعریف بیان کی ہے۔

اس کا شمار نثر کی بہت صاف شکلوں میں ہوتا ہے اس سے علوم وفنون کی اشاعت کا کام لیا جاتا ہے۔ اس نثر کا اہم مقصد معلومات بہم پہنچانا ہے۔اسی لئے اس کو معلوماتی نثر کا بھی نام دیا گیا ہے اور اس کو خالص نثر بھی کہا جاتا ہے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اپنے ایک مضمون میں علمی نثر کی جو تعریف بیان کی ہے وہ علمی نثر پر بڑی حد تک صادق آتی ہے تاہم اسے پوری طرح سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا ہے۔رشید صاحب رقم طراز ہیں:-

> ''اس کا دروبست منطقانہ ہو اور براہ راست و بے کم وکاست سوچنے اور اظہار مطالب کا وسیلہ ہو۔جو کچھ بیان کیا گیا ہو وہ کانٹے پر تلا ہوا ہو۔جیسے اور جتنے اور جو الفاظ آئے ہوں وہی اور اتنے ہی معنی ہوں نہ کم نہ بیش۔ٹھنڈے دل سے سارے نشیب وفراز پر نظر رکھی گئی ہو ذاتی ردعمل سے پاک ہو جامد نہ ہو، متحرک ہو، بے ساختہ ہو، شعر وشاعری کی مانند ہو۔اس بات کو خاص طور سے ملحوظ نظر رکھنا چاہیے کہ نظم میں توازن کا معیار اسالیب کی تکرار پر ہوتا ہے۔نثر میں اسالیب کے تنوع پر نظم میں الفاظ سے جذبات کو ابھارنے کا کام لیا جاتا ہے، نثر میں ان کا مقصد مطالب کی طرف توجہ دلانا ہوتا ہے۔نثر میں جذبات

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

کی گنجائش سطح کے نیچے ہوسکتی ہے لیکن ان کو فکر سلیم کی گرفت سے باہر نہ ہونے دینا چاہیے۔''[1]

رشید صاحب نے اس اقتباس میں ایک جگہ تو یہ کہا ہے کہ جتنے اور جو الفاظ آئیں بس اتنے ہی معنی ہونے چاہئیں۔ دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ شعر و شاعری کی مانند ہو۔ شاعری میں تو ایک ایک شعر کے کئی کئی معنی نکلتے ہیں۔ اس چیز کو نثر کے لئے عیب سمجھا جائے گا۔

پروفیسر منظر عباس نقوی نے اپنے تنقیدی مضامین کے مجموعے ''نثر، نظم اور شعر'' میں باقاعدہ اس پر بحث کی ہے کہ موضوع کے اعتبار سے نثر کی چار قسمیں ممکن ہیں توضیحی، بیانیہ، انانیتی اور تاثراتی۔ اور علمی نثر کو توضیحی نثر کی ایک شاخ قرار دے کر باقاعدہ اس کی تعریف بیان کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

''یہ وہ نثر ہے جس کے وسیلے سے ہم بہت منتخب اور جچے تلے الفاظ میں کسی تخلیقی پیکر کا سہارا لئے بغیر، موزونیت کلام سے بے نیاز ہو کر وضاحت، قطعیت اور منطقی استدلال کے ساتھ اپنے اس ذہنی عمل کی ترجمانی کرتے ہیں جسے عرف عام میں تفکر کہا جاتا ہے''۔[2]

ان نقادوں کی آرا کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ علمی نثر اس کو کہتے ہیں جس میں کسی علمی یا فکری موضوع پر مرتب اور تجزیاتی انداز میں توازن، ایجاز اور معروضیت کو دھیان میں رکھ کر استدلال، وضاحت اور قطعیت کی مدد سے اپنے خیالات کا اظہار کیا جائے اور قاری اس موضوع پر تشفی بخش بحث کر سکے اور اس احساس کے ساتھ اس نتیجے پر پہنچے جو نثر نگار اخذ کرنا چاہتا ہے۔

یہ تو علمی نثر کا مفہوم ہے اب ذرا علمی نثر کی خصوصیات پر بھی نظر ڈال لی جائے۔

علمی نثر کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہر پہلو سے موضوع پر بحث کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اختتام پر ہمیں تکمیل اور تشفی کا احساس ہوتا ہے۔ گویا کہ اب آگے کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہی افسانے یا انشائیہ میں تو ایسا ہوسکتا ہے کہ تشفی کا احساس نہ ہو لیکن علمی نثر میں ایسا نہیں ہوسکتا ہے۔ علمی نثر میں بات کی وضاحت کے لئے شواہد اور دلائل کو کام میں لاتے ہیں۔ اس لئے اس کو استدلالی (ARGUMENTATIVE) بھی کہتے ہیں۔ بیانیہ اور تاثراتی نثر میں عام طور پر استدلال کی ضرورت نہیں پیش آتی ہے۔

---

[1] علمی نثر کیا ہے۔ منور حسین (Thesis) صفحہ ۱۴

[2] نثر، نظم اور شعر۔ منظر عباس نقوی، صفحہ ۱۹

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

علمی نثر کو اس کے راست انداز بیان کی وجہ سے بھی پہچانا جاتا ہے اس میں اپنی بات کو پیش کرنے کے لئے غیر مبہم اور بعینہ انداز اختیار کیا جاتا ہے اور استعاراتی و تمثیلی انداز بیان سے اجتناب کیا جاتا ہے۔ قطعیت اور وضاحت کی یہی صفت اس کو شاعرانہ، افسانوی یا تمثیلی نثر سے ممتاز کرتی ہے۔ شعری لوازم کم استعمال کئے جاتے ہیں۔ اور تخیل کی بھی اس میں گنجائش نہیں ہوتی ہے۔ تشبیہ و استعارہ کا استعمال توضیحی خیال کے حسب ضرورت کر سکتے ہیں۔ مگر عبارت کو سجانے اور سنوارنے کے لئے ان کے استعمال کی بالکل اجازت نہیں ہے۔

علمی نثر میں تجزیاتی اسلوب کو بیانیہ اسلوب پر ترجیح دی جاتی ہے۔ اس میں کسی مسئلہ کو واضح کرنے کے لیے چونکہ نکات کی مدد لی جاتی ہے، علت و معلول کا سلسلہ قائم کیا جاتا ہے اور نتائج کو اخذ کرنے کے لئے ان کی مدد حاصل کی جاتی ہے۔ اسی بنیاد پر یہ بیانیہ نثر سے الگ ہو جاتی ہے۔ محض علمی نثر میں ہی یہ صفت پائی جاتی ہے کہ نثر نگار جو نتیجہ نکالتا ہے، قاری بھی اس نتیجے سے آگے نہیں بڑھ سکتا ہے۔ محض تاثراتی، بیانیہ یا افسانوی نثر میں ہی اتنی وسعت ہوتی ہے کہ واقعات کے مجرد بیان میں قاری ایک سے زیادہ نتیجے نکال سکے یا اس کے متعدد پہلوؤں کو بروئے کار لا سکے۔

علمی نثر کی ایک اہم صفت معروضیت بھی ہے اپنی شخصیت کو نثر نگار حد درجے نثر پارے سے دور رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ واحد ضمیر متکلم کے بجائے جمع متکلم کے صیغے کو کام میں لاتا ہے۔ نثر نگار اس طبقہ کی نمائندگی کرتا ہے جس سے اس کا تعلق ہے۔ اس کے برخلاف دیکھا جائے تو دوسری اصناف نثر میں شخصیت کا پوری طرح سے عمل دخل رہتا ہے اور اگر پوری طرح سے نہیں ہوتا ہے تو بھی اتنا غیر جانبدار رہنا تقریباً ناممکن ہی ہوتا ہے جتنا کہ علمی نثر میں ہوتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ علم کے بیان کے لئے دلائل کام میں آتے ہیں، تاثرات سے کنارہ کشی کی جاتی ہے۔ اس لئے تحریر کی قوت شخصیت سے زیادہ پر اثر ہونی چاہیے۔ معروضی انداز میں موضوع بحث کا حق ادا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ نثر نگار نثر پارے سے ایک معقول دوری بنائے رکھے۔

علمی نثر کی خصوصیات میں ترتیب، ایجاز اور بلاغت کو اہم درجہ حاصل ہے۔ مرتب انداز میں موقع و محل کے اعتبار سے بات کو ادا کرنا اور کم سے کم الفاظ کا استعمال کرنا علمی نثر کی اہم صفت ہے۔ موقع و محل کا عدم خیال غیر مرتب انداز اور غیر ضروری تفصیل و اطناب علمی نثر کو نقصان پہنچانے والے ہیں۔

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

جذباتیت، اشتعال انگیزی اس نثر کے منافی ہیں۔ توازن اور معقولیت کا لحاظ رکھنا اس میں بیحد ضروری ہے۔ علمی نثر کے لئے سادہ اور فطری اسلوب کی ضرورت ہوتی ہے۔ تصنع اور ملمع کاری اس نثر کے شایان شان نہیں ہیں۔

علمی نثر کے دائرے میں طبعی وسماجی علوم کے علاوہ فلسفہ لسانیات اور تنقیدی نثر بھی آتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اخلاقیات و مذہب وغیرہ بھی علمی نثر کے ذیل میں آتے ہیں۔

نتیجہ کے طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ علمی نثر کا مقصد ذہنی ہمرائی اور ہم آہنگی کو حاصل کرنا، خیال کو اجاگر کرنا اور اعصاب پر اثر انداز ہونا نہیں ہے۔ بلکہ ہماری عقل کو ترغیب دینے کے لئے استعمال کی جاتی ہے اسے اس طور پر اپنانے کے لئے ایک منطقی ڈھانچے کی ضرورت ہوتی ہے جہاں اس کے مقدمات کو صحیح جگہ حاصل ہو جائے وہ ہمارے انداز فکر میں مثبت تبدیلیاں لاتی ہے۔ اور ہمارے اظہار کے طور طریق میں وسعت پیدا کرتی ہے۔

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

دوسرا باب

شبلی کی تاریخ نویسی اور سوانح نگاری ۲۴-۹۹

ا- تاریخ نویسی کے مطالبات۔

ب- نثر کا اسٹائل۔

ج- الفاروق اور المامون کا تاریخی اور تحقیقی مطالعہ۔

ح- الغزالی اور مولانا روم ۔

د- مضامین اور مقالات میں تاریخی عناصر۔

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

تاریخ نویسی کے مطالبات

تاریخ عربی زبان کا لفظ ہے اور یہ ارخ سے بنا ہے جس کے معنی المنجد، محیط المحیط اور القاموس میں احادیث اور حقائق کا مجموعہ درج ہیں۔ انگریزی لفظ ہسٹری (History) لاطینی زبان کے لفظ ہسٹوریا سے بنا ہے اس کے معنی معلومات، تحقیق اور اطلاع دینا وغیرہ ہیں۔

"AS THE RECORD OF FACTS AND AS FACTS THEMSELVES".1

تاریخ کے لئے دو باتیں لازمی طور پر ہمارے سامنے رہنی چاہئیں۔

پہلی یہ کہ جس عہد کی تاریخ یا حال لکھا جا رہا ہو اس عہد کے ہر قسم کے واقعات قلم بند ہونے چاہئیں۔ مثلاً مذہب، عادات، اخلاق، معاشرت، تمدن وغیرہ۔

دوسرے یہ کہ تمام واقعات میں سبب اور مسبب کا سلسلہ تلاش کیا جائے۔

قدیم تاریخوں میں ان دونوں چیزوں کا فقدان ہے۔ رعایا کے تمدن و معاشرت اور اخلاق و عادات کا بالکل ذکر نہیں ملتا۔ بادشاہِ وقت کے حالات میں بھی صرف فتوحات اور خانہ جنگوں کے علاوہ اور کچھ نہیں ملتا ہے۔ یہ کمی صرف اسلامی تاریخوں میں ہی نہیں ہے بلکہ تمام ایشیائی تاریخوں میں بھی یہی نقص تھا۔ ان (واقعات سلسلہ اسباب) پر توجہ نہ کرنے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ تاریخ کا فن، فلسفہ اور عقلیات سے نا آشنائی رکھنے والوں کے پاس رہا۔ اس لئے فلسفہ تاریخ کے کیا اصول ہو سکتے ہیں اس تک ان کی نظر نہیں پہنچ سکتی تھی۔ واقعات کی صحت کو جانچنے کے لیے صرف دو طریقے ہیں۔ ایک روایت اور دوسرا درایت۔ روایت سے یہ مراد ہے کہ جو واقعہ بیان کیا جا رہا ہے وہ اس شخص کے ذریعہ بیان ہونا چاہیئے جو بذات خود اس واقعہ میں موجود تھا۔ اس شخص سے شروع کر کے اخیر راوی تک روایت کا تسلسل اور تفصیل کے ساتھ بیان ہو۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ تحقیق سے یہ ثابت ہونا چاہیئے کہ سبھی راوی صحیح الروایت ہیں۔ درایت سے یہ مراد ہے کہ عقلی اصولوں سے واقعہ کی تنقید ہونی چاہیئے۔

---

1. Ecyclopaedia Britannica Vol.11 P.594

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

یہ امر مسلمان کے لیے فخر کا سبب ہے کہ روایت کے اصول کو جس خوبی اور خوبصورتی سے مسلمانوں نے برتا ہے، کسی اور قوم کو یہ ملکہ میسر نہ آیا۔ مسلمانوں نے ہر طرح کی روایتوں میں لگا تار سند کی جستجو اور راویوں کے حالات کو اس تحقیق و تفحص سے فراہم کیا کہ اس کو ایک مستقل فن کا درجہ حاصل ہو گیا اور فن رجال کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ اصلاً شروع تو احادیث نبوی کے لیے ہوتھا لیکن فن تاریخ کو بھی اس سے بہت فائدہ پہنچا۔ طبری، فتوح البلدان، طبقات ابن سعد وغیرہ اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ یورپ نے اس فن کو اپنے کمال تک پہنچا دیا ہے۔ مگر مسلمان مورخ ان سے اس فن میں بہت آگے ہیں۔ یورپین مورخ واقعہ نگار کے ثقہ اور غیر ثقہ ہونے پر زیادہ دھیان نہیں دیتے ہیں جرح اور تعدیل کا تو ان کے یہاں ذکر ہی نہیں ملتا۔

درایت کا فن بھی اگر چہ موجود تھا ابن حزم، ابن القیم، خطانی، ابن البر نے درایت کے اصولوں کو استعمال کیا ہے لیکن سچ یہ ہے کہ اس فن کو جتنا فروغ ہونا چاہیئے تھا بالکل نہیں ہوا۔ فن تاریخ میں تو بالکل نہیں ہوا۔ فن تاریخ میں تو اس سے بالکل بے اعتنائی برتی گئی۔ آٹھویں صدی ہجری میں علامہ ابن خلدون نے فلسفہ تاریخ کی بنیاد ڈالی۔ ابن خلدوں نے درایت کے اصولوں کو نہایت باریک بینی اور نکتہ سنجی کے ساتھ مرتب کیا۔ لکھتے ہیں:

خبروں میں اگر صرف روایت پر اعتبار کر لیا جائے اور عادت کے اصول اور سیاست کے قواعد اور انسانی سوسائٹی کے اقتضا کا لحاظ اچھی طرح نہ کیا جائے اور غائب کو حاضر پر اور حال کو گذشتہ پر نہ قیاس کیا جائے تو اکثر لغزشیں ہوں گی۔ علامہ موصوف نے تصریح کی ہے کہ

> ''واقعہ کی تحقیق کے لیے راویوں کی جرح و تعدیل سے بحث نہیں کرنی چاہیے بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ واقعہ فی نفسہ ممکن ہے یا نہیں، کیونکہ اگر واقعہ کا ہونا ممکن ہی نہیں تو راوی کا عادل ہونا بیکار ہے''۔ [1]

علامہ موصوف کا یہ بھی کہنا ہے کہ ان موقعوں میں امکان سے امکان عقلی مراد نہیں بلکہ اصول عادت اور قواعد تمدن کی رو سے ممکن ہونا مراد ہے۔

ابتدا سے آج تک تاریخ نے ارتقاء کی سینکڑوں منازل طے کی ہیں۔ اس طویل سفر میں ہونے والے تجربات نے اسے اس مقام پر پہنچا دیا ہے کہ آج تاریخ ساری دنیا کے علوم کی شہ رگ ہونے کا دعوی کرتی ہوئی

---

[1] شبلی بحیثیت مورخ - اختر وقار عظیم، صفحہ ۳۰

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

نظر آتی ہے۔ اور اپنے اس دعویٰ میں تاریخ حق بجانب بھی ہے۔ دنیا میں رونما ہونے والے واقعات اور تجربات تاریخ کی ہی وجہ سے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ تاریخ ان واقعات کے بیچ ایک کڑی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس ربط کی بنا پر ہم پچھلی دنیا کے انسان سے واقف اور منسلک ہیں۔

تاریخ کے لیے جن چیزوں کی سب سے زیادہ اہمیت ہے، ان میں سادگی بیان کو سب سے اہم درجہ حاصل ہے۔ مورخ اور زبان و بیان کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ مورخ زبان و بیان کا لحاظ کرتے ہوئے غیر مبہم اور واضح اسلوب اختیار کرتا ہے جس سے کہ ہر کوئی بات کو صحیح طور پر سمجھ لے اور کسی بھی طرح کی الجھن کا شکار نہ ہو۔ تاریخ، مورخ کو اس بات کی اجازت نہیں دیتی ہے کہ وہ فروعات اور غیر ضروری باتوں میں الجھ کر اپنے مقصد کو بھول جائے۔ مورخ کا یہ فرض ہے کہ وہ واقعہ کو بلا کم و کاست اپنی صحیح شکل میں پیش کر دے۔

مورخ کے لیے ضروری ہے کہ وہ جو کچھ بھی بیان کرے اس کے اچھے اور برے ہر پہلو کو قاری کے سامنے رکھ دے۔ مثال کے طور پر ایک منصف پچھلے مقدمات کے فیصلوں کی روشنی میں مستقبل میں پیش آنے والے مقدمات کے فیصلے کرنے میں مدد حاصل کرتا ہے۔ اسی طرح دنیا میں مختلف النوع واقعات سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے تاریخ کی مدد لینی پڑتی ہے۔ انسان صرف اپنے ماضی کے بارے میں جانتا ہے۔ انسان برابر اس کوشش میں رہتا ہے کہ وہ کس طرح اپنے مستقبل کو بہتر بنائے۔ اس کے لیے اسے ماضی کو اپنا رہنما بنانا پڑتا ہے۔ اس صورت میں تاریخ ہی اس کی سب سے بڑی مددگار ثابت ہوتی ہے۔ بقول بیہقی ''مورخ ایسا مزاج شناس زمانہ ہوتا ہے کہ آئندہ زمانہ کے نیک و بد پر حکم لگا سکتا ہے''۔[1]

مورخ ہمارے لیے رہنما کی حیثیت رکھتا ہے۔ مورخ صرف واقعہ نگار نہیں ہوتا بلکہ وہ اس بات پر بھی نظر رکھتا ہے کہ ماضی میں ہم نے جو خاص کام انجام دیے تھے، ان سے کیا نتیجہ نکلا تھا۔ اور مستقبل میں اس نوعیت کے واقعات کے لیے کیا اقدامات کرنے چاہئیں۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب مورخ حق گوئی کو اپنا مقصد عین بنائے۔ اگر مورخ جانبداری سے کام لے گا تو اپنے پسند کے کرداروں اور باتوں کو بیان کرے گا اور ان کی خامیوں پر پردہ ڈالے گا۔ اپنے مخالفین میں اس کو صرف کمیاں ہی نظر آئیں گی۔ اس صورت میں یقیناً اس کی دکھائی ہوئی راہ مستقبل سنوارنے والوں کو منزل مقصود پر نہیں پہنچا پائے گی۔ شرمن کینٹ (SHERMANKENT) نے کہا ہے:

---

[1] شبلی بحیثیت مورخ - اختر وقار عظیم، صفحہ ۳۱

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

" IMPARTIALITY NOT NEUTRALITY IS THE KEY TO THE

CORRECT, PROPER AND JUST PRES ENTATION OF HISTORY"

{KENT . OP. CIT , P.11} [1]

مورخ کی سوچ صرف اپنے ماحول اور اپنے زمانے تک محدود نہیں ہوتی ہے، بلکہ اس کی سوچ کا تعلق اس زمانے اور ماحول سے بھی ہوتا ہے جس کی وہ تاریخ لکھ رہا ہے۔ زمانہ اور ماحول ہی نہیں بلکہ مورخ جس ملک کی تاریخ لکھ رہا ہے اس کے حسبِ حال اپنے آپ کو ڈھال لیتا ہے۔ اس بات کو اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ جب ہم کسی مغربی ملک یا کسی مغربی تہذیب وتمدن کی بات کرتے ہیں تو اس کا جائزہ ہمیں اسی تناظر میں لینا چاہیے نہ کہ اپنے ماحول کے اعتبار سے۔ مثلاً اگر ہم ہندوستان کی تاریخ لکھ رہے ہیں تو ہمیں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ ہمارے یہاں ہمیشہ سے یہ اصول رہا ہے کہ ملک کی رعایا ہر معاملے میں بادشاہِ وقت کے سامنے جواب دہ رہی ہے اور بادشاہ کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون کا درجہ رکھتا تھا اور اگر ہندوستان کی تاریخ کسی برطانوی مورخ سے لکھوائی جائے یا لکھے تو کئی طرح کی غلط فہمیاں پیدا ہو جانے کا خطرہ لاحق ہے۔ یہی معاملہ اس ہندوستانی مورخ کے ساتھ بھی پیش آئے گا جو برطانیہ کی تاریخ لکھ رہا ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ تاریخ لکھی ہی اس وقت جا سکتی ہے جب کہ مورخ خود کو اس زمانے اور ماحول کے مطابق ڈھالے۔

مورخوں نے تاریخ نویسی کے لیے باہم متخالف اور متنوع اصول بنائے ہیں۔ بعض مورخوں کے نزدیک تاریخ محض واقعاتِ جنگ، بزرگانِ دین، اکابرِ مملکت او حاکمِ حکومت کے بیان تک محدود ہے۔ مولوی ذکاء اللہ جیسے نامور مورخ تاریخ کی عظمت اور بڑائی اسی میں دیکھتے ہیں کہ کم رتبہ لوگوں کے لیے اس میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

> ''انبیاء، خلفاء، سلاطین و بزرگانِ دین وقت کے آثار و اخبار جاننے کا نام علمِ تاریخ ہے۔ علمِ تاریخ سے شغل رکھنا بھی انھیں کے ساتھ مخصوص ہے، جو دین و دولت کی بزرگی اور کمالات میں مشہور ہوں۔ کمینے، پاجیوں اور ذلیل بازاروں کو علم تاریخ سے کچھ مناسبت نہیں ہے۔ اسکو علم تاریخ سے نہ کچھ منفعت ہوتی ہے اور نہ کہیں وہ ان کے کام آتی ہے۔

---

[1] بحوالہ شبلی بحیثیت مورخ - اختر وقار عظیم، صفحہ ۳۱

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

وجہ اس کی یہ ہے کہ علم تاریخ میں تو دین و دولت کے بزرگوں کے اوصاف کے اخبار اور محامد و مناقب و دولت و مآثر بیان ہوتے ہیں۔ مفلسوں و کم اصولوں کو اس کی طرف میل ورغبت نہیں ہوتی''۔[1]

تاریخ میں کسی خاص ماحول، وقت، زمانے یا حد کی پابندی نہیں ہوتی۔ اس کسوٹی پر اگر مولوی ذکاء اللہ کے بیان کو پرکھا جائے تو ان کا بیان ماننے کو دل نہیں چاہتا۔ اور اگر ان کے بیان کو صحیح مانا جائے تو مورخوں کو بہت ساری پریشانیوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ تاریخ میں سینکڑوں شخصیتیں ایسی ہیں جو کہ ''کم اصل'' ہیں مثلاً خاندانِ غلاماں، شیر شاہ سوری اور نظام سقہ وغیرہ۔ ظاہر ہے ان تاریخی شخصیتوں کو نظر انداز کرنے کے ساتھ ساتھ مورخ کو ان سے جڑے ہوئے تاریخی حقائق سے بھی پردہ پوشی کرنی پڑے گی۔ فنی اعتبار سے یقیناً اس بات کو قبول نہیں کیا جا سکتا ہے۔ واقعات اور چیزوں کے نظر انداز کرنے کا یہ معاملہ مورخ کی ذاتی پسند یا ناپسند سے تعلق نہیں رکھتا ہے۔ اپنی رائے کو ظاہر کرنے کے معاملے میں مورخ کو کچھ حد تک اختیار ہوتا ہے۔ لیکن یہاں بھی اسے اس بات کا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ اس کی رائے سے حقائق کو کسی طرح کا نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔ یعنی کہ مورخ حقائق توڑ مروڑ کر اپنی مرضی کے مطابق نہیں ڈھال سکتا ہے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ مورخ کبھی کبھی ان پابندیوں سے باہر نکل کر اپنے ذاتی مشاہدات کی مدد سے بھی حالات کا جائزہ لے سکتا ہے۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ تاریخ کو ہم حاکم۔ اکابر مملکت، بزرگان دین اور واقعات جنگ تک محدود قرار نہیں دے سکتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہم معمولی سے معمولی باتوں اور غیر ضروری جزئیات کو بھی تاریخ کا حصہ بنا دیں۔ بے جا تفصیلات کبھی کبھی قاری کے لیے مسائل کھڑے کر دیتی ہیں اور بلا وجہ کی طوالت کی وجہ سے عبارت کے مبہم ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ دونوں چیزیں تاریخ کو بہت زیادہ نقصان پہنچاتی ہیں۔

بعض مورخین کے نزدیک مذہب اور تاریخ میں بہت قریبی اور گہرا رشتہ ہے۔ ایم جعفر لکھتے ہیں:

''تاریخ اور مذہب میں نہایت قریبی تعلق ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے قریبی عزیز، ممدوح معاون اور لازم و ملزوم ہیں۔ دونوں کا مطمع نظر اور بنیاد سچائی ہے۔ اگر ان دونوں

---

[1] شبلی بحیثیت مورخ - اختر وقار عظیم، صفحہ ۳۰

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

کی صحیح طور پر پیروی کی جائے تو یہ دونوں انسانیت کے ممد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔
مذہب تاریخ کی راہ دکھاتا ہے اور تاریخ مذہب کی جانب رہنمائی کرتی ہے۔ سچائی،
انصاف اور ایمانداری کا نام مذہب ہے اور یہی تاریخ کی بنیاد ہے''۔[1]

ان سب باتوں کے باوجود دونوں میں منطقی اختلاف پایا جاتا ہے۔ ان قائم کردہ رشتوں کے علاوہ بھی تاریخ اور مذہب کے کچھ اور تقاضے بھی ہیں جن کو پورا کئے بغیر ان کے وجود کا تصوّر کرنا بھی مشکل ہے۔ ان تقاضوں پر نظر کرنے سے کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مذہب اور تاریخ میں طویل فاصلہ ہے۔ اس کا احساس خود ایس ایم جعفر کو بھی ہے۔ اسی لیے آگے چل کر لکھتے ہیں:

''مذہب اور تاریخ کا خمیر ایک ہی عنصر سے اٹھا ہے لیکن اس کے باوجود دونوں ہاتھ میں
ہاتھ دے کر نہیں چل سکتے''۔[2]

ایک طرف تو غیر جانبداری تاریخ کی سخت ترین شرط ہے اور دوسری طرف مذہب کے لیے یہ شرط ہے کہ اسکو بالکل نہ چھیڑا جائے۔ مورخ کی نظر میں مذہب مقدس ہوتا ہے۔ اس بنا پر وہ مذہب کے خلاف کچھ نہیں لکھتا ہے۔ مذہب کے ساتھ وہ جذباتی طور پر جڑا ہوا ہوتا ہے اور اس نظرئے سے جب وہ کسی دوسرے مذہب کی طرف نگاہ ڈالتا ہے تو اس کو اس میں خامیاں نظر آتی ہیں وہ اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ پاتا ہے اور بہت سارے حقائق کو نظر انداز کر دیتا ہے اور اس طرح تاریخ کے اہم تقاضے سچائی کو ٹھیس پہنچتی ہے۔

مورخ کا ذہن تاریخ لکھتے وقت بالکل صاف ہونا چاہیے۔ اسے قطعاً اس بات کی اجازت نہیں ہوتی ہے کہ وہ کسی کردار یا واقعہ کو کسی مخصوص رنگ میں رنگ کر پیش کر دے۔ بلکہ وہ اس کے لیے مجبور ہوتا ہے کہ حقائق اور واقعات کو اسی طرح بیان کرے جس طرح وہ رونما ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف قصّہ، داستان، ڈرامہ افسانہ اور ناول کی تصنیف کرتے وقت اس کا پلاٹ یا خاکہ مصنف کے ذہن میں رہتا ہے۔ مصنف کو اس بات کی پوری آزادی ہوتی ہے کہ وہ حقائق میں تخیل کی پیوندکاری کر سکتا ہے۔ مصنف اپنے ذہن میں یہ بات پہلے سے طے کر لیتا ہے کہ کسی واقعہ یا کردار کو کہانی میں کس طرح پیش کرنا ہے اور کتنی اہمیت دینی ہے۔

کچھ لوگوں کا ماننا ہے کہ تاریخ حب الوطنی کا جذبہ پیدا کرنے کا آلہ ہے۔ یہ بات تاریخ نویسی کے

---

[1] شبلی بحیثیت مورخ - اختر وقار عظیم، صفحہ ۳۶

[2] شبلی بحیثیت مورخ - اختر وقار عظیم، صفحہ ۳۷

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

اصول کے سخت خلاف ہے کیونکہ اگر تاریخ کو لوگوں میں حب الوطنی پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا جانے لگا تو مورخ کو کچھ ایسی شرائط پوری کرنی پڑیں گی جو تاریخ کے فنی تقاضوں سے بالکل میل نہیں کھاتیں۔ اگر تاریخ یہ خدمت انجام دینے لگے تو سب سے پہلے مورخ کو یہ کام کرنا ہوگا کہ وہ دشمن کی ایک بھی تعریف نہ بیان کرے اور دوسرے اسے اپنی تحریر میں تھوڑا ڈرامائی انداز اختیار کرنا ہوگا اور کچھ شعری کیفیت پیدا کرنی ہوگی۔ یہ دونوں باتیں تاریخ کے لیے نقصان دہ اور تاریخ نویسی کی ضروریات کے قطعی منافی ہیں اس میں مورخ ایک بات کو بار بار دھراتا ہے جس سے کہ اس کو بات کو منوانے میں آسانی رہے۔ یہ لائقِ اعتنا نہیں سمجھی جاسکتی ہاں دوسری اصناف کیلیے شاید صحیح ہو۔ اس بات کو اس طرح بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ تاریخ میں کسی طرح کی بھی مقصدیت شامل نہیں ہونی چاہیے۔ اس مقصدیت کی وجہ سے کئی اہم تقاضوں کی قربانی دینی پڑتی ہے۔

مورخ کے بارے میں شرمن کینٹ کا کہنا ہے کہ:۔

''کچھ لوگوں کا ماننا ہے کہ اوّلین اور سب سے اہم قاعدہ یہ ہے کہ وہ جو کچھ بھی لکھے وہ اس کی نظر میں واضح ہو''۔[1]

اس بات کو شبلی اس طرح ادا کرتے ہیں:

''مورخ اگر جنگ کا حال لکھے تو اسے اس کی جزوی تفاصیل حتیٰ کہ آلات جنگ تک کا ماہر ہونا چاہیے''۔[2]

یہ باتیں مبالغے کے زیادہ قریب معلوم ہوتی ہیں۔ مورخ کے لیے موٹی موٹی باتیں جاننا بھی مشکل ہوتا ہے، جزوی تفاصیل جاننا تو بہت دور کی بات ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ اگر مورخ جنگ کے آلات کا بیان کر رہا ہے تو اس کو ان آلات کی صحیح معلومات ہونی چاہیے۔ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ ہے کچھ اور بتا کچھ رہا ہے۔ مورخ ہر شے کا ماہر تو نہیں ہوسکتا ہے۔ ان مراحل اور مسائل کو وہ سرسری اور عام واقفیت سے بھی حل کرسکتا ہے۔

تاریخ کے لیے سب سے اہم شرط، سب سے اہم اصول اور سب سے اہم جز تدقیق اور تحقیق ہے۔ کچھ لوگ مورخ کو ''گورکن'' اور تاریخ کو ''گڑے مردے اکھاڑنے کا دوسرا نام'' سے تشبیہ دیتے ہیں۔ یہ تشبیہات تاریخ کے لیے صادق بھی آتی ہیں۔ تاریخ ایسی تاریک اور اندھیری راہ ہے جس پر جستجو اور کوشش

---

[1] شبلی بحیثیت مورخ - اختر وقار عظیم، صفحہ ۳۰

[2] شبلی بحیثیت مورخ - اختر وقار عظیم، صفحہ ۳۹

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

کے بغیر چلنا ممکن نہیں۔ مورخ قیاسات اور اندازوں کی مدد سے کبھی بھی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتا ہے۔ ذرا سی بے احتیاطی اسے ناکامی اور پریشانی کی طرف لے جاتی ہے۔ جس کے اندر تحقیق اور تدقیق کی صلاحیت نہیں ہے وہ ہرگز مورخ نہیں بن سکتا ہے۔ تاریخ کی مدد سے ہی ہمیں یہ پتا چلتا ہے کہ کسی خاص مسئلے کا حل ہمارے بزرگوں نے کس طرح نکالا تھا۔ اور کس بادشاہ کو کسی خاص حکمت عملی کو اختیار کرنے کے بعد کس طرح کے نتائج سے دوچار ہونا پڑا تھا۔

ان سب باتوں کا صحیح حل صرف تحقیق اور تدقیق کی مدد سے ہی نکالا جا سکتا ہے۔ ایک مورخ کسی خاص واقعہ کے متعلق ایک رائے رکھتا ہے، تو دوسرے مورخ کا نظریہ اس واقعہ کے متعلق بالکل جدا ہوتا ہے۔ نتیجہ کے طور پر ایک ہی واقعہ کے بارے میں مختلف آراء قائم ہو جاتی ہیں۔ اس صورت میں بعد کے مورخین کے لیے دشواری پیدا ہو جاتی ہے۔ اس دشواری کا حل تحقیق اور تدقیق میں مضمر ہے۔ اندازوں اور قیاسات کی مدد سے جو حل نکالے جاتے ہیں وہ اکثر صحیح نہیں ہوتے ہیں۔ اور تاریخ کی مدد سے آگے بڑھنے والوں کے لیے بھٹکنے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔

اگر تاریخ مسائل کا حل تلاش کرنے میں انسان کی مدد کرتی ہے تو تاریخ خود بھی ان مسائل کے حل کے لیے تحقیق اور تدقیق کی محتاج ہے۔ بس یہی بات تحقیق اور تدقیق کی اہمیت اور تحقیق و تدقیق کے تاریخ سے رشتے کی نزاکت کے لیے کافی ہے۔

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

ب=شبلی کی نثر کا اسٹائل

مولانا شبلی کا شمار اردو زبان کے بلند پایہ مصنفین میں ہوتا ہے۔علامہ کی تصانیف اردو ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔علامہ کی نثر شگفتہ، متین اور عالمانہ ہے۔موضوع کے اعتبار سے ان کی تصانیف سیرت، سوانح، تاریخ اور علم کلام کے خانوں میں رکھی جاسکتی ہیں۔

مولانا شبلی کو تصنیف وتالیف کا شوق شروع ہی سے تھا۔تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اور علی گڑھ کی ملازمت سے پہلے کا جو وقفہ ہے اس میں ان کے کچھ کتابچے اور رسالے شائع ہو چکے تھے۔لیکن اگر اسلوب اور موضوع کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ان میں کچھ ندرت اور جدت نہیں پائی جاتی ہے۔ان کتابوں میں انھوں نے مناظرانہ اندازِ بیان اختیار کیا تھا اور مختلف فیہ فقہی مباحث ومسائل کو موضوع بنایا تھا۔ان رسالوں اور کتابچوں کی وجہ سے علامہ کو کچھ خاص شہرت ومقبولیت بھی نہ مل سکی۔ملازمت کے سلسلے میں جب ان کا علی گڑھ میں قیام ہوا تو انھیں تاریخ کے مطالعہ کا موقعہ ملا اور تاریخ سے متعلق ان کی تصانیف شائع ہونے لگیں۔جن کی وجہ سے علامہ شبلی کا علمی وادبی حلقوں میں تعارف ہوگیا۔شبلی تاریخ کی طرف سرسید کے کتب خانہ کے سبب متوجہ ہوئے۔جس میں تاریخ، جغرافیہ تراجم اور طبقات وغیرہ موضوعات پر صدہا بلند پایہ عربی وفارسی تحریریں موجود تھیں۔اس کے ساتھ ساتھ اس میں یورپین مصنفین کی کچھ کتابوں کے ترجمے بھی تھے۔علامہ نے بہت دلچسپی کے ساتھ دونوں طرح کی تصانیف کا مطالعہ کیا۔لکھتے ہیں:-

> ''سرسید نے مجھے اپنے کتب خانے کی کتابوں کے دیکھنے کی عام اجازت دے دی تھی تو میرا یہ حال تھا کہ الماریوں کے سامنے گھنٹوں کھڑا رہتا۔کبھی تھک کر زمین پر اکڑوں بیٹھ جاتا۔سرسید نے جو یہ کیفیت دیکھی تو سامنے کرسی رکھوادی۔''[1]

اس مطالعہ کے نتیجے کے طور پر علامہ کو مسلمانوں کی علمی وادبی اور سیاسی وملکی فتوحات کے بارے میں

---

[1] حیاتِ شبلی، سید سلیمان ندوی، ص ۲۱۰

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

جاننے کا موقعہ ملا اور اپنے روشن ماضی سے انھیں آگاہی ہوئی۔ دوسرا فائدہ علامہ کو یہ ہوا کہ یورپین مصنفین کی تصانیف سے یہ پتا چلا کہ جدید دور میں تصنیف وتالیف کا کیا طریقہ ہونا چاہیے؟ کسی قوم کی علمی وفکری اور تہذیبی اور تمدنی تاریخ کو کس طرح ترتیب دیا جائے؟ شبلی نے اس نقطۂ نظر سے مسلمانوں کی اور اسلام کی تاریخ کا مطالعہ کیا کہ وہ اس کے روشن پہلوؤں کو جدید انداز میں دنیا کے سامنے پیش کرسکیں۔ شروع میں علامہ کا ارادہ تھا کہ تمام اسلامی حکومتوں کی تاریخ لکھی جائے۔ بعد میں ''تاریخ بنی عباسی'' لکھنے کا منصوبہ بنایا۔ اور پھر یہ سمٹ کر ''ہیروز آف اسلام'' تک محدود ہوگیا۔ حالانکہ اس دوران مولانا شبلی نے عباسی عہد کی تاریخ کے کچھ مسودات بھی تیار کرلیتے تھے لیکن کتب بینی پر مولانا نے زیادہ دھیان دیا۔ تقریباً پانچ سال کے مطالعہ کے بعد مولانا نے باقائدہ لکھنا شروع کیا۔

اردو زبان میں سلاست اور سادگی کی ابتداء سرسید احمد خاں اور ان کے رفقاء کی تحریروں سے ہوتی ہے۔ مولوی محمد حسین آزاد، مولانا حالی، مولی نذیر احمد اور نواب محسن الملک نے سرسید کے اسلوب کی پیروی کی ہے۔ لیکن جب مولانا شبلی کے طرز تحریر کا مقابلہ ان بزرگوں کی طرز تحریر سے کرتے ہیں تو فرق نمایاں طور پر ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ اور پتا چل جاتا ہے کہ شبلی کا اسلوب ان سب سے زیادہ دلکش ہے۔ مولانا نے ہر موضوع پر طبع آزمائی کی۔ علامہ نے بزرگانِ اسلام کے حالات، خلفا وسلاطین کی سوانح عمریاں، علم کلام کے مشکل مسائل کا حل، شعراء کے حالات، شعراء کے کلام پر تبصرہ، ان کا باہمی موازنہ، یونانی منطق آخر میں اس مقدس زندگی کو اپنا موضوع بنایا جس کی وجہ سے اس کائنات کا وجود ہے۔ لیکن ان مختلف مضامین کے باوجود روانی اور سلاست میں کہیں بھی کمی کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ یہ روانی دوسرے مصنفین کے یہاں بھی ہے لیکن برجستگی ایک ایسا کمال ہے جو روانی کا نقطۂ عروج ہے اور یہ صرف شبلی کی تحریر میں پائی جاتی ہے یہ برجستگی اس وقت بھی سامنے آتی ہے جب وہ کچھ آیتوں اور کچھ مصرعوں کو اس طرح اپنی عبارت میں شامل کرلیتے ہیں کہ سیاق وسباق کا حصہ معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً

> ''اس واقعہ کا کانوں میں پڑنا تھا کہ گویا خدا کا قاصد آکر ایک ایک کے کان میں دمی پھونک گیا۔ بچے، جوان، بوڑھے، جاہل، عالم، رذیل، شریف، نیک، بد سب یہی راگ گانے لگے رفتہ رفتہ تقریر، تحریر، ضرب المثل، تلمیحات، افسانہ، کوئی چیز اس سے خالی نہیں رہی لیکن بالآخر تحقیق کی عدالت نے فیصلہ کیا ع

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ''[1]

یا مثال کے طور پر:

''لیکن آخر یہ مسئلہ غور کے قابل ہے کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ شاہ جہاں کے الزامات کی کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں اور عالم گیر کے وہی الزامات ع

''افسانۂ بزم و انجمن ہیں''[2]

یا مثلاً:

''تاہم غلط معلومات کا بادل جو آج سے کئی سو برس پہلے یورپ کے افق پر چھایا ہوا تھا۔ اب تک نہیں سمٹا، بہت سے بہت یہ ہوا کہ وہ کسی قدر ہلکا ہو گیا لیکن فضا میں اب بھی اس قدر تاریکی ہے کہ اذا اخرج یدہ لم یکد یراھا۔''[3]

اس میدان میں مولوی محمد حسین آزاد، شبلی کے خاص حریف نظر آتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ قبول کرنا پڑے گا کہ شبلی کی عبارت میں جو جزالت اور متانت پائی جاتی ہے وہ شبلی کا ہی حصہ ہے۔ آزاد کے یہاں سلاست، ظرافت، لطافت سبھی کچھ ہے لیکن ان کی تحریروں میں وہ وزن، اثر، زور اور اتار چڑھاؤ نہیں ہے۔ جو مولانا شبلی کی خصوصیت ہے۔

مولانا شبلی کبھی کوئی خیالی مضمون نہیں لکھتے۔ ان کا موضوع اسلام کی تاریخ رہا اور انھوں نے ہمیشہ واقعہ نگاری کی۔ اس وجہ سے ان کی سلیس و روں عبارت کی عمدہ مثالیں زیادہ تر مضامین کی تمہید میں ملتی ہیں۔

عربی اور فارسی زبان کی آمیزش اردو میں اتنی زیادہ ہے کہ کوئی معمولی تحریر بھی اس سے الگ نہیں ہے۔ لیکن بعض الفاظ اور ترکیبیں ایسی ہیں جو صرف فارسی انشا پردازی ہی کے لیے ہیں۔ عموماً اردو زبان اس سے آشنا نہیں ہے۔ مثلاً اعجوبگی و طرفگی، کالبد، گل سرسید، مایہ ضمیر وغیرہ۔ کیونکہ شبلی نے بالکل شروع سے ہی فارسی زبان کی مزاولت کی تھی اس بنا پر اس طرح کی خوبصورت ترکیبیں ان کے ذہن میں سما گئیں اور ان کی تحریر کی خصوصیت بن گئیں۔ لہٰذا علامہ شبلی نعمانی نے سیرۃ النبیؐ میں حضورِ اکرمؐ کی ولادت

---

[1] حیاتِ شبلی، سید سلیمان ندوی، ص ۱۴۵ حصہ اول

[2] '' '' ''

[3] '' '' ''

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

باسعادت پرظہور قدسی کے عنوان سے جو مختصر انشاء پردازانہ مضمون قلم بند کیا ہے۔ اس سے شبلی کے اسلوب کی خصوصیت وضاحت کے ساتھ ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ لکھتے ہیں:

''چمنستان دھر میں بارہا روح پرور بہاریں آچکی ہیں چرخ نادرہ کار نے بھی بزمِ عالم اس سروسامان سے سجائی ہے کہ نگاہیں خیرہ ہوکر رہ گئی ہیں۔''

لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کے انتظار میں پیر کہن سال دھر نے کروروں برس صرف کردیئے سیارگانِ فلک اسی دن کے شوق میں ازل سے چشم براہ تھے۔ چرک کہن مدت ہائے دراز سے اسی صبح جاں نواز کے لیے لیل ونہار کی کروٹیں بدل رہا تھا۔ کارکنانِ قضاوقدر کی بزم آرائیاں عناصر کی جدت طرازیاں، ماہ وخورشید کی فروغ انگیزیاں، ابروباد کی قردستیاں عالم قدس کے انفاس پاک، توحید ابراہیم، جمال یوسف، معجزہ طرازیٔ موسیٰ، جاں نوازی مسیح سب اسی لیے تھے کہ یہ متاع ہائے گراں ارز شاہنشاہِ کونین کے دربار میں کام آئیں گے۔

آج صبح وہی صبح جاں نواز، وہی ساعت ہمایوں، وہی دور فرخ خال ہے۔ ارباب سیر اپنے محدود پیرایہ بیان میں لکھتے ہیں کہ آج کی رات ایوان کسریٰ کے چودہ کنگرے گر گئے۔ آتشکدۂ فارس بجھ گیا۔ دریائے سادہ خشک ہوگیا۔ لیکن یہ سچ ہے کہ ایوان کسریٰ انھیں بلکہ شانِ عجم، شوکتِ روم، اوجِ چین کے قصر ہائے فلک بوس گر پڑے۔ آتشکدۂ فارس نہیں بلکہ جحیم شرہ آتشکدۂ کفر، آذرکدۂ گمرہی سرد ہوکر رہ گئے۔ صنم خانوں میں خاک اڑنے لگی۔ بتکدے خاک میں مل گئے۔ شیرازۂ مجوسیت بجھ گیا۔ نصرانیت کے اوراق خزاں خزاں دیدہ ایک ایک کرکے جھڑ گئے۔ توحید کا غلغلہ اٹھا۔ چمنستان سعادت میں بہار آگئی۔ آفتاب ہدایت کی شعائیں ہر طرف پھیل گئیں۔ اخلاق انسانی کا آئینہ پرتو قدس سے چمک اٹھا۔[1]

اس مختصر سی عبارت سے بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے فارسی زبان کی کتنی دلآویز ترکیبیں اور خوبصورت استعارے ان کی نوکِ قلم پر رہا کرتے تھے۔ اور شبلی ان کو کس بے ساختگی سے اور بے تکلفی کے ساتھ استعمال میں لاتے تھے۔

مولانا شبلی کی تصانیف میں بہت سے ایسے مواقع آئے جہاں وہ واقعات کو تفصیل کے ساتھ بیان کرسکتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے ایجاز واختصار کا دامن نہیں چھوڑا۔ صرف انھیں واقعات کو

---

[1] سیرۃ النبیؐ، جلد ا - علامہ شبلی نعمانی صفحہ ۲۱۸

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

اپنی تصانیف میں جگہ دی جو کارآمد تھے اور اثر رکھتے تھے۔ غیر ضروری باتیں انھوں نے ترک کر دیں۔ کتنا ہی موثر واقعہ یا کوئی بھی وسیع مفہوم مضمون ادا کرنا ہو تو شبلی ایسے الفاظ اور ایسے استعارے کام میں لاتے ہیں کہ بات سمجھ میں بھی آ جاتی ہے اور اختصار بھی قائم رہتا ہے۔ مثلاً ہجرت کا واقعہ، اس کو کس اختصار کے ساتھ ادا کیا ہے۔

''آفتاب کی روشنی دور پہنچ کر تیز ہوتی ہے۔ شمیم گل باغ سے نکل کر عطر فشاں بنتی ہے۔
آفتاب اسلام طلوع مکہ میں ہوا لیکن کرنیں مدینہ کے افق پر چمکیں۔''[1]

حضرت عمرؓ کا اسلام میں داخل ہونے کا واقعہ ایسا ہے کہ اس میں پھیلنے کا پورا پورا موقع تھا لیکن مولانا نے اس کو اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے۔

''حضرت عمرؓ نے اندر قدم رکھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود آگے بڑھے اور ان کا دامن پکڑ کے فرمایا عمر کس ارادہ سے آیا ہے؟ نبوت کی پر جلال آواز نے ان کو کپکپا دیا۔ خضوع کے ساتھ عرض کیا کہ ایمان لانے کے لیے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بے ساختہ اللہ اکبر پکار اٹھے اور ساتھ ہی تمام صحابہ نے مل کر اس زور سے اللہ اکبر کا نعرہ مارا کہ مکہ کی تمام پہاڑیاں گونج اٹھیں۔''[2]

الفاروق کے اختتام پر حضرت عمرؓ کے جلال کا بیان کتنے خوبصورت انداز میں کیا ہے۔ چند جملوں سے ایسی فضا پیدا کر دی ہے جو کئی صفحات میں بھی پیدا کرنا دشوار تھی۔

''سکندر و تیمور تیس تیس ہزار فوج رکاب میں لے کر نکلتے تھے جب ان کا رعب قائم ہوتا تھا۔ عمر فاروقؓ کے سفرِ شام میں سواری کے ایک اونٹ کے سوا کچھ اور نہ تھا لیکن چاروں طرف غل پڑا تھا کہ مرکزِ اسلام جنبش میں آ گیا۔''[3]

علامہ کسی بات کو بلا وجہ طول دینے کو پسند نہیں کرتے تھے اس معاملے میں اگر انھیں ''کم فرصت'' کہا جائے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔ علامہ تسخیر ذہن کا کام چند سطروں میں ہی کر لیتے ہیں۔ علامہ کی مناسب

---

[1] سیرۃ النبیؐ، جلد ا- علامہ شبلی نعمانی صفحہ ۵۰

[2] الفاروق پہلا حصہ: علامہ شبلی نعمانی، ص ۲۱۰

[3] الفاروق حصہ دوم: علامہ شبلی نعمانی، ص ۲۱۰

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

محاورہ بندی سے ان کے ایجاز واختصار میں بہت شدت اور قوت پیدا ہو جاتی ہے اور علامہ کی عبارت اتنی پرزور ہو جاتی ہے کہ ہم تجزیہ کرنے کے بعد بھی اس کی صداقت سے انکار نہیں کر پاتے ہیں۔

علامہ شبلی نعمانی فطرتاً بہت جذباتی تھے اور قسمت سے انھیں اپنے جذبات کو ظاہر کرنے کا بڑا میدان مل گیا تھا۔ انھوں نے اسلام کے فخریہ واقعات کو سب کے سامنے پیش کیا، عام رائے کے خلاف اپنی رائے دی، یورپین مؤرخین کے بیجا اعتراضات کے مدلل جوابات پیش کیے مطعون خلائق لوگوں کی حمایت میں قلم کو حرکت دی۔ ان مواقع پر خود ہی جذبات کا اظہار ہو گیا۔ مولانا ایک واقعہ کا بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ سرکار کی طرف سے عربی زبان کے فروغ کے لیے ایک ہزار روپیہ دیا۔ اس کے خلاف ایک شخص نے ریڈیکل کے فرضی نام سے ایک مضمون لکھا اور عربی زبان کی توہین کی۔ علامہ نے اس کا جواب لکھنے کا ارادہ کیا۔ لیکن جوش کی شدت کی وجہ سے اپنے کو قابو میں نہیں رکھ پا رہے تھے۔ اس میں ایک ہفتہ گزر گیا۔ مولانا کہتے تھے کہ جب یہ مضمون ان کے سامنے آتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے بدن میں آگ لگا دی۔ شبلی نے عالم گیر کی حمایت میں مضامین کا جو سلسلہ شروع کیا ان میں بھی یہی کیفیت نظر آتی ہے ایک جگہ علامہ نے لکھا ہے:

> ''یورپین مؤرخین کے اعتراضات (جیسا کہ آگے ثابت ہوگا) اگرچہ نہایت شدید ہوا کرتے ہیں اور اس لیے ان کا جواب دینا نہایت آسان بات ہے لیکن باایں ہمہ جواب دینے والا سخت مشکل میں پڑ جاتا ہے۔ یورپین مؤرخین ایک اعتراض کے بیان میں جو خود غلط ہوتا ہے۔ پے در پے اور بہت سے جھوٹ ملاتے جاتے ہیں۔ جواب دینے والا جھوٹ کا جواب دینا چاہتا ہے تو سامنے ایک اور جھوٹ نظر آتا ہے اور وہ ادھر متوجہ ہوتا ہے تو ایک اور جھوٹ نمایاں ہوتا ہے۔ مسلسل دروغ بیانی اور اختراؤں کے ہجوم پر اسکو طیش آجاتا ہے اور بجائے اس کے کہ وہ سکون اور اطمینان کے ساتھ اصل واقعہ کے انکشاف پر متوجہ ہو۔ غصہ سے بے قابو ہو جاتا ہے۔
>
> خود مجھ پر یہی اثر پڑا ہے لیکن میں ان حریفوں کو یہ موقع نہ دوں گا کہ وہ میرے طیش وغضب سے فائدہ اٹھائیں۔''[1]

مولانا کے ان مضامین سے ان کے جوش تحریر اور زور بیان کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے، جن میں

---

[1] حیات شبلی: سید سلیمان ندوی، ص ۳۰۲

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

واقعات کی پابندیاں ان کے خیالات وجذبات پر روک نہیں لگاتی ہیں شبلی نے ''مسلمانوں کی پولیٹکل کروٹ'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جس میں اپنے جذبات کا کھل کر مظاہر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''اگر یہ سچ ہے کہ تقسیم بنگال کے طمانچے سے مسلمانوں کی پالیٹکس کا منھ پھر گیا تو ہم رضامند ہیں کہ اس تقریب مسرت میں بنگال کے سوا کچھ اور بھی نثار کر دیا جائے۔

ہم کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ جس چیز کو ہم پالیٹکس سمجھتے تھے وہ پالیٹکس کی تحقیر تھی۔ ہماری پالیٹکس کا کعبہ دراصل بتکدہ تھا، ہماری پالیٹکس کی پہلی آواز کلمہ شہادت کی طرح ولادت کے دن سے ہمارے کانوں میں پڑی صرف یہ تھی۔

ہمارے لیڈر یہ نازک فرق ہم کو سمجھاتے ہیں کہ ہندو مچھر ہیں اس لیے گورنمنٹ کو ان کی بھنبھناہٹ کی پروا نہیں۔ لیکن مسلمان شیر نیاں ہیں ان کے ہم ہمہ سے جنگل دہل جاتا ہے''۔[1]

علامہ کو اپنے جوش کے اظہار کے لیے کسی لمبی چوڑی تمہید کی ضرورت نہیں پڑتی ہے بلکہ چند فقروں میں ہی اپنے جذبات کا اظہار کر دیتے ہیں۔

شبلی کے اسلوب کی سب سے بڑی صفت اس کا وہ جوش اور قوت ہے، جو اس کے احساس عظمت اور احساس کمال کی بنا پر وجود میں آتا ہے۔ اس احساس کی ہم آہنگی جب کسی عظیم مقصد کے ساتھ ہو جاتی ہے تو اس کی وجہ سے مصنف کے اظہار میں غیر معمولی قوت اور جوش پیدا ہو جاتا ہے۔

شبلی کے اندر جو برتری اور فخر کا احساس ہے، اس میں ان کے نسلی اثرات کا بھی دخل ہے۔ راجپوت اپنے اسلاف کے کارناموں اور نسلی روایات پر بہت ناز کرتے ہیں۔ شبلی بھی نسلی اعتبار سے راجپوت تھے۔ اس لیے قدرتی طور پر اس کا اثر ان کے اندر آنا تھا۔ ان کے مصنفانہ رجحانات کا تعین کرنے میں ان اثرات اور عوامل کا بڑا حصہ ہے۔ لہٰذا علامہ نے اسلاف کی تاریخ کو جو ہمارے لیے باعثِ فخر وافتخار ہے، اپنے لیے منتخب کیا۔ یہ بھی حقیقتاً ان کی فطرت اور ذہن کے تقاضے کے مطابق ہے۔

دوسری بات جو شبلی کی تحریروں میں بہت نمایاں ہے وہ ان کا اپنے فن پر اعتماد اور اس بات کا یقین کہ ان کا مقصد اعلیٰ اور برتر ہے۔ عام طور پر اس کا اظہار اس طریقِ خطاب سے کرتے ہیں جس کی مدد سے

---

[1] مسلمانوں کا پولیٹکل کروٹ: علامہ شبلی نعمانی، ص ۴۲

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

وہ قاری کو بالواسطہ طور پر متوجہ کرتے ہیں۔شبلی کے انداز سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایسی حقیقت سے لوگوں کو باخبر کرنا چاہتے ہیں، جس سے وہ ابھی تک بے خبر ہیں۔ان کے خطاب کرنے کے طریقے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اپنے عہد کی ممتاز شخصیت ہیں اور جو مقصد وہ لے کر آئے ہیں اس کا علم عام لوگوں کو نہیں ہے۔اس سے مولانا کے اسلوب میں وثوق اور اعتماد پیدا ہوتا ہے۔جس کی وجہ سے قاری ان کا مطالعہ بہت گہرائی اور ذوق کے ساتھ کرتا ہے اور اس کو مصنف کے اپنے سے برتر ہونے کا یقین ہو جاتا ہے۔

اسکو سمجھنے کے لیے ان کے خطاب کرنے کے انداز پر غور کرنا ہوگا۔شبلی کو خطاب کرنے کے بہت سے طریقے پسند ہیں۔ان میں سے ایک یہ ہے ''تم بھی جانتے ہو''۔حالانکہ یہ طریقۂ خطاب کچھ لوگوں کو گراں بھی گزرتا ہے۔لیکن اس جملے کے پیچھے اعتماد کی طاقت ہے اور قاری اس سے اثر قبول کیے بغیر نہیں رہ پاتا۔شبلی کی تصانیف میں علمی رنگ غالب ہے۔اور جن کو یہ مخاطب کرتے ہیں ان سب کا تعلق بھی علمی طبقے سے ہے۔مگر شبلی کے خطاب کا طریقہ ایسا ہے۔جیسا کہ کوئی استاد کسی شاگرد سے خطاب کرتا ہے۔

علامہ کی مختلف تصانیف میں ان کا طرزِ مخاطب مختلف شکلوں میں ہمارے سامنے آتا ہے۔مثلاً ''تم غور کرو''، ''تم قیاس کرو'' عام استدلالی تحریروں میں۔''تم قیاس کرو''، ''تم انصاف کرو'' جس وقت تاریخی تراعات کا فیصلہ کرتے ہیں۔

طرزِ تخاطب میں اپنے آپ کو اپنے قاری سے برتر رکھنے کے لیے شبلی ایک طریقہ اور اختیار کرتے ہیں وہ یہ کہ قاری کے سامنے ایسے انسانوں کا تصور پیش کرتے ہیں جو ان کی طرح فطرت کے رازوں کو جانتے ہیں۔اس کا بھی مقصد یہی ہے کہ صرف وہی ان رازوں سے واقف ہیں۔ان کا یہ انداز پہلے سے بھی زیادہ کارگر ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ قاری اس تجسس میں پڑ جاتا ہے کہ وہ کون سی شخصیتیں ہیں جن کو خدا نے ان اعلیٰ حقیقتوں کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے دنیا میں بھیجا ہے۔لیکن بہت جلد ہی قاری کو اپنی بے کسی اور لاچاری کا علم ہو جاتا ہے اور ساتھ ساتھ یہ بھی پتہ چل جاتا ہے مصنف بھی انھیں فطرت شناسوں میں ہے اور جس کا وہ مطالعہ کر رہا ہے وہ ایک ایسا راز ہے، ایسی حقیقت ہے۔جس کا اندازہ کچھ ہی لوگوں کو ہوتا ہے۔مثلاً ''الفاروق'' (حصہ دوم) کا آغاز اس عبارت سے ہوتا ہے:

''پہلے حصے میں تم فتوحات کی تفصیل پڑھ آئے ہو اس سے تمہارے دل پر اس عہد کے

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

مسلمانوں کے جوشِ ہمت، عزم واستقلال کا قوی اثر پیدا ہوگا۔ لیکن اسلاف کی داستان سننے میں تم نے اس کی پروانہ کی ہوگی کہ واقعات کو فلسفۂ تاریخ کی نگاہ سے دیکھا جائے لیکن ایک نکتہ سنج مؤرخ کے دل میں فوراً یہ سوالات پیدا ہوں گے کہ چند صحرانشینوں نے کیونکر فارس وروم کا دفتر الٹ دیا۔''[1]

نکتہ، نکتہ سنج، نکتہ شناس، کی صفت ان کی تحریروں میں کثرت سے استعمال کی ہوئی ہے۔ مگر جب وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ ''قانونِ فطرت کے نکتہ شناس جانتے ہیں'' یا نکتہ شناس سمجھ سکتا ہے، یا فلسفیانہ نکتہ ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ قاری کو مبہم طریقے سے اپنی فضیلت اور ذہانت کا یقین دلاتے ہیں۔ اور اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاتے ہیں اور اسی میں ان کی نثر کی داخلی قوت کا راز پنہاں ہے۔

علامہ چند جملوں کا استعمال خصوصیت کے ساتھ کرتے ہیں۔ مثلاً ''انصاف یہ ہے، حق یہ ہے، سچ یہ ہے، حقیقت یہ ہے'' یہ جملے لمبی بحث کے بعد دفعتہً سامنے آتے ہیں اور قاری نیاز مندی کے ساتھ قبول کرلیتا ہے کیونکہ یہ اس زور اور قوت کے ساتھ ادا ہوتے ہیں کہ قاری کے پاس اور کوئی راستہ نہیں بچتا ہے۔

مولانا کو اپنے ہم عصروں سے جو مایوسی تھی اس کے لیے کسی تبصرے کی ضرورت نہیں ہے۔ حالانکہ اس زمانے میں بڑے بڑے علماء اور فضلاء موجود تھے اور اگر ہم انصاف کی نظر سے دیکھیں تو اس دور کی بہ نسبت اُس دور میں فضیلت کا معیار زیادہ بلند تھا اس کے باوجود بھی شبلی اس زمانے کی علمی فضیلت سے بدگمان اور بدظن نظر آتے ہیں۔ اس بدگمانی کو (جہاں تک جدید تعلیم یافتہ طبقے کا سوال ہے) غلط بھی قرار نہیں دیا جاسکتا ہے۔ مولانا اپنی تصانیف میں قوم کی بدمذاقی کا بہت کثرت سے ذکر کرتے ہیں اور کچھ مقالات تو ان کے محض اسی موضوع پر ہیں۔ موازنۂ انیسؔ ودبیرؔ کے آغاز میں لکھتے ہیں:

''فلسفہ اور شاعری برابر درجے کی چیزیں ہیں لیکن قوم کی بدمذاقی سے جس قسم کی شاعری نے ملک میں قبول عام حاصل کرلیا ہے۔ اس نے ان لوگوں کو یقین دلا دیا ہے کہ اردو شاعری میں زلف وخال وخط کے سوا اور کچھ نہیں قوم کی بدمذاقی کی نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ وہ اور مرزا دبیرؔ حریف مقابل قرار دیئے گئے۔''[2]

---

[1] الفاروق (حصہ دوم): علامہ شبلی نعمانی، ص ۲۰۴

[2] موازنۂ انیس ودبیر: علامہ شبلی نعمانی، ص ۳۲

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

یہ تو محض ایک ہی مثال ہے۔قوم کی بد مذاقی کا انھوں نے اس کثرت سے تذکرہ کیا ہے کہ وہ مثالوں کی محتاج نہیں۔

شبلی کو اپنے مقصد کے اعلیٰ اور برتر ہونے کا کامل یقین تھا۔اور یہ یقین بھی تھا کہ اس مقصد کے لیے جن صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان میں موجود ہیں اور اس کا اثر ان کی تحریروں میں بھی نظر آتا ہے۔ جس کی وجہ سے ان تحریروں میں بہت زیادہ خود اعتمادی کی جھلک ہے اور اس نے ان کی تحریروں میں داخلی فکری تنظیم اور ظاہری منطقی نظام پیدا کر دیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے فقرے چست اور ان کے پیراگراف اور عبارتیں مکمل، منظم اور فکری نظم وضبط کے اعتبار سے تعبیر کے عمدہ نمونے قرار دیے جا سکتے ہیں۔اسی منطقی اور علمی عنصر کے سبب ان کی نثر بہت باوقار اور پر رعب ہو گئی ہے۔

شبلی کی نثر میں منطقی توانائی اور فکری قوت تو پائی جاتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ لطف اور اثر بھی ملتا ہے۔اس کا سبب یہ ہے کہ علامہ کوشش کرتے ہیں کہ فکر کے خانوں کو تخیل کے رنگ سے بھر دیں۔

استعارہ کو شاعری کی ملکیت قرار دیا جاتا ہے۔لیکن بعض نثر نگار نثر میں بھی تشبیہ وتمثیل اور استعارات استعمال کرتے ہیں، جس طرح کوئی شاعر اپنی شاعری میں ان کو کام میں لاتا ہے۔شبلی ذکی الحس بھی تھے اور خود شناس بھی تھے۔ان کی فطرت میں انتہا پسندی پائی جاتی ہے۔یہ زندگی کی افراطی کیفیتوں اور حالتوں سے بہت زیادہ اثر قبول کرتے تھے۔ان کے استعاروں میں بھی اس کا اثر دیکھنے میں آتا ہے اور ان میں سے اکثر کی بنیاد مبالغہ ہے۔شعر وشاعری کے لیے مبالغہ جائز قرار دیا جا سکتا ہے جائز کیا بلکہ کہیں کہیں تو پسندیدہ اور مستحسن ہوتا ہے لیکن نثر میں اس کا عمل اعتدال سے ذرا بھی ہٹ جائے تو نثر اپنے مقام ومنصب سے دور ہو جاتی ہے یعنی حقائق اور معلومات کے فراہم ہونے کا ذریعہ نہیں رہتی۔لیکن شبلی اپنی فطرت کی وجہ سے مجبور تھے۔وہ طبعاً مبالغہ سے بچ نہیں پاتے تھے۔ان کے طرز بیان میں ان کی انتہا پسندی اور زود حسی نئے نئے انداز میں ہمارے سامنے آتی ہے۔اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ان کا ذہن اور خیال ایسی چیزوں کو پسند کرتا ہے جس میں رعد کی سی کڑک اور بجلی کی سی سرعت ہو۔ان کے استعاروں اور محاوروں کو دیکھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا ذہن زندگی کی معتدل اور نرم کیفیتوں کو نہیں دیکھ سکتا۔ان کا ذہن افراط اور تفریط دونوں حالتوں کو اپنے اندر سما لیتا ہے۔لیکن درمیانی کیفیتیں ان کے تصور سے بالاتر ہیں۔

منطق اور واقعات کی دنیا میں تصور کی وسعت ممکن نہیں ہے شاعر کا تخیل زیادہ وسیع ہوتا ہے اس میں

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

زیادہ لچک ہوتی ہے۔ وہ اپنے قوت تخیل کی مدد سے بہت دور تک جا سکتا ہے۔ لیکن ایک مورخ کے لئے ان سب چیزوں کی اجازت نہیں ہے۔ ان کیفیتوں سے مولانا کی طبیعت اور مزاج کی ترجمانی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر

''مذہبی خیالات میں بھونچال سا آ گیا ہے۔ نئے تعلیم یافتہ بالکل مرعوب ہو گئے ہیں قدیم علماء عزلت کے دریچے سے کبھی سر نکال کر دیکھتے ہیں تو مذہب کا افق غبار آلودہ نظر آتا ہے۔'' [1]

(بھونچال اور بالکل کا تصور غور طلب ہے)

''ترک اپنے زور قوت کی وجہ سے تمام عالم پر چھا گئے'' [2]

(تمام عالم اور چھا گئے مبالغہ ہے)

ان مثالوں سے یہ بات وضاحت کے ساتھ ہمارے سامنے آ جاتی ہے کہ شبلی کی فطرت میں جلد اور بے حد متاثر ہونے کا میلان تھا۔ زندگی کی شوخ اور شدید کیفیتوں اور حالتوں کو وہ بہت پسند کرتے تھے۔ شبلی کے تخیل کو فطری رجحان کے اثر کے تحت مبالغہ اور اغراق کی ان تصویروں کی تلاش رہتی ہے جو بذات خود مصنف کی ہیجان پسند اور پر جوش طبیعت کی وجہ سے پیدا ہوئیں اور جن سے سامعین اور قارئین کے لئے جوش انگیزی اور ہیجان خیزی کا سامان بہم پہنچتا ہے۔ شبلی ''کڑک دار'' محاروں کی مدد جوش کی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ شبلی کے استعارات اور محاورات سے جو تصویر بن کر ہمارے سامنے آتی ہی، اس میں اعتدال کی حالت اور کیفیت نہیں پائی جاتی ہے۔ یہ اس تیزی اور شدت کے ساتھ آتی ہے کہ قاری کو اس کے اعتدال کے بارے میں سوچنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔

علامہ کو ہنگامہ آفریں اور جوش انگیز مضامین بیان کرنے میں بہت مسرت ہوتی ہے۔ ان کی تصانیف کے موثر اور عمدہ حصے وہ ہیں جن میں انقلابات اور ہنگاموں کا ذکر ہے یا پھر وہ حصے ہیں جن میں فخر و افتخار کا پہلو پایا جاتا ہے۔ ن موقعوں پر مخصوص کنایات و محاورات بے ساختہ اور بکثرت استعمال ہوتے ہیں۔ شکست و ریخت، فوری بربادی و تباہی، توڑ پھوڑ ہنگامہ و ہم ہمہ کی جتنی خوبصورت تصویریں اور نقشے شبلی کے یہاں ملتے ہیں

---

[1] علم الکلام، ص ۳۔ شبلی نعمانی

[2] علم الکلام۔ شبلی نعمانی صفحہ ۵۵

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

کسی اور کے یہاں نہیں ملتے ہیں۔

علامہ استعاروں سے جو کام لیتے ہیں، ان کی تصانیف میں حسین ترکیبوں اور تخیل کو پیدا کرنے والے جذبہ انگیز الفاظ میں جو شان پائی جاتی ہے وہ کسی اور مصنف کے یہاں نہیں پائی جاتی ہے۔ انھوں نے یہ الفاظ فارسی شاعروں سے حاصل کئے ہیں۔ ان الفاظ کو علامہ نے فارسی شاعری کی ''جان'' کہا ہے۔ ان کی نثر میں فارسی کلام کی روح اور جوہر موجود ہے۔ تراکیب اور انتخاب الفاظ کے لحاظ سے شعرالعجم یا اس کے کچھ حصے یا مقالات کو پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے نثر فارسی شعراء کے دیوان کا نمونہ ہے۔ عشق و بے خودی، جوانی و شباب، شراب و سرمستی، بہار اور گل و گلزار..... سبک جذبہ انگیز لطیف خوش آواز شیریں اور حسین ترکیبیں اور ان سے لئے ہوئے استعارے اور کنائے جب علامہ کی تصانیف میں خوش مذاقی اور سلیقہ بندی سے اپنی اپنی حسن خیز کیفیتوں اور بہار آفرینیوں کے ساتھ خیال انگیز اور نظر افروز ہوتے ہیں تو قاری کا ذہن تصورات کی حسین اور خیال انگیز دنیا میں پہنچ جاتا ہے مثال کے طور پر شعرالعجم کا یہ اقتباس:-

> ''یہ بدیہی بات ہے کہ ملک کی آب و ہوا، سرسبزی کا اثر خیالات پر پڑتا ہے۔ اور اس ذریعے سے انشا پردازی اور شاعری تک پہنچتا ہے۔ عرب جاہلیت کا کلام دیکھو تو پہاڑ، صحرا، جنگل، بیابان، دشوار گزار راستے، مٹے ہوئے کھنڈر، ببولوں کے جھنڈ، پہاڑی جھاڑیاں یہ چیزیں ان کی شاعری کا سرمایہ ہیں لیکن یہی عرب جب بغداد میں پہنچے تو ان کا کلام چمنستان اور سنبلستان بن گیا۔ ایران ایک قدرتی چمن زار ہے۔ ملک پھولوں سے بھرا پڑا ہے قدم قدم پر آب رواں سبزہ زار اور آبشاریں ہیں۔ بہار آئی اور سرزمین تختہ زمرد بن گئی۔ بادِ سحر کے جھونکے، خوشبو کی لپٹ، سبزہ کی لہک، بلبلوں کی چہک، طاؤس کی جھنکار، آبشاروں کا شور وہ سماں ہے جو ایران کے سوا اور کہیں نظر نہیں آ سکتا۔''[1]

کتنے دل آویز الفاظ اور خود آواز ترکیبیں ہیں، کتنی دلکش اور حسین تصویر ہے۔ عروضی وزن کے علاوہ تمام باتیں وہ ہیں جو شاعری کے ساتھ مخصوص ہوتی ہیں شبلی کی نثری شاعری کا رنگ بہت خوبصورت ہے۔ ہم ان کی نثر کو پڑھتے جاتے ہیں اور محظوظ ہوتے جاتے ہیں اور بہت دیر تک ہم ایران کی وادیوں میں گھومتے رہتے ہیں۔ ان مین اکثر باتیں حالانکہ شاعرانہ صدات کی رو سے صحیح کہی جاسکتی ہیں لیکن حقیقت

---

[1] شعرالعجم، ج ۴، ص ۱۸۴

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

خارجی کے خلاف ہیں۔ اس کے باوجود اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ شبلی کا خیالی پیرایہ اظہار اور شاعرانہ انداز بیان کی بنا پر ایران کی یہ خوبیاں سچ سمجھی جارہی ہیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کچھ لوگ اس کو حقیقت سمجھ لیں۔ حالانکہ جو کچھ لکھا گیا ہے وہ ایران کے طبعی حالات پر مبنی ہے۔

شبلی کے پسندیدہ الفاظ کا کسی قدر اندازہ درج ذیل اقتباسات سے کیا جاسکتا ہے:-

''یہ عام قاعدہ ہے کہ جب کسی ملک میں تمدن کا جوش شباب پر ہوتا ہے تو ہر قسم کی قوتیں بڑے زور شور سے ابھرتی ہیں۔''[1]

''پانچویں اور چھٹی صدی ہجری میں فارسی شاعری کا عہد شباب تھا''۔[2]

''لیکن یہ چیزیں اگر مٹ جائیں تو دفعۃً سناٹا ہو جائے اور دنیا قالب بے جان اور شراب بے کیف، بے رنگ اور گہر بے آب ہو کر رہ جائے۔''[3]

''سبب یہ ہے کہ کتاب (احیاء العلوم) جس زمانے میں لکھی گئی خود امام صاحب تاثیر کے نشے میں سرشار تھے۔''[4]

''سلجوقیوں کی حکومت انتہائے شباب تک پہنچ گئی۔''[5]

شبلی کو شاعرانہ فضا پیدا کرنے کا اتنا شوق ہے کہ فارسی شاعری کی دلکش ترکیبوں اور لفظوں اور استعارات اور کنایات کے علاوہ جا بجا برمحل فارسی اشعار لکھنے کا موقع بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے ہیں۔ نثر کے فکری عنصر کی بنا پر اس میں جو اکتاہٹ پیدا ہوتی ہے اس سے نجات پانے کے لئے فارسی کا کوئی خوبصورت شعر لکھ دیتے ہیں۔ جن سے اس کا مزہ اور رنگ دونوں بدل جاتے ہیں۔

ان کی بہت سی تصانیف کا تو آغاز بھی اشعار سے ہوتا ہے اور اختتام بھی الغزالی کا آغاز ؎

ما طفلِ کم سواد و سبق قصہ ہائے دوست
صد بار خواندہ دوگر از سد گرفتہ ایم

۱۔ شعر العجم، ج ۴، ص ۱۷۴
۲۔ شعر العجم، ج ۴، ص ۱۷۷
۳۔ شعر العجم، ج ۴، ص ۸۹
۴۔ شعر العجم، ج ۴، ص ۶۳
۵۔ شعر العجم، ج ۴، ص ۱۲

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

علام الکام کا آغاز ؎

حدّ حسنِ تو بام راک نشاید دانست

این سخت نیز باندازۂ ادراکِ من است

شعر العجم کا آغاز ؎

حرم جویاں درے رامی پرستند

فقیہاں دفترے رامی پرستند

برافگن پردہ تا معلوم گردد

کہ یاراں دیگرے رامی پرستند

موازنۂ انیس و دبیر کا آغاز ؎

شمع ہا بردہ ام از صدق بہ خاک شہدا

تا دل و دیدۂ خونابہ فشانم دادند

غرض یہ کہ نثر میں شارانہ رنگ بھرنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اس کے علاوہ شعر کے استعمال سے انھیں یہ فائدہ ہوتا ہے کہ ایجاز و اختصار حاصل ہو جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ شعر کی مدد سے طویل عبارتیں لکھنے سے بچ جاتے ہیں۔ شعر سے قاری کے تخیل کے لئے نہایت وسیع اور کشادہ میدان مل جاتا ہے۔ اور نثر کے مقابلے میں شعر زیادہ اثر رکھتا ہے۔

فخر اور طنز کے لیے علامہ اشعار کا استعمال کرتے ہیں۔ جوش انگیز، فخریہ مضامین میں قاری کے تخیل کو اشاریت اور ابہام کی مدد سے انتہا درجے تک بیدار کر دیتے ہیں اور طنز کے موقعہ پر شعر کی مدد سے اخفاء اور ابہام کا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔

مولانا شبلی کی نثر نگاری سادہ ہے۔ لیکن کچھ لوگوں کا یہ سوچنا ہے کہ شبلی صرف سادہ نثر لکھتے ہیں اور ان کی نثر صنعت گری سے بالکل عاری ہوتی ہے، ٹھیک نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں حسن کاری کا ایک خاص انداز پایا جاتا ہے جس سے ان کی نثر لطف و اثر و حسن کا ایک خوبصورت نمونہ بن جاتی ہے۔ علامہ کو اس کے لئے کوئی کوشش نہیں کرنی پڑتی ہے بلکہ مضمون اور مدعا کے اقتضا سے خود ہی پیدا ہو جاتی ہے نثر تو کیا شاعری میں صنائع کا بہ تکلف استعمال اچھا نہیں مانا جاتا۔ لیکن کبھی کبھی خود بخود ہی کسی مصنف کے کلام یعنی نثر یا نظم میں

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

صنعت گری کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے اور طرز بیان کا قدرتی جزو بن جاتا ہے اور عبارت دلکش ہو جاتی ہے۔

اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ شبلی کی عبارتوں میں ایک یک رنگ صوتی فضا بے ساختہ طور پر پائی جاتی ہے۔ مصنف کے مضمون و معنی کے مطابق اور طبعی میلان کی وجہ سے اکثر موقعوں پر یہ فضا خود ہی بن جاتی ہے۔ مثلاً جب شبلی اپنی تصانیف میں جذباتی اور پر جوش مضامین قلمبند کرتے ہیں تو الفاظ اور حروف کی تکرار سے ایک قسم کی موسیقی کی فضا بن جاتی ہے جس سے ساری عبارت کا RHYTHM متاثر ہوتا ہے اور منفرد فقرات کا جزوی ترنم بھی دلکش اور پر معنی بن جاتا ہے۔ ہم جنس اور ہم رنگ لفظوں اور حرفوں کے جوڑے مولانا کی تحریروں میں بہت ہی شان و شوکت سے پائے جاتے ہیں اور خارجی اعتبار سے اس کو علامہ شبلی کی نثر کی ایک بڑی خصوصیت قرار دیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر:-

> ''شاعری کی بھی یہی حالت ہے، ابتداء میں سیدھے سادے صاف صاف اور بے تکلف خیالات ہوتے ہیں تشبیہات اور استعارات کہیں کہیں آ جاتے ہیں الفاظ میں تراش خراش نہیں ہوتی، جس مضمون کو ادا کرنا چاہتے ہیں بغیر کسی اینچ پیچ کے بے تکلف ادا کر دیتے ہیں اس سے قدم آگے بڑھتا ہے۔ تو خیالات میں بلندی شروع ہوتی ہے۔ استعارے رنگین ہو جاتے ہیں۔ تشبیہوں میں نزاکت آ جاتی ہے۔ مبالغوں میں زور پیدا ہو جاتا ہے۔ الفاظ میں تراش خراش شروع ہو جاتی ہے جس مضمون کو ادا کرتے ہیں استعاروں کے رنگ میں ادا کرتے ہیں۔ اس کے بعد دقت آفرینی اور باریک بینی شروع ہوتی ہے۔ مبالغے آسمان تک پہنچ جاتے ہیں۔ بال کی کھال نکالی جاتی ہے استعارے میں استعارے پیدا کرتے ہیں۔ محسوسات سے گزر کر صرف خیالی چیزوں پر مدار رہ جاتا ہے یہ ترقی کی آخری منزل ہے جو تنزل سے ہم دوش اور ہم آغوش ہے۔''[1]

اس اصول کی بنا پر فارسی شاعری کے دور اول کی سب سے پہلی خصوصیت سادگی اور بے تکلفی ہے ایران میں جب شاعری شروع ہوئی تو تمدن اور معاشرت کا اوج شباب تھا شاعری کا جو نمونہ سامنے تھا وہ متنبی اور ابونواس، ابن المقر بختری، ابوتمام کی رنگینی بیان اور طلسم کاریاں تھیں۔ باوجود اس کے فارسی شاعری میں

---

[1] شعر العجم، ج ۴، ص ۱۰۷

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

ابتداء میں ایسے سادہ اور بے تکلف اور سرسری خیالات نظر آتے ہیں۔

شبلی جب جوش اور جذبات کی کیفیت میں کوئی مضمون لکھتے ہیں تو ان کی طویل عبارتوں اور تحریروں میں یہ سماں پیدا ہو جاتا ہے۔ایسے میں ان کی نوک قلم سے ہم رنگ لفظوں اور حرفوں کے جوڑے نکلتے ہیں۔اور اپنی الگ الگ ٹولیاں بنا لیتے ہیں یہ رنگا رنگی قاری کے ذہن پر ایک عجیب سا اثر ڈالتی ہے۔جس سے ذہن پر رعب پڑتا ہے اور دل میں جوش پیدا ہوتا ہے۔مولانا کے اسلوب کے خارجی عناصر میں صوتی ہم رنگی اور رنگا رنگی کے باہمی امتزاج کو ایک منفرد اہمیت وحیثیت حاصل ہے۔اور اس سے ان کی خصوصیتوں اور لطافتوں پر روشنی پڑتی ہے۔شبلی نے قوم میں جوش پیدا کرنے کا فرض نبھایا تھا۔اس لئے ان سے اسی طرح کے فقرات و الفاظ کی توقع کی جاسکتی ہے۔اسلامی تاریخ کے ہر دور کے خوبصورت مرقع اور اسلام کے شاندار اور پر فخر ماضی کی رنگین تصویریں سب الگ الگ رنگ میں موجود تھیں طویل تحریروں اور عبارتوں کے علاوہ مختصر اور عام فقروں میں بھی یہی رنگ پایا جاتا ہے۔اس سے مولانا کے ذہنی ذوق کا اندازہ ہوتا ہے۔مثلاً

> ''مسلمانوں کے اگلے کارناموں کا غلغلہ سب سے پہلے اس گروہ نے بلند کیا جو آج نیا گروہ کہلاتا ہے۔اگر چہ اس مقصد کے لئے ان بزرگوں کو تاریخی تحقیقات سے بالذات سروکار نہ تھا لیکن چونکہ قوم کو غیرت اور حوصلہ دلانے کے لئے اس سے زیادہ کوئی افسوں کارگر نہ تھا.....اس لئے یہ بزرگ جب کبھی تقریر یا تحریر کے ذریعے سے لوگوں کو گرمانا چاہتے تھے تو خواہ مخواہ ان کو اسلام کے کارناموں کا حوالہ دینا پڑتا تھا۔رفتہ رفتہ ان پُر فخر واقعات کی طرف ان کی نگاہ مبذول ہوتی گئی یہاں تک کہ تاریخی تحقیقات کی ابتداء ہوئی اور بعض اہل قلم نے خاص اس بحث پر جستہ جستہ مضامین لکھے لیکن.....وہ ایک سرسری کاروائی سے زیادہ نہ تھا۔''[1]

اس عبارت میں مرادفات کے جوڑے ہیں جن کو اور کے ساتھ مربوط کیا گیا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ ہی ہم آواز حروف کی تکرار کی وجہ سے بہت خوبصورت سماں پیدا ہو گیا ہے عبارت کی صوتی فضا کو موثر کرنے کے لیے کوئی کوشش بھی نہیں کی گئی ہے۔

علامہ شبلی نعمانی کے دور کو اگر مناظرے کا دور کہا جائے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔قدیم اور جدید، علماء اور

---

[1] دیباچہ رسائل شبلی

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

انگریزی داں، مشرق اور مغرب، مذہب اور سائنس غرض زندگی کے ہر شعبے میں ایک کشمکش کی سی حالت ہے۔ علامہ کے اسلوب کی تعمیر میں اس مناظرے کی فضا کا بڑا ہاتھ ہے۔ تعلیم اور تربیت کے اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو وہ استدلالی اور معقولی نظر آتے ہیں۔ ان کے طرزِ بیان کو ڈھالنے میں مناظرے کے فکری اور استدلالی رنگ کا بڑا حصہ ہے۔ سنی، وہابی نزاع میں شروع شروع میں مولانا بہت دلچسپی لیتے تھے۔ آگے چل کر قسمت نے انھیں جب سرسید احمد خاں سے ملوایا تو وہ مناظرے اور نزاع کے وسیع تر میدان سے روشناس ہوئے۔ ان معاملات میں علامہ کا ایک خاص نقطۂ نظر تھا۔ انھیں اس کی صداقت پر ہر حالت میں یقین تھا۔ ان کی تحریروں میں اس کی وجہ سے ایک طرف تو وثوق اور خود اعتمادی کا جذبہ پیدا ہوا اور دوسری طرف جینے اور غالب آنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اور کہیں کہیں تلخی کا رنگ بھی نظر آتا ہے۔ اس تلخی نے علامہ کی تصانیف میں طرز و تعریض کی شکل اختیار کر لی ہے۔ ایک ماہر مناظر کی طرح علامہ بھی اپنے حریف کو شکست دیتے ہیں۔ اپنے ہیجان خیز فقروں کی مدد سے وہ مخاطبوں کو مرعوب اور مسخر کر دیتے ہیں۔ اور اچانک ایک زوردار حملہ بول کر مخاطب کو مفلوج کر لیتے ہیں۔ اس کے لیے وہ طنز و تعریض کو کام میں لاتے ہیں۔

شبلی کی تصانیف کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وقت گذارنے کے ساتھ ساتھ ہی ان کی عبارتوں اور تحریروں میں طنز و تعریض میں شدت آتی گئی ہے۔ ''المامون'' اور ''سیرۃ النعمان'' میں البتہ یہ کچھ کم ہے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یہ رنگ گہرا ہوتا گیا ہے۔

شبلی کی سبھی تصانیف میں ان کے طنزیاتی جملے اور فقرے ذاتی حواشی کے روپ میں پائے جاتے ہیں۔ تاریخی تصانیف میں بھی معترضہ جملے ان کی قلم سے بے ساختہ نکل جاتے ہیں اور قاری کے ذہن میں ہنگامہ سا برپا ہو جاتا ہے۔

شبلی نے جن مباحث میں طنز سے کام لیا ہے یہ وہی مباحث ہیں جن کی وجہ سے یہ صدی ذہنی طور پر فکر مند اور پریشان تھی۔ انھوں نے یورپ کے مورخین اسلام کے خلاف جو طنز و تعریض کی ہیں وہ سب سے زیادہ کامیاب اور موثر ہیں۔ شبلی ان کے تعصب کے خلاف دل میں شدید غصہ رکھتے تھے۔ انھیں شروع سے ہی ان مؤرخین سے شکایت تھی۔ لیکن تاریخ اسلام کو پیش کرنے اور یورپ کی تاریخوں کے مطالعہ کا انھیں جتنا موقعہ ملا ان کے متعلق ان کے طنز میں شدت بڑھتی گئی۔ یورپ کے مؤرخیں کو اپنی تاریخ پر جو فخر تھا اس کو علامہ نے ''مردہ فخر'' بتایا ہے۔ شبلی کے شروع کے لہجے میں زیادہ تلخی نہیں ہے۔ یورپ کے ناانصاف مؤرخین کے خلاف

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

اپنی شکایت کا تذکرہ انھوں نے جہانگیر اور ترک جہانگیر میں کیا ہے۔شبلی نے یورپین مصنفین کو شعر العجم میں کئی موقعوں پر یورپ کے نکتہ سنج کہا ہے۔لیکن اس سے ہرگز یہ مطالب نہیں نکالا جا سکتا ہے کہ انھوں نے یورپ کی علمی فضیلتوں اور کارناموں اور علم دوستی سے انکار کیا ہے۔انھوں نے اپنی تصانیف میں یورپ کے علمی کارناموں کو تسلیم کیا ہے۔ان کے معنویت کے اظہار کی وجہ اسلامی علوم سے اعتنا ہے اس کے بعد جو سب سے زیادہ ان کے طنز کا نشانہ بنا ہے وہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ ہے۔جو صرف دعوے کرتے ہیں اور عمل کچھ نہیں کرتے ہیں۔اس سے شبلی بہت ناراض ہیں۔

سر سید احمد خاں اور شبلی کا اختلاف شبلی کے طنز کا ایک اہم موضوع ہے۔لیکن جب ہم ان کے طنزیہ ادب کا مطالعہ کرتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ شبلی، سر سید احمد خاں کی ذات کے خلاف مخالفانہ یا شدید مخالفانہ رویہ نہیں رکھتے تھے۔''المامون'' سے لے کر آخر زمانے تک سید صاحب کے متعلق اپنے لہجے کو نرم رکھا ہے لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ انھوں جدید تعلیم یافتہ طبقہ پر سخت نکتہ چینی کی ہے۔اس ادب کا ایک ایک جملہ اور فقرہ اپنے اندر طنز کے دفتر کے دفتر رکھتا ہے۔

عموماً شبلی کے پر لطف طنز وہ ہیں جو ماضی یا غائب کے متعلق ہیں۔ان کے طنزیات میں عہد حاضر سے متعلق اخفا کم ہے۔اور طنز کھلی تضحیک کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔شعر العجم میں لکھتے ہیں:-

> ''نظامی اور جامی جیسے لوگ اس حمام میں آکر ننگے ہو جاتے ہیں لیکن فردوسی باوجود اس کے اس کو تقدس کا دعویٰ نہیں .....آنکھ نیچے کیے ہوئے آتا ہے۔''[1]
>
> اس طنز میں بھی ایک وقار، ایک عظمت اور شان ہے۔

شبلی اپنی دلیل اور نظریئے کے حق میں، نزاع اور مناظرہ میں موازنہ اور تقابل سے بہت کام لیتے ہیں۔خاص طور پر یورپ کی علم دوستی اور فیاضیوں کے بالمقابل ہندوستان کی خستہ حالت اور اسلام کے پر شکوہ، پر جلال اور شاندار ماضی کے مقابلے میں دورِ حاضر میں مسلمانوں کی بے بسی، بے کسی، جہالت اور کس مپرسی کا تقابل اس خوبی اور اس تواتر سے کیا ہے کہ ان کے نقطۂ نظر کے متعلق قاری کو پورا یقین ہو جاتا ہے۔بلکہ یہاں تک ہوتا ہے کہ مؤخر الذکر کے خلاف شدید ردِ عمل بھی پیدا ہو جاتا ہے۔بعض اوقات ان کا انداز اس معاملے میں تحقیر اور تضحیک کی حد کو چھو لیتا ہے۔

---

[1] شعر العجم جلد ا: علامہ شبلی نعمانی، ص ۵۸

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

مولانا کے فکر اور ذہن کی مذکورہ بالا افتاد کو سمجھنے کے بعد اس امر پر بالکل تعجب نہیں ہوتا کہ ان کی تصانیف یا تحریروں میں ظرافت بہت کم پائی جاتی ہے۔ حالانکہ المامون، سیرۃ النعمان اور الغزالی وغیرہ میں انھوں نے کچھ نکتے لطیفے کے عنوان کے طور پر درج کیے ہیں لیکن بغور دیکھنے سے بھی اس بات کا اندزہ نہیں ہوتا ہے کہ اس میں کہیں ظرافت بھی ہے۔ ان لطیفوں کو عبارت میں کچھ بیانات یا زیادہ سے زیادہ شبلی کی طباعی اور نکتہ آفرینی کی نمونوں کی حیثیت حاصل ہے۔

مولانا شبلی نعمانی کی زندگی سے جن کو واقفیت ہے وہ جانتے ہیں کہ مولانا فاروق چریاکوٹی سے انھوں نے معقولات کی تعلیم حاصل کی۔ مولانا فاروق صاحب کو اس وقت فلسفہ اور منطق کا امام مانا جاتا تھا۔ شبلی پر ان کا بہت زیادہ اثر تھا۔ یہی وجہ سے کہ انھیں فلسفہ سے اتنی زیادہ دلچسپی تھی۔ شبلی کے علم کلام پر جو تصانیف ہیں ان سے ان کے اس طرف میلانات کا صحیح طور پر اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ ہر علم کا اپنا ایک فلسفہ ہے۔ لہذا شبلی اپنی تصانیف میں مؤرخ کے ساتھ ساتھ فلسفی بھی نظر آتے ہیں۔

ان کی صحیح تربیت اور فلسفیانہ ذہن کی وجہ سے ان کا اسلوب بھی اثر انداز ہوا ہے۔ علامہ کی تصانیف میں توضیح اور تشریح کا جو سادہ اور صاف طریقہ پایا جاتا ہے، وہ کسی اور کے یہاں نہیں ملتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کو اپنی مدرسانہ زندگی سے بھی فائدہ پہنچا۔ لیکن ان کا واضح اور پاک استدلال ان کی منطقیانہ اور فلسفیانہ استعداد اور مشق کا نتیجہ کہا جاسکتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ شبلی کو اپنے جن کارنامون کی بدولت حیاتِ دوام حاصل ہوئی ہے وہ ان کی فلسفیانہ تصانیف نہیں ہیں لیکن یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ان کی فلسفیانہ تصانیف نے ان کے علمی مرتبے میں اضافہ کیا ہے۔ اور مولانا کو انشا پرداز اور ادیب ہونے کے ساتھ فلسفی اور عالم ہونے کا شرف بھی حاصل ہوا ہے۔

ایک اعتبار سے دیکھا جائے تو ان کی فلسفیانہ تصانیف کو فلسفیانہ نثر کا بہترین نمونہ کہا جاسکتا ہے۔ شبلی نے ان میں اپنے شاعرانہ میلان کو بہت کم جگہ دی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں ہیجان اور جوش کے موقعے بہت زیادہ نہیں ہیں۔ انھوں نے ایک ایک مسئلے کو بہت سکون اور صبر کے ساتھ اٹھایا ہے۔ اور اس کے ہر پہلو کی ہمارے سامنے وضاحت کردی ہے۔ اور مشکل سے مشکل مسئلے کو اس مہارت سے حل کیا ہے کہ اس کے بارے میں کوئی شک نہیں رہتا ہے۔

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

شبلی کو قدرت کی طرف سے شاعرانہ ذوق عطا کیا گیا تھا لیکن عصری تقاضوں کے مدِ نظر انھوں نے اپنے اظہارِ خیال کے لیے نثر کو چنا کیونکہ یہ سرسید احمد خاں اور نثر کا دور تھا۔ سرسید احمد خاں کے ٹھوس اور سنجیدہ مقاصد، قدیم شاعری کی روایات کے خلاف احتجاج عام اور اس عہد میں عقل پسندی کی تحریک کو بڑھاوا ملا۔ ان وجوہات کی بنا پر شعر و شاعری کے مقابلہ میں نثر کو زیادہ قبولیت حاصل ہوئی۔ شبلی نے بھی نثر کو بطورِ فن کے اختیار کیا۔ اور شعر و شاعری کی طرف ضمناً توجہ کی۔ اس سے زمانے اور ماحول کی پیروی کا پتا چلتا ہے۔ ورنہ اگر افتادِ طبع کے اعتبار سے دیکھا جائے تو شبلی ایک شاعر ہی تھے۔ لہٰذا اس کا اثر ان کی نثر میں بھی صاف طور پر نظر آتا ہے۔

شبلی نے نثر میں تاریخ نگاری کو منتخب کیا۔ لیکن تاریخ کا بھی وہ حصہ جو قدیم عظمت و فخر کے کارناموں کا ہے۔ اس میں بھی ان کی فطرت کا دخل ہے۔ ان کی طبیعت کو فخریہ کارناموں سے قدرتی مناسبت تھی۔ لہٰذا انھوں نے اپنا موضوع ناموران اسلام کی تاریخ کو بنایا۔

اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا ہے کہ تاریخ آرٹ نہیں ہے بلکہ بنیادی طور پر سائنس ہے۔ لیکن اس کے کچھ پہلو آرٹ اور فلسفہ کی حدود میں آتے ہیں۔ سائنس کو حقیقت نگاری کے متقاضی کہا جا سکتا ہے۔ تخیل کی آمیزش سے حقیقت نگاری کو نقصان پہنچتا ہے ''الفاروق'' کے دیباچے میں شبلی نے لکھا ہے:

''درحقیقت تاریخ اور انشا پردازی کی حدیں بالکل جدا جدا ہیں۔''

''مؤرخ کا اصلی فرض یہ ہے کہ وہ سادہ واقعہ نگاری کی حد سے تجاوز نہ کر پائے۔ یورپ میں آج کل جو بڑا مؤرخ گزرا ہے اور جو طرز حال کا موجد ہے، رینکی ہے۔ اس کی تعریف ایک پروفیسر نے ان الفاظ میں کی ہے۔ اس نے تاریخ میں شاعری سے کام نہیں لیا۔ وہ نہ ملک کا ہمدرد بنا نہ مذہب و قوم کا طرف دار ہوا۔ کسی واقعہ کے بیان کرنے میں مطلق پتہ نہیں لگتا کہ وہ کن باتوں سے خوش ہوتا ہے۔ اور اس کا ذاتی اعتقاد کیا ہے۔''

لیکن کیا شبلی بھی تاریخ نگاری کا یہی اسلوب رکھتے ہیں؟ اس کا جواب ہمیں نفی میں ملتا ہے مکمل غیر جانبداری اور واقعہ نگاری کی توقع شبلی سے نہیں کی جا سکتی تھی اس کی وجہ یہ ہی کہ ان کے پیش نظر جو مقصد تھا وہ (قوم میں جوش پیدا کرنا) اور افتادِ طبع تھے۔

مبالغہ تخیل سے پیدا ہوتا ہے۔ شاعری میں اس کا استعمال بعض اوقات مستحسن مانا جاتا ہے۔ نثر میں

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

کچھ ضروری معلومات کو مخاطب تک پہنچانا ہوتا ہے مبالغہ سے بیان کو نقصان پہنچتا ہے۔ مبالغہ کے غیر معتدل استعمال سے شبلی کی مورخانہ حقیقت نگاری کو نقصان پہنچا ہے مثلاً

''اشاعرہ کے خیالات تمام دنیا پر چھا گئے۔''

اوپر کی عبارت میں غیر معتدل مبالغہ ہے۔

ایک اور مثال

''ترک اپنے زور اور قوت سے تمام عالم پر چھا گئے''

حالانکہ یہاں تمام عالم نہیں صرف چند حصے مراد ہیں۔

شبلی کی تحریروں میں یہ کمی ان کی استعارہ پسندی کی وجہ سے ہے۔ مولانا اپنی افتادِ طبع کی وجہ سے افراط وتفریط سے بچ نہیں پاتے ہیں جس کی وجہ سے وہ جب کوئی پر جوش مضمون لکھتے ہیں تو کسی ایسے محاورے کا انتخاب کر لیتے ہیں، جس میں زندگی کی طوفانی اور شدید ہیجانی کیفیتیں پائی جاتی ہیں اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا ہے کہ تاریخ کی سادہ حقیقتیں اس طرح کے خطیبانہ طرز بیان کا تحمل نہیں کر سکتی ہیں۔ امور ذیل سے تاریخ کی نگارش عبارت ہے۔

۱- واقعات کا بیان

۲- واقعات کے ضمن میں اشخاص

مواقع اور مناظر و مقامات کا وصف

۳- یہ بحث کہ یہ کیوں ظہور میں آئے اور ان کا اثر آئندہ کی تاریخ پر کیا ہوا؟

ان کے پیرایۂ بیان سے ان تینوں موضوعات میں ان کی حقیقت نگاری کو نقصان پہنچتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ واقعات کے بیان میں ربط اور تسلسل کو مدنظر رکھتے ہیں۔ ان مواقع پر وہ مختصر فقرے لکھتے ہیں۔ تمثیلوں اور حکایتوں سے بھی وہ فائدہ اٹھاتے ہیں اور عام طور پر نقلِ قول اور مکالمہ کو بھی کام میں لاتے ہیں جزئیات کی صحت کا بھی انھیں خیال رہتا ہے تعدیل اور جرح کے اصول کو بھی اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ بیان میں ہمواری ہوتی ہے افراط وتفریط پر بھی قابو رکھتے ہیں لیکن ایسا اسی وقت ہوتا ہے جب شبلی کو واقعات سے کوئی جذباتی لگاؤ نہیں ہوتا ہے کیونکہ جب کسی واقعہ سے جذباتی لگاؤ ہوتا ہے تو منطقی ضبط اور فکری نگرانی کی ڈور ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہے۔ اس صورت میں ان کے ذہن سے ہمواری اور سکون نکل جاتا ہے اور نتیجہ کے

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

طور پر عبارت میں مبالغہ کی آمیزش ہو جاتی ہے۔ یا پھر یہ ہوتا ہے کہ جملہ ہائے معترضہ کی طرف مائل ہو کر بہت زیادہ طنز و تعریض ہونے لگتی ہے اس لئے واقعہ حقیقت سے بہت دور ہو جاتا ہے۔

علامہ شبلی جس وقت ''الفاروق'' اور ''المامون'' تصنیف کر رہے تھے، اس زمانے میں مواقع اور اوصاف کی تصویر کھینچنے کے لئے تشبیہات کا بھی استعمال کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت ان کا ذہن اشتعالی کیفیتوں اور تلخیوں سے پاک تھا۔ بیرونی اثرات کے پیش نظر یہ تلخیاں بڑھتی گئیں۔ المامون ان عیبوں سے نسبتاً پاک ہے لیکن جیسے جیسے وقت گذرتا گیا جوش بیان، اعتدال پر غالب آتا گیا۔ ''الفاروق'' کے زمانے میں جو تشبیہ استعمال کی ہے اس کا انداز کچھ اس طرح ہے

☆ مسلمان سیلاب کی طرح بڑھتے چلے گئے اور تیر اندازوں کو خس و خاشاک کی طرح ہٹاتے پار نکل گئے۔

☆ خالد اس بے پروائی اور تحقیر کی نگاہ سے ان پر نظر ڈالتے جاتے تھے جس طرح شیر بکریوں کے ریوڑ کو چیرتا چلا جاتا ہے۔

ان مماثلتوں میں بھی ہیجان کا عنصر پایا جاتا ہے۔ لیکن تشبیہ کی وجہ سے اعتدال قائم ہے۔

اس زمانے کے استعاروں کی سادگی بھی غور طلب ہے مثلاً

☆ درحقیقت ان کی عظمت و شان کے تاج پر سادگی کا طرہ نہایت خوش نما معلوم ہوتا ہے۔

شبلی کی تاریخ نگاری کا ایک خاص نقطہ نظر اور مقصد ہے اور وہ ہے قوم میں غیرت اور جوش کا پیدا کرنا اس کے لئے انھوں نے اسلام کی تاریخ کے شاندار حصے منتخب کئے ہیں چنانچہ اس نقطہ نظر اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے جو تاریخ نگاری ہوگی اس میں خطیبانہ انداز لامحالہ آجائے گا یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ شبلی جب اپنے پسندیدہ موضوعات پر لکھنے کے لئے قلم اٹھاتے ہیں تو ان کی اثر آفرینی کی کوشش قدرتی جذبات انداز سے آگے بڑھ جاتی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ وہ جان بوجھ کر یا شعوری طور پر مخاطب اور قاری کے جذبات میں اشتعال پیدا کرنا چاہتے ہیں اور بہ تکلف اور بلاضرورت جذبات میں ہیجان پیدا کر رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں تاریخ کے لئے افسانے اور داستان کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس کا مقصد قاری کے تخیل اور استعجاب کو ابھارنا ہے۔ اور اسی طرح طلسم، راز فلسفہ تاریخ کا ایک راز نکتہ اور اس قسم کے بہت سے الفاظ سے ان کا مقصد محض اتنا ہے کہ قاری کی توجہ اور تعجب کو حرکت دی جائے۔ تاریخ کی کوئی حقیقت صرف ایک علمی حقیقت ہے کوئی طلسم اور راز نہیں ہے تاریخ کو تاریخ ہی رہنے دینا چاہیے، داستان نہیں بنانا چاہیے۔ لیکن شبلی

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

نے ان عام حقیقتوں کو طلسم اور راز جیسے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ اس سے وہ قاری کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنا چاہتے ہیں۔

شبلی کا اسلوب بیان ان کی عظمت کی سب سے بڑی بنیاد ہے۔ ان کے اسلوب کی نمایاں خصوصیت ولولہ خیزی اور جوش انگیزی ہے جس کو انھوں نے اپنی سادگی، ایجاز و اختصار کے ساتھ اس طرح شیر و شکر کر دیا ہے کہ ان کا جوش، توانائی اور لطف، قوت، حسن اور اثر اور تحریروں کا ایک منفرد نمونہ بن گیا ہے۔ ان کی تاریخ کو تو تنقید کا نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔ لیکن ان کے اسلوب بیان پر نکتہ چینی کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ ان کی تاریخ نگاری ناقص اور ادھوری ہو سکتی ہے لیکن ان کا طرز بیان زندہ اور توانا ہے جو ان کی تاریخ کو مٹنے نہیں دے گا وہ تاریخ کی مدد سے اسلامی کارناموں کے متعلق جوش پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اور اس کام کو انھوں نے بہت کامیابی کے ساتھ کیا۔ حقیقی تاریخ نگاری کو کسی پہلے سے سوچے سمجھے نقطہ نظر کا متحمل قرار نہیں دیا جا سکتا ہے۔ تاریخ میں مرثیہ کی ہیجان خیزی اور رجز کی جوش انگیزی، اس کے مقاصد کے لئے مضر ہے۔ علامہ کی تاریخ نگاری کا یہی انداز ہے جو تاریخ کو علمی انداز سے دیکھتا ہے یا پرکھتا ہے، اس کی نظر میں یہ تاریخ ناقص ہوگی۔ اور شبلی اس کو مورخ سے زیادہ ادیب نظر آئیں گے۔ اور ان کی تاریخ، ان کے مکاتیب، ان کی فلسفیانہ تصانیف اور ان کے مقالات کا رتبہ اس سے قاری کے ذہن میں بہت زیادہ اونچا نہیں ہوگا۔

شبلی کو اردو ادب میں علمی اور ادبی بنا پر بلند مقام اور مرتبہ حاصل ہے۔ لیکن ان کے اسلوب بیان کی وجہ سے انھیں بقائے دوام حاصل ہوا ہے۔ اردو نثر میں مولانا کو جو بلند مقام ملا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نی تاریخ کے رازوں کی پردہ کشائی اور علمی انکشافات کئے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ اردو کے دوسرے صاحب طرز انشا پردازوں سے ممتاز ہیں۔

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

ج-الفاروق

فاروق اعظم حضرت عمر بن خطاب خلیفہ ثانیؓ کی سیرت ہے۔علامہ شبلی نعمانی نے ''نامور فرمانروایان اسلام'' کا جو سلسلہ شروع کیا تھا، اس سلسلے کی یہ پہلی کتاب ہے۔لیکن یہ المامون کے بعد تصنیف ہوئی۔ ۱۸/ اگست ۱۸۹۴ء سے علامہ شبلی نے اس کو باقاعدہ لکھنا شروع کیا۔اور ٹھیک چار برس کے بعد اس کو مکمل کیا۔ ''الفاروق'' علی گڑھ کی ملازمت کے زمانے میں شروع ہوئی تھی اور حیدرآباد کی ملازمت کے زمانے میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔سیرت سے متعلق علامہ کی جتنی تصانیف ہیں وہ سبھی دو حصوں میں ہیں۔لہٰذا الفاروق کے بھی دو حصے ہیں۔

پہلے حصے میں حضرت عمرؓ کی زندگی کے واقعات اور ملکی فتوحات کی تفصیل ہے اور دوسرے حصے میں ملکی انتظامات اور ذاتی کمالات کا ذکر ہے۔علامہ لکھتے ہیں کہ ''یہی دوسرا حصہ مصنف کی سعی و محنت کی تماشا گاہ ہے''۔[1]

الفاروق پر بہت سے اعتراضات کیے گئے ہیں لیکن ان اعتراضات کے باوجود الفاروق اپنے موضوع پر ایسی جامع اور مکمل تصنیف ہے کہ اردو زبان میں اس کا کوئی ثانی نہیں ہے۔اس کے بعد حضرت عمر فاروقؓ کی سیرت پر کئی ضخیم اور مختصر سوانح عمریاں لکھی گئیں اور ان میں کچھ اچھی بھی ہیں۔لیکن ان مصنفین نے تحقیق کا ہنر علامہ سے ہی سیکھا تھا۔

علامہ شبلی نعمانیؒ لکھتے ہیں کہ اس وقت تک حضرت عمر فاروقؓ کے حالات پر جو تصانیف تھیں، ان میں ہر طرح کے ضروری واقعات نہیں ملتے۔لیکن کچھ تصانیف سے اس کی کافی حد تک تلافی ہو جاتی ہے۔ابن الوردی کی (الاحکام السلطانیہ) مقدمہ ابن خلدون و کتاب الخراج سے حضرت عمرؓ کے طریق حکومت اور آئین انتظام کے متعلق بہت سی باتیں معلوم ہو سکتی ہیں۔محمد بن خلف الوکیع کی اخبار القضاۃ سے خاص صیغہ

---

[1] داستان تاریخ اردو-حامد حسن قادری، صفحہ ۷۸۱، ۱۹۹۰ء

T-7234

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

قضا کے متعلق ان کا طریق عمل معلوم ہوتا ہے۔ کتاب الاوائل لابی ہلال العسکری ومجالس الوسائل الی اخبار الاوابل میں ان کی اوّلیات کی تفصیل ہے۔ عقد الفرید جاحظ کی کتاب البیان والتبیین میں ان کے خطبے منقول ہیں۔ ابن رشیق القیروانی کی کتاب العمدۃ سے حضرت عمر فاروقؓ کا شاعرانہ مذاق معلوم ہوتا ہے۔

ترتیب کے اعتبار سے پہلا حصہ پہلے چھپنا چاہیے تھا اور دوسرا بعد میں۔ لیکن ''الفاروق'' کے معاملے میں یہ ترتیب الٹی ہوگئی۔ اس کا دوسرا حصہ پہلے شائع ہوا۔ اس کی وجہ افادی کے نام اپنے خط میں شبلی یہ بتاتے ہیں:

''الفاروق کانپور میں مطبع نامی سے بڑے اہتمام سے چھپ رہی ہے، ایک حصہ جسکے ۳۱۲ صفحے ہیں چھپ کر تیار ہوگیا ہے۔''[1]

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کتاب کا دوسرا حصہ پہلے شایع ہوا۔ کیونکہ پہلے ایڈیشن میں وہ ۳۱۲ صفحات پر مشتمل تھا۔ علامہ شبلی نے ''الفاروق'' کے دوسرے حصہ میں زیادہ تحقیق اور تدقیق سے کام لیا ہے۔ غالباً اسی لیے وہ دوسرے حصّے کو پہلے عوام کے سامنے پیش کرنا چاہتے تھے۔ اسی کے پیشِ نظر دوسرا حصہ انھوں نے پہلے شائع کروایا۔

المامون کے بعد شبلی الفاروق لکھنا چاہتے تھے لیکن کچھ مجبوریوں کی وجہ سے وہ اس خواہش کو پورا نہ کر سکے۔ اس کا اظہار علامہ نے المامون کے دیباچہ میں بھی کیا ہے، جو جنوری ۱۸۱۲ء میں شائع ہو چکی تھی۔ لکھتے ہیں:

''المامون کے بعد میں نے الفاروق لکھنی شروع کی تھی اور ایک معتد بہ حصہ لکھ بھی لیا تھا، لیکن بعض مجبوریوں سے چند روز کے لیے اس کی تالیف سے ہاتھ اٹھانا پڑا۔''[2]

حالانکہ شبلی نے المامون کے دیباچے میں صاف طور پر یہ بات کہی ہے کہ یہ مجبوریاں محض کتابوں کے نہ ملنے کی وجہ سے ہیں۔ اس کے باوجود سید سلیمان ندوی کا ماننا ہے کہ الفاروق کی تالیف سرسید احمد خاں کیوجہ سے رک گئی تھی۔ مولانا ندویؒ کا خیال ہے کہ ایم۔ اے۔ او کالج کے قیام کا مقصد مسلمانوں کو متحد کرنا تھا، سرسید اس کے قیام کے اس مقصد کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ انھیں ڈر تھا کہ الفاروق کی تصنیف کی وجہ سے

---

[1] خط نمبر ۸ بنام مہدی افادی، مکتایب شبلی جلد دوم، صفحہ ۱۹۷

[2] دیباچہ النعمان۔ صفحہ ۶

Maulana Azad Library, Aligh Muslim University

کالج میں کہیں شیعہ، سنّی کی تفریق نہ پیدا ہو جائے۔ اس تصنیف کی وجہ سے کالج کے مقصد کو قربان نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس کا اظہار سرسید نے مورخہ، مارچ ۱۸۹۲ء میں کیا ہے، لکھتے ہیں:۔ ''ہم دعا کرتے ہیں کہ خدا کرے مولوی شبلی الفاروق نہ لکھیں''۔[1]

شبلی، سرسید احمد خاں کے اس خیال سے اتفاق نہیں کرتے تھے، ایک عرصے تک چپ رہنے کے بعد علامہ شبلی نے سرسید احمد خاں کو مشورہ دیا کہ وہ اس مسئلہ پر نواب حسین بلگرامی سے بات کریں جو شیعہ تھے اور کالج کے ہمدردوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ سرسید نے انھیں خط لکھا اور اس خط کا جواب یہ آیا کہ:

''اسلام نے ایک فاروق پیدا کیا ہے اور حیف ہے کہ اس کی سوانح عمری بھی نہ لکھی جائے''[2]

لہٰذا کافی شش و پنج کے بعد الفاروق کی تصنیف کا کام شروع ہوا۔ الفاروق سے پہلے کی تصانیف کے لیے تو ہندوستان میں علمی سرمایہ کافی تھا لیکن الفاروق کی تصنیف کے لیے جو معلومات درکار تھیں وہ ہندوستان میں دستیاب نہ تھیں چنانچہ علامہ شبلی نے اپنی تشنگی کو دور کرنے کے لیے روم، مصر اور شام کا سفر کیا۔ الفاروق کی تصنیف میں تاخیر ہونے کی ظاہری وجہ تو یہی ہے، لیکن سلیمان ندوی اس وجہ کو نہیں مانتے ہیں۔

شبلی کی ان مورخانہ کوششوں کے پیچھے یہ مقصد تھا کہ انگریزوں نے مسلمانوں کے دل میں ان کے اسلاف کے خلاف جو زہر بھر دیا تھا اس سے مسلمانوں کے دلوں کو صاف کیا جائے۔ اس کی شروعات علامہ شبلی نے اس طرح کی کہ رائل ہیروز آف اسلام (یعنی نامور فرمانروایانِ اسلام) کا سلسلہ شروع کیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے ان شخصیتوں کا انتخاب کیا جو حکومت کے نظم و نسق میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھیں۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی حضرت عمر فاروقؓ ہیں۔

حضرت عمر فاروقؓ کی شخصی، مذہبی اور روحانی عظمت سے دنیا میں کون واقف نہیں ہے۔ شبلی نے ان کے سیاسی نظامِ حکومت کو نمایاں کرنے پر زیادہ زور دیا ہے۔ شبلی نے اپنے استدلال اور مورخانہ طرزِ تحریر سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یورپ میں جو سیاسی نظامِ حکومت اس وقت رائج ہے وہ اسلام میں تیرہ سو برس پہلے ہی موجود تھا۔ اس وقت ملک میں ایسی جمہوری حکومت تھی، جس کا آج تصور بھی دشوار ہے، کوئی بھی امر بغیر کثرت رائے

---

[1] علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ، مارچ ۱۸۹۲ء

[2] حیات شبلی۔ سید سلیمان ندوی، صفحہ ۲۳

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

اور مشورے کے عمل میں نہیں آتا تھا۔ مجلس شوریٰ اس طرح منعقد کرائی جاتی تھی کہ پہلے سے ایک منادی اعلان کر دیتا تھا کہ ''الصلواۃ جامعۃ'' یعنی سب لوگ نماز کے لیے جمع ہوں۔ سب لوگ جمع ہو جاتے تو حضرت عمرؓ مسجد نبوی میں جا کر دو رکعت نماز پڑھتے، نماز کے بعد خطبہ ارشاد فرماتے۔ اس کے بعد جس امر پر بحث ہونی ہوتی اسے پیش کیا جاتا کسی عام مسئلے پر تو اس مجلس کے فیصلے کو کافی مانا جاتا تھا۔ لیکن اگر کوئی خاص مسئلہ ہوتا تو انصار اور مہاجرین کا عام اجلاس ہوتا اور اتفاقِ رائے سے وہ امر طے کیا جاتا تھا۔ عام رعایا کو بھی انتظامی امور میں دخل دینے کی اجازت تھی۔ اضلع اور صوبوں کے حاکموں کا تقرر بھی اکثر رعایا کی رائے سے ہوتا تھا۔ تمام عمال کو حج کے موقع پر حاضر ہونے کا حکم تھا۔ حج کی تقریب میں چاروں اطراف کے لوگ جمع ہوتے تھے۔ حضرت عمرؓ کھڑے ہو کر اعلان فرماتے تھے کہ کسی کو بھی کسی عامل سے شکایت ہو تو وہ بتائے۔ چنانچہ چھوٹی چھوٹی شکایتیں بھی سامنے آتیں اور تحقیق کے بعد ان کا تدارک ہو جاتا۔ عمال کی راستبازی اور دیانت اس طرح قائم رکھی جاتی تھی کہ اس کی تنخواہیں بہت زیادہ مقرر کی گئی تھیں۔ یورپ نے سینکڑوں برس کے تجربے کے بعد اس اصول کو سیکھا ہے۔ جن محکموں کی کسی ترقی یافتہ قوم کو ضرورت ہوتی وہ سب اس زمانہ میں موجود تھے۔ مثلاً مذہب، تعلیم، فوج، پبلک ورکس، پولس، فوجداری، بیت المال، عدالت، محاصل وغیرہ۔ ایسا لگتا ہے جیسے جمہوریت کا تصوّر یورپ والوں نے اسلام سے ہی سیکھا ہے۔ بڑے چھوٹے میں کوئی تفریق نہیں تھی۔ یہاں تک کہ حضرت عمرؓ کسی جرم کو کرنے پر اپنے بیٹوں کو بھی وہی سزا دیتے ہیں جو اس جرم کے لیے مقرر ہے چنانچہ ان کے بیٹے نے جب شراب پی تو خود اپنے ہاتھ سے ان کو اسّی (۸۰) کوڑے مارے۔ اسی صدمے سے وہ بے چارے قضا کر گئے۔

''الفاروق'' علاّمہ شبلی کی دوسری تصانیف سے کافی حد تک الگ ہے۔ اپنی دوسری تصانیف میں شبلی تاریخ کی خوبصورت فضاؤں میں ایسے گم ہو جاتے ہیں کہ اپنے آپ کو بھی بھول جاتے ہیں۔ لیکن ''الفاروق'' میں اس کے برخلاف ان کی یہی کوشش ہے کہ حضرت عمرؓ سے ان کا ہاتھ نہ چھوٹے۔ چنانچہ یکم ہجری سے آنحضرتؐ کے اس دنیا سے پردہ فرمانے تک حضرت عمرؓ کے حالات لکھنے کی ضرورت محسوس کی تو علامہ کو ایسا لگا کہ رسول اللہؐ کے حالاتِ زندگی آنکھوں کو اس قدر خیرہ کر دیں گے کہ حضرت عمرؓ کے حالات نمایاں طور پر سامنے نہ آسکیں گے۔ چنانچہ وہ یہ کہہ کر پہلو بچاتے ہیں کہ:

''یکم ہجری سے آنحضرتؐ کی وفات تک حضرت عمرؓ کے واقعات اور حالات در

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

حقیقت سیرتِ نبویؐ کے اجزاء ہیں، اگر یہ واقعات پوری تفصیل سے لکھے جائیں تو کتاب کا یہ حصّہ سیرت نبویؐ سے بدل جاتا ہے، کیونکہ حضرت عمرؓ کے کارنامے، گو کتنے ہی عظیم الشان ہوں لیکن چونکہ وہ رسواللہؐ کے سلسلۂ حالات سے وابستہ ہیں۔ اس لیے جب قلم بند کئے جائیں گے تو تمام واقعات کا عنوان رسول اللہؐ کا نام نامی قرار پائیگا۔ اس لیے ہم نے مجبوراً یہ طریقہ اختیار کیا کہ یہ واقعات نہایت اختصار سے لکھے جائیں اور جن واقعات سے حضرت عمرؓ کا خاص تعلق ہے ان کو کسی قدر تفصیل سے لکھا جائے''۔[1]

ایک اور جگہ علاّمہ شبلی کو حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے محسوس ہوئے۔ وہاں اپنا پہلو کچھ اس طرح بچاتے ہیں:-

''حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کی مدت سوا دو برس ہے۔ کیونکہ انھوں نے جمادی الثانی ۱۳ھ میں انتقال کیا۔ اس عہد میں اگرچہ جس قدر بڑے بڑے کام انجام پائے حضرت عمرؓ کی شرکت سے انجام پائے تاہم ان واقعات کو ہم الفاروق میں نہیں لکھ سکتے کیونکہ وہ عہد صدیقیؓ کے واقعات ہیں اور اس شخص کا حصّہ ہیں جس کو حضرت ابوبکرؓ کی سوانح عمری لکھنے کا شرف حاصل ہو۔''[2]

ان دونوں بیانات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شبلی حضرت عمرؓ سے تھوڑی دیر کے لیے بھی الگ نہیں ہونا چاہتے ہیں۔ لیکن ان کی شخصیت کا تاریخی پہلو انھیں بہکا کر کہیں اور لے جاتا ہے اور حضرت عمرؓ کو ایسا بھولتے ہیں کہ عرصے تک ان کی یاد بھی نہیں آتی ہے۔

سلسلۂ نامورانِ اسلام کی ابتدا جس زمانے میں ہوئی وہ ہندوستانی تاریخ کا سیاہ ترین دور ہے۔ انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ جمانے کے بعد مسلمانوں پر ایسے ظلم ڈھائے جن کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ شبلی پہلے شخص تھے جنھوں ان مظالم کے خلاف آواز بلند کی۔ شبلی نے اپنی بات کبھی دلائل و براہین کے بغیر نہیں کہی۔ یہاں شبلی نے اپنی بات ثابت کرنے کے لیے مثالیں دی ہیں۔ علاّمہ شبلی نے مسلمانوں کی انصاف پسندی اور انسانی رویوں کو نمایاں کرنے کے لیے اسلامی حکومت میں ہونے والے ان معاہدوں کو بھی

---

[1] الفاروق، صفحہ ۶۳

[2] الفاروق، صفحہ ۴۹

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

اصل صورت میں پیش کیا ہے جو مسلمانوں نے مفتوح قوموں کے ساتھ کیے تھے۔اور پھر ان کا مقابلہ ان قوانین سے کیا ہے۔ جو انگریزوں نے اپنی مفتوح قوموں پر ظلم کرنے کے لیے بنائے تھے۔ اسلامی حکومت کے معاہدوں کو پڑھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ اس قوم کے کیے ہوئے معاہدے ہیں جو فاتح ہے۔ اسکے بر خلاف ۱۸۱۸ء میں انگریزوں نے قانونِ بازیابی (LAW OF RESUMPTION) بنایا۔اس قانون کے مطابق ایسٹ انڈیا کمپنی کو یہ حق حاصل ہو گیا کہ وہ تمام زمین واپس لے سکتی ہے جو مغل بادشاہوں نے انھیں بخشیں تھیں۔اور جس پر حکومت نے کوئی ٹیکس نہیں لگایا تھا۔جس زمانے میں یہ قانون پاس ہوا۔اس وقت بنگال کے ۹۵% زمین دار مسلمان تھے،اس قانون کے نافذ ہوتے ہی صرف دس سال کے عرصے میں یہ حیثیت بالکل الٹی ہوگئی اور صرف ۵% مسلم زمین دار رہ گئے تھے۔حضرت عمرؓ کے زمانے میں مسلمانوں نے غیر قوموں سے جو معاہدے کئے تھے،ان کی اصل عبارت اس طرح ہے۔

لا یغیرون عن ملة ولا یحال بینهم وبین شعرا یعتهم یعنی ان کا مذہب نہ بدلا جائے گا اور انکے مذہبی امور میں دست اندازی نہ کی جائے گی۔[۱]

جرجان کی فتح کے بعد یہ معاہدہ لکھا گیا۔

لهم الامان علیٰ انفسهم واموالهم وملکهم یعنی ان کے جان و مال اور مذہب و شریعت کو امان ہے اور اس میں سے کسی شے میں تغیر نہ کیا جائے گا۔[۲] آذر بائجان کے معاہدے میں یہ الفاظ تھے ۔الامان علیٰ انفسهم واموالهم ومللهم ۔یعنی جان و مال مذہب اور شریعت کو امان ہے''۔[۳]

ایک طرف تو مسلمان فتح یاب ہونے کے بعد مفتوح قوم پر ظلم ڈھانے کے حق میں نہیں تھے۔ یہاں تک کہ ذمیوں کے بارے میں قانون ان ہی کی مرضی سے بنائے جاتے تھے۔اور دوسری طرف انگریزوں نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کا ذمہ دار مسلمانوں کو ٹھہراتے ہوئے ان پر بے انتہا ظلم ڈھائے ایک طرف پست ذہنی کی یہ حالت ہے اور دوسری طرف علامہ شبلی مسلمانوں کی عظمت کا بیان ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''اگر ذمیوں نے بھی شازش یا بغاوت کی تب بھی انکے ساتھ مراعات کو ملحوظ رکھا۔شام

۱۔ الفاروق،حصہ دوم،صفحہ ۱۵۵

۲۔ الفاروق،حصہ دوم،صفحہ ۱۵۵

۳۔ الفاروق،حصہ دوم،صفحہ ۱۵۵

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

کی آخری سرحد پر ایک شہر تھا جس کا نام مرداس تھا اور جس کی دوسری سرحد ایشیائے کوچک سے ملی ہوئی تھی۔ شام جب فتح ہوا تو یہ شہر بھی فتح ہوا اور صلح کا معاہدہ ہو گیا، لیکن یہاں کے لوگ در پردہ رومیوں سے سازش رکھتے تھے، عمیر بنت سعد وہاں کے حاکم نے حضرت عمرؓ کو اس کی اطلاع دی۔ حضرت عمرؓ نے ان کی کمینہ خصلت کا جو انتظام کیا وہ یہ تھا کہ عمر بن سعد کو لکھ بھیجا کہ جس قدر ان کی جائداد، زمین، مویشی اور اسباب ہیں سب شمار کر کے ایک ایک چیز کی دو چند قیمت دے دو اور ان سے کہہ دو کہ کہیں چلے جائیں، اگر اس پر راضی نہ ہوں تو ایک برس کی مہلت دو اور اس کے بعد جلاوطن کر دو۔ اس درگزر اور ہمدردانہ طرزِ عمل کا اثر یہ ہوا کہ جنگِ یرموک کے پیش آنے کے بعد جب مسلمان حمص سے رخصت ہوئے تو یہودیوں نے توریت ہاتھ میں لے کر کہا کہ ''جب تک ہم زندہ ہیں کبھی رومی یہاں نہ آنے پائیں گے [1] اور عیسائی بولے خدا کی قسم تم رومیوں کی نسبت ہمیں کہیں عزیز ہو۔[1] اپنے حکومت کے دور میں انگریز مشنریوں اور دوسری تنظیموں کی مدد سے ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ ان ہتھکنڈوں سے شبلی ناراض تھے اور اپنی ناراضگی اس طرح جتاتے ہیں۔

''اسکندریہ کی فتح کے بعد جب قبطی گرفتار ہوئے تو حضرت عمرؓ نے عمرو کو لکھ بھیجا کہ سب کو بلا کر کہہ دو کہ ان کو اختیار ہے کہ مسلمان ہو جائیں یا اپنے مذہب پر قائم رہیں۔ اسلام قبول کریں گے تو ان کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو مسلمانوں کو حاصل ہیں ورنہ جزیہ دینا ہوگا جو تمام ذمیوں سے لیا جاتا ہے۔ اس حکم پر عمروؓ نے قیدوں کو جمع کیا اور ان سے کہا کہ وہ جو مذہب اختیار کرنا چاہیں اس کا اظہار کر دیں، چنانچہ کچھ نے مسلمان ہونا پسند کیا اور کچھ نے عیسائی۔ مسلمان فاتحین بیٹھے دیکھا کئے''۔[2]

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ شبلی اپنی ہر بات دلائل کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ اس سلسلے کی بہت سی مثالیں ان کے یہاں ملتی ہیں۔ یہاں صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔ رسولؐ اللہ کی آخری بیماری کا

---

[1] الفاروق، صفحہ ۲۱۱

[2] الفاروق - علامہ شبلی نعمانی، صفحہ ۱۲۷

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

''بیماری کا بڑا مشہور واقعہ قرطاس کا واقعہ ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ آپؐ نے وفات سے تین روز پہلے قلم اور دوات طلب کیا اور فرمایا کہ میں تمہارے لیے ایسی چیز لکھوں گا کہ تم آئندہ گمراہ نہ ہو۔ اس پر حضرت عمرؓ نے لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ آنحضرت کو درد کی شدت ہے اور ہمارے لیے قرآن کافی ہے۔ حاضرین میں سے بعضوں نے کہا کہ رسولؐ اللہ بہکی باتیں کر رہے ہیں (نعوذ باللہ)۔''

کیسا حیرت انگیز واقعہ ہے۔ یہ ایک اعتراض کرنے والا ہی کہہ سکتا ہے۔ اس سے زیادہ سرکشی اور گستاخی اور کیا ہو سکتی ہے کہ رسولؐ اللہ بستر مرگ پر ہیں اور امت کی ہدایت کے واسطے فرماتے ہیں کہ قلم دوات لاؤ کہ میں تمھارے لیے ایک ہدایت نامہ لکھ دوں جو تم کو گمراہی سے بچائے رکھے۔ ظاہر ہے یہ ہدایت نامہ امت کو گمراہی سے محفوظ رکھنے کے لیے ہے اور یہ منصب نبوت کے لحاظ سے ہے اس لیے اس میں کسی سہو وخطا کا اندیشہ نہیں ہو سکتا ہے۔ اس کے باجود حضرت عمرؓ لاپرواہی کا اظہار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے لیے قرآن کافی ہے۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ بعض روایتوں میں یہاں تک ہے کہ حضرت عمرؓ رسولؐ اللہ کے اس ارشاد کو ہذیان بتاتے ہیں۔ (نعوذ باللہ)

ایک مدت سے یہ اعتراض چلا آرہا ہے اور مسلمانوں کے دو مختلف گروہ بن گئے ہیں جنھوں نے اس پر زبردست زور آزمائی کی ہے۔ لیکن اس میں کچھ غیر متعلق باتیں بھی شامل ہو گئی ہیں۔ اور اصول درایت کا استعمال کرنے کا کسی کو خیال نہیں آیا جس کی وجہ سے اصل مسئلہ تو حل ہو نہیں پایا بلکہ اس کے برخلاف غیر ضروری بحثیں شروع ہو گئیں۔ یہاں تک کہ لوگ اس بارے میں سوچنے لگے کہ ہذیان کسی پیغمبر کو ہونا ممکن ہے یا نہیں، کیونکہ ہذیاں انسانی مرض ہے اور آنحضرتؐ انسانی عوارض سے محفوظ نہیں تھے۔ جس طرح یہ واقعہ روایتوں میں منقول ہے اس سے کسی امر پر استناد ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اس بحث کے لیے ان واقعات کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔

۱۔ آنحضرتؐ کم وبیش ۱۳ دن بیمار رہے۔

۲۔ کاغذ طلب کرنے کا واقعہ جمعرات کے دن کا ہے جیسا کہ صحیح بخاری وصحیح مسلم میں بتصریح مذکور ہے اور چونکہ آنحضرتؐ نے دوشنبہ کے دن انتقال فرمایا، اس لیے اس واقعہ کے بعد آنحضرت چار دن تک زندہ رہے۔

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

۳۔اس تمام مدتِ بیماری میں آنحضرتؐ کی نسبت اوکوئی واقعہ اختلال حواس کا کسی روایت میں کہیں مذکور نہیں۔

۴۔اس واقعے کے وقت کثرت سے صحابہؓ موجود تھے،لیکن یہ حدیث باوجود اس کے کہ بہت سے طریقوں سے مروی ہے (چنانچہ صحیح بخاری میں سات طریقوں سے مذکور ہے) بایں ہمہ بجز عبداللہ بن عباس کے اور کسی صحابی سے اس واقعے کے متعلق ایک کے حرف بھی منقول نہیں۔

۵۔عبداللہ بن عباس کی عمر اس وقت صرف تیرہ چودہ برس کی تھی۔

۶۔سب سے بڑھ کر یہ کہ جس وقت کا یہ واقعہ ہے اس موقع پر عبداللہ بن عباسؓ موجود نہ تھے اور یہ معلوم نہیں کہ یہ واقعہ انھوں نے کس سے سنا۔

۷۔تمام روایتوں میں مذکور ہے کہ جب آنحضرتؐ نے قلم کاغذ مانگا تو لوگوں نے کہا کہ رسول اللہؐ بہکی ہوئی باتیں کررہے ہیں (نعوذ باللہ)۔

ان سب باتوں سے پہلے یہ امر غور طلب ہے کہ کوئی اور قرینہ یا واقعہ آنحضرتؐ کے اختلالِ حواس کا کہیں کسی بھی روایت میں موجود نہیں ہے۔صرف قلم دوات مانگنے سے یہ کیسے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آنحضرتؐ کو ہذیان ہوگیا ہے (نعوذ باللہ) اگر اس روایت کو صحیح مان بھی لیا جائے تب بھی یہ بات تسلیم کرنی ہوگی کہ راوی نے روایت میں بہت سے واقعات چھوڑ دیے ہیں جن سے لوگوں کے دل میں یہ خیال آیا کہ آنحضرتؐ پوری طرح ہوش میں نہیں ہیں اور اسی بے ہوشی کی حالت میں کاغذ قلم مانگ رہے ہیں (نعوذ باللہ)۔ اب خود ہی اندازہ لگا لیجیے کہ جب پورا واقعہ ہی بیان نہیں کیا گیا ہے تو اس پر استدلال کس طرح کیا جاسکتا ہے اور دوسرے یہ کہ بات بھی غور طلب ہے کہ اتنے بڑے واقعے کے وقت صرف عبداللہ بن عباسؓ موجود ہیں یا راوی ہیں اور انکی عمر اس وقت صرف تیرہ چودہ برس ہے۔اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ وہ اس واقعہ کے وقت وہاں تھے ہی نہیں۔اب ہر شخص خود ہی اندازہ لگا سکتا ہے کہ اس روایت میں کہاں تک سچائی ہے۔[1]

شبلی حق پسند ہیں اور اس کو تاریخ کا اہم ترین اصول قرار دیتے ہیں ان کے کسی ہیرو پر جب کوئی الزام لگایا جاتا ہے، تو وہ ہر الزام کا جواب نہیں دیتے ہیں۔لیکن جب دیکھتے ہیں کہ کسی پر جھوٹا الزام لگایا جارہا ہے تو اس الزام کی مدلل تردید کرتے ہیں۔اپنے ہیرو کی کمزوری کو بھی آسانی سے قبول کر لیتے ہیں۔

---

[1] الفاروق، صفحہ ۴۲ تا ۴۴

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

مثلاً جب حضرت عمرؓ پر یہ الزام لگایا گیا کہ انھوں نے حضرت فاطمہؓ کو ان کے گھر میں آگ لگانے کی دھمکی دی تھی تو شبلی نے بنا کسی تاویل کے اس بات مان لیا تھا۔ درایت کے اصول کے مطابق اس واقعہ کو تسلیم کرنے میں کوئی شک نہیں کیونکہ حضرت عمرؓ کے مزاج کے پیش نظر ان سے اس کی امید کی جاسکتی ہے۔[1]

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے شبلی محض لڑائیوں کے حالات اور جنگ وجدل کے ذکر کو تاریخ نہیں سمجھتے۔ شبلی تاریخ کو تمدّن وتہذیب کی تصویر کشی بھی تصوّر کرتے ہیں بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:-

''اس کتاب میں شبلی نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ صحیح تاریخ صرف جنگوں اور لڑائیوں کا نام نہیں بلکہ اصل تاریخ تہذیبِ انسانی کا دوسرا نام ہے۔''[2]

شبلی کی شخصیت کے بہت سے پہلو ہیں۔ ان میں ایک پہلو میں وہ شاعر بھی ہیں۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مورخ شبلی میں شاعر شبلی کی روح سرایت کر جاتی ہے اور ایسے میں مورخ شبلی بہک جاتا ہے اور ایسے واقعات کو قلم بند کر دیتا ہے جو تاریخ نویسی کے شایانِ شان نہیں ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:-

''دونوں باپ بیٹے فوج میں گھسے اور اس دلیری سے جنگ کی کہ مسلمانوں کے اکھڑے ہوئے پاؤں پھر سنبھل گئے''۔[3]

ہماری عقل اس بات کو آسانی سے تسلیم نہیں کرتی ہے کہ دو آدمی جنگ کا نقشہ بدل سکتے ہیں۔ یہاں شاعر شبلی کی کارفرمائی نظر آتی ہے، لیکن ایسے بھی بہت سے موقعے آئے ہیں کہ جہاں شبلی اپنی شاعرانہ خواہش پوری کر سکتے تھے، مگر وہ خود پر قابو رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر حضرت عمرؓ کے اسلام قبول کرنے کا واقعہ ایسا ہے کہ یہاں شبلی اپنے شاعرانہ مذاق کی بآسانی تسکین کر سکتے تھے۔

علامہ شبلی نے ''الفاروق'' میں تاریخ نویسی کی تمام تر خوبیوں کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ خود علامہ شبلی نعمانی اسے اپنی بہترین تصنیف قرار دیتے ہیں۔ وہ اسے اپنی غزل مرصّع سمجھتے تھے۔

---

[1] الفاروق، صفحہ ۴۸

[2] سرسید اور ان کے رفقاء- ڈاکٹر سید عبداللہ، صفحہ ۵۷-۱۵۶

[3] الفاروق، صفحہ ۹۵

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

المامون

علاّمہ شبلی نے رائل ہیرسز آف اسلام (یعنی نامور فرمانروایان اسلام) کا جو سلسلہ شروع کیا تھا۔ اس سلسلے کی پہلی کڑی المامون ہے۔ یہ شبلی کے علی گڑھ کے زمانۂ قیام میں ۱۸۸۹ء میں شائع ہوئی۔ اس تصنیف میں کہیں کہیں سرسید احمد خاں کی شخصیت کے اثرات نظر آتے ہیں۔

المامون بھی شبلی کی دوسری سوانحی تصانیف کی طرح محض ایک شخص یا فرد کی داستانِ حیات نہیں ہے، بلکہ خلیفہ مامون الرشید کے حکومت کے عہد کی مکمل تاریخ ہے۔ شبلی کو مامون الرشید سے کتنی محبت اور مناسبت تھی اس کا اندازہ ان الفاظ سے لگایا جا سکتا ہے۔

> ''اسلام کو آج تیرہ سو برس سے کچھ اوپر ہوئے، اس وسیع مدّت میں ایک تخت نشیں بھی ایسا نہیں گذرا جو فضل وکمال کے اعتبار سے مامون کی شانِ یکتائی کا حریف ہو سکتا۔ افسوس ہے کہ سلطنت کے انتساب سے اس کو خلفاء سلاطین کے پہلو میں جگہ دی ورنہ شاعری، ایام العرب ادب، فقہ، فلسفہ کونسی بزم ہے جہاں فخر وشرف کے ساتھ اس کا استقبال کیا جاتا''۔ [1]

شبلی کی دوسری تصانیف کی طرح اس کے بھی دو حصّے ہیں۔ پہلے حصّے میں تاریخی واقعات قلم بند کئے ہیں اور بہت ہی دل کش پیرائے میں اور اختصار کے ساتھ یہ دکھایا ہے کہ خلافت کا سلسلہ کس طرح خاندان بنی امیّہ سے خاندانِ عباسیّہ تک پہنچا۔ کس طرح امین کا قتل ہوا اور اس کا بھائی مامون بادشاہ بنا۔ جگہ جگہ مختلف واقعات سے اس حصّے کو دلچسپ بنایا گیا ہے۔

دوسرے حصّے میں سلطنت کے انتظامات، فوجی انتظام، عدالت اور آمدنی مملکت کو خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے اور مامون کی سماجی اور نجی زندگی، اس کی مجلسیں، اس کی شان وشوکت، اس کا جلال، اس کے علاوہ لطائف وظرائف کے ساتھ علمی پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔

---

[1] المامون- علامہ شبلی نعمانی صفحہ ۱۲۵

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

شبلی کی مامون سے محبت کا اندازہ اس بات سے بھی چلتا ہے کہ انھوں نے خلافتِ عباسیہ کا ہیرو ہارون کے بجائے مامون کو قرار دیا۔ لیکن اس کے باوجود شبلی مامون کی بیجا تعریف نہیں کرتے ہیں۔ کہیں کہیں ایسا بھی ہوا ہے کہ وہ لکھتے لکھتے صاحبِ سوانح کو بھول گئے ہیں۔ خصوصاً امین کا جہاں ذکر آتا ہے وہاں ایسا لگتا ہے کہ مامون کی نہیں امین کی سوانح لکھ رہے ہوں۔ امین کے قتل کا بیان انھوں نے بہت تفصیل سے کیا ہے۔

شبلی تاریخ نویسی کے لئے غیر جانبداری کے قائل ہیں۔ اس کی ایک مثال حسبِ ذیل ہے۔

''امین نے اپنے نمک خوار غلام احمد بن سلام سے پوچھا'' ''مامون کا کچھ حال معلوم ہے؟'' اس نے کہا ''زندہ ہے'' امین کہنے لگا! خدا پرچہ نویسوں کا برا کرے، کم بختوں نے خبر دی تھی کہ مر گیا''۔ [1]

دوسری جانب جب مامون کی خدمت میں امین کا کٹا ہوا سر پیش کیا جاتا ہے تو بقول شبلی:-

''اس نے اپنے بھائی کے خون آلود سر کو مسرت کی نگاہ سے دیکھا اور جوشِ خوشی میں سجدۂ شکر ادا کیا''۔ [2]

اس واقعہ کو پڑھنے کے بعد امین کی عظمت دل میں بڑھ جاتی ہے اور مامون، امین کے سامنے ہیچ لگنے لگتا ہے۔ اگر کوئی اور مورخ ہوتا تو جانبدارانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے واقعہ کو اس طرح پیش کرتا کہ مامون کی عظمت ہمارے دل میں اور بڑھ جاتی، لیکن شبلی سے اس جانبداری کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ شبلی نے کبھی بھی سچائی کا دامن نہیں چھوڑا۔

شبلی کی تاریخ نویسی کی ایک اہم صفت یہ بھی ہے کہ وہ کبھی عبارت میں بے کیفی اور بے مزگی پیدا نہیں ہونے دیتے ہیں۔ وقتاً فوقتاً دلچسپ قصے سناتے رہتے ہیں، لیکن مضمون کے تسلسل میں کسی طرح کی کمی نہیں آتی ہے۔ یہ واقعات خیالی نہیں ہوتے ہیں بلکہ حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں۔ خیالی واقعات کو بیان کرنے کے لیے پیرایہ بیان بھی تخئیلی ہوگا، جس سے تاریخ نویسی کے فن کو نقصان پہنچتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک واقعہ پیش کیا جاتا ہے:

''ایک دن علماء کا مجمع تھا، ہر فن کے اہل کمال دربار میں حاضر تھے، ایک عورت فریادی آئی

---

[1] المامون- علامہ شبلی نعمانی صفحہ ۴۵

[2] المامون- علامہ شبلی نعمانی صفحہ ۴۶

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

کہ میرا بھائی چھ سو اشرفیاں چھوڑ کر قضا کر گیا مگر لوگوں نے ترکہ میں مجھ کو ایک اشرفی دلوائی۔ مامون نے ذرا دیر دل ہی میں کچھ حساب لگایا، دیکھا تو سہام صحیح تھے، عورت سے کہا: ''ہاں تجھ کو اتنا ہی ملنا چاہیے۔'' اس غیر متوقع جواب پر سب کو حیرت ہوئی۔ علماء نے پوچھا: امیر المؤمنین کیوں کر۔ مامون نے کہا: ''متوفی کے دو بیٹیاں ہوں گی، دو ثلث یعنی چار سو اشرفیاں تو ان کو ملیں، ماں بھی ہوگی جس کو سدس یعنی سو ۱۰۰ اشرفیاں پہنچیں زوجہ کو ثمن یعنی پچھتر ملا ہوگا۔ ۲۵ باقی رہے۔ مامون نے عورت کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔: سچ کہنا تیرے بارہ بھائی ہیں؟ عورت نے تسلیم کیا کہ ''ہاں'' مامون نے کہا: ''دو دو ان کو ملیں، ۲۴ ہوئیں، ایک باقی رہی وہ تیرا حق ہے''۔ [1]

شبلی کے نزدیک تاریخ اور تحقیق کی حیثیت لازم اور ملزوم کی ہے۔ شبلی کا ماننا ہے کہ تحقیق کے بغیر تاریخ کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے تحقیق کے لیے ہمیشہ دو اصول اختیار کیے ہیں۔

۱۔ روایت ۲۔ درایت

یہی دو اصول سچ اور جھوٹ کو الگ کرتے ہیں۔ المامون میں بھی انھوں نے ان ہی دو اصولوں کو اختیار کیا ہے وہ اس بات کی پوری کوشش کرتے ہیں کہ جو بھی واقعہ بیان کیا جائے وہ اسی شخص کی زبانی ہو جو اس واقعہ کا عینی شاہد ہے یا جو واقعہ بیان کیا جا رہا ہے اس کا اس واقعہ سے قریبی تعلق ہو۔ المامون کے لکھنے میں بھی ان کی یہی کوشش رہی ہے۔ امین کے قتل کے واقعہ کو انھوں نے امین کے غلام احمد بن سلام کی زبانی بیان کیا ہے۔ احمد بن سلام واقعہ کے وقت خود موجود تھا۔

ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے شبلی لکھتے ہیں:-

''ایک جگہ عبداللہ بن طاہر کے حوالے سے یہ بیان نقل کرتے ہیں کہ ایک دن وہ مامون کی خدمت میں حاضر تھے، مامون نے غلام کو آواز دی مگر صدائے برنخاست، پھر پکارا تو ایک ترکی غلام حاضر ہوا اور آتے ہی بڑبڑانے لگا کیا غلام کھاتے پیتے نہیں، جب ذرا کسی کام کے لیے باہر گئے تو آپ ''یا غلام'' چلانے لگتے ہیں۔ آخر ''یا غلام'' کی کوئی حد بھی ہے۔ یہ سن کر مامون نے سر جھکا لیا اور دیر تک سر بگریباں رہا۔ عبداللہ بن طاہر کا

---

[1] المامون- علامہ شبلی نعمانی صفحہ ۱۳۶

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

خیال تھا کہ جواب سن کر مامون غلام کی خوب خبر لے گا۔ مگر مامون ان کی امید کے خلاف اس سے مخاطب ہو کر کہنے لگا! ''نیک مزاجی میں یہ بڑی آفت ہے کہ نوکر اور غلام شریر اور بدخو ہو جاتے ہیں مگر یہ تو نہیں ہو سکتا کہ ان کے نیک خو کرنے کے لیے میں بدمزاج بنوں''۔[1]

سلسلۂ نامورانِ اسلام کی تصنیف کا ایک اہم مقصد یہ تھا کہ یورپین اور دوسرے مورخین نے جو غلط فہمیاں پھیلائی ہیں، ان کو دور کیا جائے۔ المامون میں اس سلسلے کی صرف ایک مثال ملتی ہے۔ پامر نے اپنی کتاب ''ہارون رشید'' میں ایک جگہ یہ لکھا ہے:

''ہارون رشید کے بیہودہ درباریوں نے یہ بات اس کے ذہن نشیں کر دی تھی بلکہ کل پیرو اسلام اس وقت اور کچھ مسلمان اب بھی سمجھتے ہیں کہ کافر خدا کی مخلوق ہی نہیں کہلا سکتا۔''[2]

شبلی نے اس بات کو بالکل غلط بتایا ہے اور اس کو اس طرح ثابت کیا ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو مسلمان اپنے دورِ حکومت میں مندروں، گرجوں اور دوسرے غیر مذہبی مقامات کی حفاظت کے معاہدے کیوں لکھتے اور عمر بن عبدالعزیز جنھوں نے ولید کے گرائے ہوئے ایک گرجے کو مسجد کا ایک حصّہ ڈھا کر دوبارہ تعمیر کرنے کی اجازت دی تھی، کو ہم عمر ثانی کیوں کہتے ہیں۔ آگے لکھتے ہیں:

''خاص دولت عباسیہ کے عہد میں دارالخلافہ بغداد میں سینکڑوں، ہزاروں گرجے تعمیر ہوئے جہاں نہایت آزادی سے ہر قسم کی مذہبی رسوم ادا کی جا سکتی تھیں۔ بقول ان کے تاریخ کے ہر صفحے میں مسلمانوں کی بے تعصبی کی شہادت ملے گی، کیا ان سب باتوں کو دیکھ کر پامر کے لگائے ہوئے الزام کو درست قرار دیا جا سکتا ہے۔''[3]

مامون کی محفلیں گو عیاشانہ ہوا کرتی تھیں، لیکن اس عیش وطرب کے باوجود ایسا نہیں ہے کہ یہ علمی مذاق سے بالکل عاری ہوتی تھیں۔ اس طرح کی محفلیں شاعرانہ جذبات کو ابھارنے میں بہت کارگر ہوتی ہیں۔ اگر ان میں تہذیب اور متانت کا لحاظ رکھا جائے تو یہ ادب پر نہایت عمدہ اور وسیع اثر ڈال سکتی ہیں۔ مامون خود موسیقی اور شاعری میں بڑی مہارت رکھتا تھا۔ حاضرین محفل پر شاعرانہ لطیفے ایجاد کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔

---

[1] المامون- علامہ شبلی نعمانی صفحہ ۱۴۹

[2] المامون- علامہ شبلی نعمانی صفحہ ۱۲۴-۱۲۵

[3] داستان تاریخ اردو- حامد حسن قادری زور صفحہ ۸۱۲

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

کسی وقت مامون فی البدیہہ مصرعوں یا شعروں پر شعراء کی طبع آزمائیوں کا امتحان لیتا تھا۔ کبھی موسیقی کی بحثیں چھڑ جاتی تھیں۔

جس زمانے میں علاّمہ شبلی نعمانی ''المامون'' لکھ رہے تھے۔ اس وقت ان پر سرسید احمد خاں کا نیا نیا اثر تھا۔ اس لیے علاّمہ نے ''المامون'' میں جابجا انگریزی الفاظ کا بھی استعمال کیا ہے۔ لیکن اس کی نازیبائی کو علاّمہ نے شروع میں ہی سمجھ لیا اور بعد کی تصانیف اور مضامین میں بلاضرورت انگریزی الفاظ کا استعمال ترک کر دیا۔ المامون سے اس کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

۱۔ ''یہی ایک چیز ہے جو قومی فیلنگ اور قومی خوشی کو زندہ رکھ سکتی ہے''۔[۱]

۲۔ ''مامون کی فیاض لائف پر جو کچھ نکتہ چینی ہو سکتی ہے''۔[۲]

۳۔ ''تاہم مامون نے وہی کیا جو سچے کالشنس کی رو سے اس کو کرنا چاہیے تھا''۔[۳]

حالانکہ مولانا حالؔی کی ''حیات سعدی'' اس سے پہلے شائع ہو چکی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تاریخ تحقیق اور سیرت کی ترتیب کی خوبی کے اعتبار سے اردو کی پہلی تصنیف شمار کی جاتی ہے، لیکن شبلی کی ''المامون'' کی قدر و قیمت تحقیق و ترتیب دونوں اعتبار سے کچھ کم نہیں ہے۔ سرسید ''المامون'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ''اس قدر جزئیات کو تلاش کرنا اور نظم اسلوب سے ایک جگہ جمع کرنا کچھ آسان کام نہ تھا۔ اس کے حاشیوں پر جس قدر کتابوں کے حوالے ہیں ان کو دیکھ کر اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس کتاب کے لکھنے میں کس قدر جانکاہی ہوئی ہوگی اور مصنف کو کتنے ہزاروں ورق تاریخوں کے الٹنے پڑے ہوں گے اور اس کے ساتھ جب یہ خیال کیا جائے کہ مصنف نے ان جزئیات کو ایسی کتابوں سے تلاش کر کے نکالا ہے جن کی نسبت خیال بھی نہ ہوتا تھا کہ ان میں مامون کے حالات ہوں گے تو اس محنت کی وقعت و قدر اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔''[۴]

---

۱ دیباچہ مصنف

۲ المامون صفحہ ۱۱۳

۳ المامون صفحہ ۱۱۷

۴ داستان تاریخ اردو۔ حامد حسن قادری زور صفحہ ۶۴۸

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

یہ کام حقیقتاً بہت دشوار ہے، لیکن علاّمہ شبلی نے اپنے دقّتِ نظر اور ذوقِ صحیح سے اور اس سے بھی بڑھ کر اپنے علم و فضل اور مطالعہ کی وسعت سے اس خوبی سے انجام دیا کہ اردو ادب میں اس کی دوسری مثال نہیں ملتی ہے۔

المامون کا طرزِ بیان، زور اور صفائی مضمون کے لحاظ سے نہایت عمدہ ہے۔ الفاظ و مضمون کا باہمی تناسب جسے ہم بلاغت کا نام دے سکتے ہیں، ایسا ہے کہ اسلوب میں ایک نیا پن پیدا ہو گیا ہے۔ اس وصف کی بنا پر علاّمہ شبلی کو اردو کا صفِ اوّل کا انشا پرداز شمار کیا جاتا ہے۔ المامون کے دیباچے میں سر سید احمد خاں نے اس کے اسلوب کے بارے میں یہ رائے دی ہے:

''اردو زبان نے بہت کچھ ترقی کی ہے، مگر اس بات کا بہت کم لحاظ رکھا گیا ہے کہ ہر فن کے لیے زبان کا طرز بیان جداگانہ ہے۔ تاریخ کی کتابوں میں ناول اور ناول میں تاریخانہ طرز کو کیسی ہی فصاحت و بلاغت سے برتا گیا ہو، دونوں کو برباد کرتا ہے۔

ہمارے لائق مصنف نے اس کا بہت کچھ خیال رکھا ہے اور باوجود تاریخانہ مضمون ہونے کے ایسی خوبی سے اس کو ادا کیا ہے کہ عبارت بھی فصیح اور دلچسپ ہے اور تاریخانہ اصلیت بدستور اپنی اصل صورت میں موجود ہے۔ جو خوبصورت ہے خوبصورت ہے۔ جو بھونڈی ہے بھونڈی ہے۔ نہ خوبصورتی کو زیادہ خوبصورت بنایا ہے اور نہ بھونڈی کو زیادہ بھونڈا اور درحقیقت یہی کمال تاریخ نویسی کا ہے'' [1] (سید احمد سکریٹری مدرسۃ العلوم)

المامون کے اسلوب کے بارے میں سر سید کی رائے کافی حد تک درست ہے، لیکن علاّمہ شبلی کی دوسری تصانیف مثلاً الفاروق، موازنہ انیس و دبیر، شعر العجم اور سیرۃ النبیؐ کے مقابلے میں ''المامون'' کے زبان و بیان میں ناپختگی ہے۔

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

ح-الغزالی

شبلی نے الغزالی دسمبر ۱۹۰۱ء میں بمقام حیدرآباد لکھ کر ختم کی اور سلسلۂ آصفیہ میں چھپی۔ الغزالی، امام محمد بن غزالی کی سوانح عمری ہے جس کے پہلے حصے میں امام غزالی کی ولادت، سن رشد، تحصیلِ علم، دربار کا تعلق، نظامیہ کی تدریس، ترک تعلقات، سفر عزلت نشینی، حاسدوں کی مخالفت اور وفات کے حالات درج ہیں۔ دوسرے حصہ میں ان کی تصنیفات کی تفصیل اور ان پر تبصرہ اور تنقید ہے جس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ امام صاحب نے علم کلام، علم تصوّف اور علمِ اخلاق کو کس حد تک ترقی دی۔ اس کے ساتھ اُن کوششوں کا بھی ذکر ہے جو امام صاحب نے مسلمانوں کی ملکی، علمی، عملی اور اخلاقی حالت کے درست کرنے میں کیں اور جس کی وجہ سے وہ اپنے زمانے کے مصلح اور مجدّد کہلائے۔

علاّمہ شبلی نعمانی الغزالی کی وجہ تصنیف اس طرح بیان کرتے ہیں:-

''علم کلام جو مسلمانوں کی خاص ایجادات میں سے ایک مہتم بالشان علم اور ان کا سرمایۂ ناز ہے۔ میں آجکل اس کی نہایت مبسوط تاریخ لکھ رہا ہوں اور اس کے چار حصے قرار دیے ہیں۔

۱۔ علم کلام کی ابتدا۔ اس کی مختلف شاخیں عہد بعہد کی تبدیلیاں اور ترقیاں۔

۲۔ علمِ کلام نے اثباتِ عقائد اور ابطال فلسفہ کے متعلق کیا کیا؟ اور کس حد تک کامیابی حاصل کی؟

۳۔ آئمہ علم کلام کی سوانح عمریاں

۴۔ جدید علم کلام

''پہلا حصہ بڑی حد تک لکھا جا چکا تھا کہ بوجوہ رُک گیا، اور تیسرا حصہ شروع ہوگیا۔ اس حصے میں امام غزالی کی سوانح عمری شروع ہوئی تو بڑھتے بڑھتے ایک مستقل کتاب بن گئی۔ چونکہ پوری کتاب کی تیاری کو ایک عرصہ درکار تھا۔ مناسب معلوم ہوا کہ بلا انتظار

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

باقی حصہ الگ شائع کر دیا جائے۔ امام صاحب کے حالات میں ان کے اصول عقائد اور طرز استدلال کی تفصیل بھی ہے، اس طرح علم کلام کے اکثر مہتم بالشان مسائل بھی اس کتاب میں آ گئے ہیں''[1]

غالباً امام غزالی کی سوانح پر کوئی مستقل کتاب نہیں ہے۔ عموماً رجال تراجم کی جن تصانیف میں امام صاحب کے حالات کسی قدر تفصیل کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ ان میں تبیین کذب المفتری فیما نسب الی ابی الحسن الاشعری اور طبقات الشافعیہ کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ پہلی تصنیف علامہ ابن عساکر دمشقی کی ہے، جو مشہور محدث ہیں۔ حالانکہ یہ کتاب امام اشعری کے حالات پر ہے، لیکن اشاعرہ میں جو لوگ مشاہیر تھے، ان کا بھی تذکرہ اس میں کیا گیا ہے۔ اس بنا پر امام غزالی کے حالات بھی اس میں مذکور ہیں امام غزالی کے حالات عبد الغافر فارسی کے حوالے سے لکھ گئے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ عبد الغافر فارسی، امام غزالی کے ہمعصر ہیں۔ اس لیے اس کا ہر ایک حرف سند کے قابل ہے۔ یہ تصنیف یورپ میں چھپ چکی ہے۔ دوسری تصنیف علامہ ابن السبکی کی ہے جو مشہور محدث تھے۔ یہ کتاب اتنی جامع ہے کہ رجال کی کوئی بھی کتاب مجموعی حیثیت سے اس کی برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتی ہے۔ امام غزالی کے حالات جس تفصیل سے اس کتاب میں بیان کئے گئے ہیں، کسی اور کتاب میں نہیں ملتے ہیں۔ علامہ شبلی کہتے ہیں کہ سوانح عمری لکھنے میں انھوں نے سب سے زیادہ اسی کتاب کا سہارا لیا ہے۔ اس کے علاوہ امام صاحب کے اصول اور مسائل کے لیے خود امام صاحب کی تصانیف موجود ہیں۔ جو کثرت سے علامہ شبلی کے پاس موجود تھیں۔ امام صاحب کے رتبے کا اندازہ اسی بات سے ہو سکتا ہے کہ ان کی تصانیف یورپ میں بھی بہت مشہور ہوئیں۔ بہت سے مشہور یورپین مصنفین نے ان کی تصانیف پر شروح وحواشی بھی لکھے ہیں۔ فلسفہ کی جو تاریخیں تصنیف ہوئیں ہیں، ان میں امام غزالی کا خاص طور سے ذکر کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ کچھ کتابیں صرف امام غزالی کی تصنیفات کے متعلق ہی لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے جو کتابیں علامہ شبلی کے پاس تھیں۔ پہلی کتاب۔ پروفیسر گوشی (R GOSCHE) کی الغزالی (AL-GAZALI) ان میں سے ایک جرمن زبان میں تھی جس سے علامہ شبلی استفادہ نہیں کر پائے۔ البتہ دوسری کتاب پروفیسر مونک (S.MUNK) کی الربط بین فلسفۃ الیہود والاسلام (melangesde philosophie juvie et arape) سے انھوں نے بہت فایدہ اٹھایا اور موقع

---

[1] الغزالی۔ شبلی، صفحہ ۲

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

موقع سے اس کے حوالے بھی درج کئے ہیں۔

امام غزالی کا نام محمد تھا۔ حجۃ الاسلام لقب، غزالی عرف، سلسلۂ نسب یہ ہے۔ محمد بن محمد بن احمد۔ خراسان کے اضلاع میں ایک ضلع کا نام طوس ہے۔ اس میں دو شہر طاہران اور تو قان نام کے ہیں۔ امام صاحب کی پیدائش ۴۵۰ھ میں طاہران میں ہوئی۔ ان کے والد کا پیشہ رشتہ فروشی تھا۔ اسی مناسبت سے ان کے خاندان کو غزالی کہتے تھے۔ غزالی کے معنی کے تنے کے ہوتے ہیں۔ عربی زبان میں نسبت کا جو قاعدہ ہے اس لحاظ سے غزال ہونا چاہیے تھا، لیکن خوارزم اور جرجان وغیرہ میں نسبت کا یہی طریقہ تھا۔ چنانچہ قصار کو قصاری اور عطار کو عطاری کہتے ہیں۔

امام غزالی کی ۷۸ تصنیفات کے اور ان موضوع اور عظمت بیان کرنے کے بعد علامہ شبلی لکھتے ہیں:-

''امام صاحب نے یوں تو بہت سے علوم وفنون میں کتابیں لکھیں، لیکن تخصیص کے ساتھ جن علوم کو ترقی دی، وہ فقہ، اصول فقہ، کلام اور اخلاق ہیں۔ اس لحاظ سے اگر چہ ہمارا فرض تھا کہ ہم امام صاحب کی ان ایجادات اور استنباطات کو بہ تفصیل لکھتے جو ان علوم میں ان سے یادگار ہیں، لیکن ہمارے ناظرین کو شافعی فقہ اور اصولِ فقہ سے دلچسپی نہیں ہوسکتی۔ اس لیے ہم امام صاحب کے ان علمی کارناموں کے بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جو علم کلام اور علم اخلاق کے متعلق ان سے ظہور میں آئے۔ ملک کا مذاق اور ملک کی حالت بھی اسی کی مقتضی ہے کہ فلسفہ آمیز علوم کے مسائل قوم کے سامنے پیش کئے جائیں''۔[1]

اس لیے دوسرے حصہ سے کلام اور اخلاق کے متعلق دو اقتباسات اخذ کئے جاتے ہیں:-

(الف) احیاء العلوم کو جن خصوصیتوں نے تمام قدیم وجدید تصنیفات سے ممتاز کر دیا ہے۔ ہم ان کو بترتیب لکھتے ہیں۔

(۱) بڑی خصوصیت جس نے عام وخاص، عارف وجاہل، سب میں اسے مقبول بنا دیا ہے۔ یہ ہے حکمت وموعظت دونوں کو ساتھ ساتھ نباہا ہے۔ تحریر وتقریر یا سب سے مشکل پہلو وہاں پیدا ہوتا ہے، جہاں مختلف طبیعتوں کے آدمیوں سے خطاب کرنا پڑتا ہے۔ واعظ اپنی جادو بیانی سے ایک جمِ غفیر کو وجد میں لاسکتا ہے۔ لیکن حکیمانہ طبیعت کا آدمی اس سے

---

[1] الغزالی۔ شبلی نعمانی، صفحہ ۵

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

متاثر نہیں ہوسکتا۔ برخلاف اس کے ایک حکیم جب معارف وحقائق پر تقریر کرتا ہے تو عوام پر اس کا جادو نہیں چلتا۔ احیاء العلوم میں یہ خاص کرامت ہے کہ جس مضمون کو ادا کیا ہے، باوجود سہل پسندی، عام فہمی اور دلآویزی کے فلسفہ اور حکمت کے معیار سے کہیں اترنے نہیں پایا یہی بات ہے کہ امام رازی سے لے کر ہمارے زمانے کے سطحی واعظ تک اس سے یکساں لطف اٹھاتے ہیں۔

(۲) امام صاحب کے زمانے تک یہ دستور تھا کہ فلسفہ اور متعلقات فلسفہ پر جس قدر کتابیں لکھی جاتی تھیں۔ عموماً پیچیدہ اور دقیق عبارت میں لکھی جاتی تھیں اور بوعلی سینا نے تو فلسفہ کو گویا طلسم بنا دیا تھا اس کی وجہ کچھ تو یہ تھی کہ فلسفہ کے مسائل خود دقیق ہوتے تھے کچھ یہ کہ یونانیوں کے زمانے سے یہ خیال چلا آتا تھا کہ فلسفہ کو عام فہم نہ کرنا چاہیے، کچھ یہ کہ اکثر لوگ یہ قابلیت ہی نہ رکھتے تھے کہ پیچیدہ مطالب کو آسان عبارت میں ادا کرسکیں۔ فلسفہ کے اور اقسام کی بہ نسبت فلسفۂ اخلاق آسان اور سریع الفہم ہے۔ تاہم اخلاق پر جو بھی کتابیں لکھی گئیں تھیں۔ مثلاً کتاب الطہارت (ابن مسکویہ) اشکال سے خالی نہ تھیں۔ امام صاحب پہلے شخص ہیں جنھوں نے فلسفۂ اخلاق کا مسائل اس طرح ادا کئے کہ دقیق سے دقیق نکتے افسانہ اور لطائف بن گئے۔ ایک ہی مضمون کو کتاب الطہارت اور احیاء العلوم دونوں میں دیکھو، کتاب اطہارت میں غور وفکر اور خوض سے کام لینا پڑے گا اور باوجود اس کے زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ کتاب کا مطلب تمھاری سمجھ میں آجائے۔ احیاء العلوم میں یہ معلوم بھی نہ ہوگا کہ تم کوئی علمی کتاب پڑھ رہے ہو تم قصہ کی طرح پڑتے چلے جاؤ گے اور مضمون کی نسبت صرف یہی نہیں ہوگا کہ تم اس کو سمجھ جاؤ گے بلکہ دل پر اس کی کیفیت طاری ہوگی اور تم سراپا اثر میں ڈوب جاؤ گے۔[1]

(ب) امام صاحب کا خاص علم کلام (الٰہیات)

خدا کے اثبات پر امام صاحب نے کوئی نئی دلیل نہیں قائم کی۔ ان کے نزدیک یہ مسئلہ نہایت واضح وصاف ہے۔ متکلمین جو استدلال کرتے آتے تھے کہ عالم حادث ہے اور

---

[1] الغزالی - علامہ شبلی نعمانی، صفحہ ۶۸

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

حادث خود بخود پیدا نہیں ہوسکتا اس لیے اس کی کچھ علت ہوگی اور وہی خدا ہے۔ امام صاحب اسی استدلال کو کافی سمجھتے ہیں۔

صفات باری تنزیہ تشبیہ

اس بحث کے متعلق جو نزاعیں تھیں اگر چہ درحقیقت لفظی تھیں یعنی جو لوگ تشبیہ کے الفاظ استعمال کرتے تھے۔ مثلاً خدا عرش پر ہے۔ آسمان پر اتر کر آتا ہے۔ وہ بھی حقیقت میں تنزیہ کے قائل تھے۔ تاہم دونوں فرقے ایک دوسرے کے ہم وزن نہ ہوتے تھے اور اختلاف کا پردہ درمیان سے نہ اٹھتا تھا۔ امام صاحب نے اس بحث پر ایک مستقل رسالہ ''الجام العوام'' کے نام سے لکھا ہے۔ جس نے بہت کچھ اس اختلاف کو کم کر دیا اور تقریباً دونوں ڈانڈے ملا دیے۔ اس کے بعض نکتے یہاں درج کرنے کے قابل ہیں۔ تنزیہ کے متعلق بڑی کھٹک یہ تھی کہ اسلام کا مقصد محض تنزیہ اور تجرید تھا، تو قرآن مجید اور احادیث میں کثرت سے تشبیہ کے الفاظ کیوں آئے، قیامت میں خدا فرشتوں کے جھرمٹ میں آئے گا۔ آٹھ فرشتے اس کا تخت اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ دوزخ کی تسکین کے لیے خدا اپنی ران دوزخ میں ڈالدے گا۔ اس قسم کی بیسیوں باتیں ہیں جو قرآن مجید یا احادیث صحیحہ میں وارد ہیں جن سے یہ گمان ہوتا ہے کہ شریعت اسلامی خدا کی طرف سے نہیں ہے، بلکہ انسان نے اپنے خیال کے پیمانے کے موافق خدا کی ذات وصفات ٹھہرائے ہیں۔ امام صاحب نے اس عقدے کو اس طرح حل کیا کہ بے شبہ قرآن وحدیث میں اس قسم کے الفاظ موجود ہیں، لیکن یکجا نہیں ہیں۔ بلکہ جستہ جستہ متفرق مقامات پر ہیں اور چونکہ تنزیہ کے مسئلے کو شارع نے نہایت کثرت سے بار بار بیان کر کے دلوں میں جانشین کر دیا تھا۔ اس لیے تشبیہ کے الفاظ سے حقیقی تشبیہ کا خیال نہیں پیدا ہوسکتا تھا۔ مثلاً حدیث میں آیا ہے کہ کعبہ خدا کا گھر ہے۔ اس سے کسی شخص کو یہ خیال پیدا نہیں ہوتا کہ خدا درحقیقت کعبہ میں سکونت رکھتا ہے۔ اسی طرح قرآن کی آیتوں سے بھی جن میں عرش کو خدا کا مستقر کہا ہے خدا کے استقراء علی العرش کا خیال نہیں آسکتا۔ کسی کو آئے تو اس کی وجہ یہ ہوگی کہ اس نے تنزیہ کی آیتوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ ان الفاظ کو جب استعمال فرماتے

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

تھے تو انھیں لوگوں کے سامنے فرماتے تھے جن کے ذہن میں تنزیہ تقدیس خوب جاگزیں ہو چکی تھی۔

اس جواب پر یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ شارع نے صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیا کہ خدا نہ متصل نہ منفعل، نہ جوہر ہے، نہ عرض نہ عالم میں ہے نہ عالم سے باہر۔ اس قسم کی تصریحات موجود ہوتیں تو کسی کو سرے سے تشبیہ کا خیال ہی نہ آسکتا۔ امام صاحب نے اس شبہ کو یوں رفع کیا کہ اس قسم کی تقدیس عام لوگوں کے خیال میں نہیں آسکتی تھی۔ عام لوگوں کے نزدیک کسی چیز کی نسبت یہ کہنا کہ نہ وہ عالم میں ہے، نہ عالم سے باہر، گویا یہ کہنا کہ وہ شے سرے سے موجود ہی نہیں۔ بے شبہ خواص کے ذہن میں یہ تقدیس آسکتی ہے۔ لیکن شارع کو تمام عالم کی اصلاح مقصود تھی، جن میں بڑا حصہ عوام ہی کا تھا۔

علامہ ابن تیمیہ بظاہر تشبیہ کے قائل تھے۔ لوگوں نے ان سے کہا کہ اس عقیدہ کی رو سے خدا کا ممکن الوجود ہونا لازم آتا ہے، حالانکہ خدا واجب الوجود ہے۔ انھوں نے کہا کہ میرے عقیدہ کے موافق خدا موجود تو ہوگا، گو ممکن الوجود سہی۔ تمھارے اعتقاد کے موافق تو وہ ممکن بھی نہیں رہتا۔ بلکہ ناممکن اور محال بن جاتا ہے کیونکہ ایسی شے جو ہر جگہ ہو اور کہیں نہ ہو، عالم سے خارج بھی نہ ہو اور علم میں بھی نہ ہو، نہ متصل ہو نہ منفعل، نہ ذو مقاں ہو نہ ذو جہت، سرے سے ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ ارتفاع النقیضین ہے اور ارتفاع النقیضین محال ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں اور جس قدر مذاہب ہیں، سب میں خدا کو بالکل انسانی اوصاف کے ساتھ مانا گیا ہے۔ تورات میں یہاں تک ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام ایک رات ایک پہلوان سے کشتی لڑے اور اس کو زیر کیا، چنانچہ پہلوان کی ران کو صدمہ بھی پہنچا۔ صبح کو معلوم ہوا کہ وہ پہلوان خود خدا تھا۔ اسلام چونکہ دنیا کے تمام مذاہب سے اعلیٰ و اکمل ہے اس کا خدا انسانی اوصاف سے بالکل بری ہے۔ قرآن مجید میں ہے۔ (لیس کمثلہ شئی لاتجعلوا للہ اندادا) جہاں کہیں اس کے خلاف تشبیہ کے الفاظ پائے جاتے ہیں وہ حقیقت میں مجازات اور استعارات ہیں۔[1]

مولانا شبلی نعمانی نے ''الغزالی'' کو سلسلۂ علم الکلام کی ایک کڑی قرار دیا ہے۔ علامہ شبلی الغزالی کو

---

[1] الغزالی۔ شبلی، صفحہ ۱۵۸

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

اپنی سب سے ناقص تصنیف مانتے ہیں۔ایک جگہ لکھتے ہیں:-

''میں نے علم الکلام نہایت ناتمام لکھی اور وہ درحقیقت میری تصنیفات کا سب سے ناقص حصہ ہے''۔[1]

تاریخی اور سوانحی لحاظ سے یہ نامکمل ہے۔علامہ نے اس میں امام صاحب کے ذہنی ارتقاء کا بیان کافی تفصیل سے کیا ہے،لیکن علامہ نے تاریخ نویسی کے جو اصول بنائے تھے،ان کے خلاف ورزی کرتے ہوئے اس عہد کی تہذیبی اور معاشرتی اور امام صاحب کی زندگی کے حالات کو گویا نظر انداز کر دیا ہے،لیکن کہیں کہیں ایسا لگتا ہے کہ وہ تاریخ کے میدان میں آنے کے لیے بے قرار ہیں اور مواقع تلاش کر رہے ہیں اور ایک جگہ وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔لکھتے ہیں:-

''امام غزالی کے آئندہ واقعات کسی قدر سلطنت سے وابستہ ہیں۔اس لیے مختصر طور پر اس وقت کی ملکی حالت کا لکھنا ضروری ہے''۔

لیکن بہت دیر تک علامہ اور تاریخ کا ساتھ نہیں رہ پاتا ہے۔بہت جلد ہی علامہ شبلی،امام غزالی کی علمیت کا لوہا مان لیتے ہیں۔اس تصنیف کے کل ۲۹۲ رصفحات ہیں۔اس کے پہلے حصہ کو علامہ شبلی نے امام غزالی کے سوانحی حالات کے لیے مخصوص کر دیا ہے۔لیکن صرف ۲۸ رصفحات یعنی ۱۰/ اسے بھی کم حصے پر یہ بیان ملتا ہے۔تاریخی اعتبار سے بھی اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔جہاں کہیں شبلی نے تاریخ کا تھوڑا بھی ذکر کیا ہے وہاں بھی ان ہی اصولوں کو ملحوظ رکھا ہے جو ان کے لیے اوڑھنے بچھونے کی حیثیت رکھتے ہیں۔کسی بھی بات کو مولانا بغیر تحقیق اور دلائل کے تسلیم نہیں کرتے ہیں۔مثلاً علامہ سمعانی نے اپنی تصنیف کتاب الانساب میں غزالہ طوس نام کے ایک گاؤں کا ذکر کیا ہے۔علامہ سمعانی کا ماننا ہے کہ یہی امام غزالی کا وطن ہے۔اسی وجہ سے وہ غزالی کہلاتے ہیں۔علامہ شبلی نے تحقیق اور تدقیق کے اصول کو اختیار کرتے ہوئے اس کو ثابت کیا ہے کہ یہ قیاس غلط ہے۔طوس کے ضلع میں غزالہ کوئی گاؤں نہیں۔

یعنی جب اس نام کا کوئی گاؤں موجود ہی نہیں تو وہ یہاں کے رہنے والے کس بنیاد پر ہوئے۔علامہ شبلی کہیں کہیں تحقیق پر زیادہ زور دیتے ہیں۔مثال کے طور پر صفحہ ۲۴ اور صفحہ ۳۴ پر امام صاحب کی تصوف سے دلچسپی کے آغاز کی تاریخوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

---

[1] خط نمبر ۱۷ بنام مولانا حمید الدین بی۔اے مکاتیب شبلی،جلد دوم،ص ۱۲

T-7234

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

الغزالی کے اسلوبِ بیان میں نہ معمے ہیں اور نہ گلکاریاں بلکہ سیدھا سادہ انداز ہے۔صرف ۲۸ یا ۳۰ صفحات پر مشتمل تاریخ سے فنِ تاریخ نویسی سے کیسے فیض اٹھایا جاسکتا ہے۔ وہ تاریخ نویسی کے اصولوں کو پوری طرح نباہ بھی نہ پائی۔اس کا تجزیاتی مطالعہ کرنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ ''الغزالی'' کو تاریخ کے زمرے میں شامل کرنے میں ذرا تردد ہوتا ہے۔

Maulana Azad Library, Aligrh Muslim University

سوانح مولانا روم

علاّمہ شبلی سوانح مولانا روم کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:-

''سلسلہ کلام کا یہ چوتھا نمبر ہے، تین حصے (علم الکلام، الکلام، الغزالی) پہلے شایع ہو چکے ہیں۔ مولانا روم کو دنیا جس حیثیت سے جانتی ہے وہ فقر و تصوف ہے، اور اس لحاظ سے متکلمین کے سلسلہ میں ان کو داخل کرنا اور اس حیثیت سے ان کی سوانح عمری لکھنا، لوگوں کو موجب تعجب ہوگا۔ لیکن ہمارے نزدیک اصل علم کلام یہی ہے کہ اسلام کے عقائد کی اس طرح تشریح کی جائے اور اس کے حقائق و معارف اس طرح بتائیں جائیں کہ خود بخود دلنشیں ہو جائیں۔ مولانا روم نے جس خوبی سے اس فرض کو ادا کیا ہے، مشکل سے اس کی نظیر مل سکتی ہے۔ اس لیے مولانا روم کو زمرۂ متکلمین سے خارج کرنا سخت ناانصافی ہے۔''[1]

مولانا روم کے حالات اور واقعات، عام تذکروں میں مختصراً ملتے ہیں۔ سپہ سالار ایک بزرگ، مولانا کے مرید خاص تھے اور مدّت تک فیض صحبت اٹھایا تھا۔ انھوں نے مولانا کی مستقل سوانح عمری لکھی ہے۔ مناقب العارفین میں بھی ان کا مفصل تذکرہ ہے، علاّمہ شبلی نے زیادہ تر انھیں دونوں کتابوں کو ماخذ قرار دیا ہے۔ لیکن یہ کتابیں قدیم مذاق پر لکھی گئی ہیں اور اس لیے ضروری اور کارآمد باتیں کم ملتی ہیں لیکن اس نقصان کی تلافی اس طرح کر دی گئی ہے کہ مولانا روم کے کلام اور بالخصوص مثنوی پر نہایت مفصل تبصرہ لکھا ہے۔

اس کو علاّمہ شبلی نعمانی کی وسعت فکر و نظر اور جدّت کا نتیجہ ہی کہا جائیگا کہ ''اہل کلام'' اور مثنوی معنوی کو تصانیف ''علم کلام'' میں جگہ دی ہے۔ ''مثنوی کے علم کلام سے'' بحث کرتے ہوئے علم کلام کے علماء کی تصانیف سے متعلق شبلی اپنی یہ رائے پیش کرتے ہیں:-

---

[1] دیباچہ سوانح موالانا روم

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

''ان تمام تصانیف کے پڑھنے سے اس قدر ضرور ثابت ہوتا ہے کہ ان کے مصنفین غلط کو صحیح دن کو رات، زمین کو آسمان ثابت کر سکتے ہیں، لیکن ایک مسئلہ میں بھی یقین اور تشفی کی کیفیت نہیں پیدا کر سکتے ہیں، بخلاف اس کے مولانا روم جس طریقہ سے استدلال کرتے ہیں، وہ دل میں اثر کر جاتا ہے اور گو وہ شک وشبہات کے تیرِ باراں کو کلیۃً نہیں روک سکتا، تاہم طالب حق کو اطمینان کا حصار ہاتھ آجاتا ہے جس کی پناہ میں وہ اعتراض کے تیر باراں کی پرواہ نہیں کرتا'' ۔[1]

مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:-

''جس طرح عقلیات کی تلاش میں مولانا کو امام غزالی کی درس گاہ تک پہنچایا، امام غزالی کی تلاش ان کو مولانا روم کے آشیانہ تک لے آئی'' ۔[2]

مولانا روم کا نام محمد، جلال الدین لقب، عرف مولانا روم، حضرت ابوبکر صدیقؓ کی اولاد میں تھے، جواہر مضیئہ میں سلسلۂ نسب اس طرح بیان کیا ہے، محمد بن محمد بن محمد بن حسین بن احمد بن قاسم بن مسیب بن عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن ابی بکر الصدیقؓ، اس روایت کی رو سے حسین ملقب مولانا کے پردادا ہوتے ہیں، لیکن سپہ سالار نے ان کو دادا لکھا ہے اور صحیح بھی یہی ہے۔ حسین بہت بڑے سوفی اور صاحب حال تھے، سلاطین وقت اس قدر ان کی قدر کرتے تھے کہ خوارزم شاہ نے اپنی بیٹی کا نکاح ان کے ساتھ کر دیا تھا۔ بہاء الدین ان ہی کے بطن سے تھے۔ اس لحاظ سے سلطان محمد خوارزم شاہ، بہاؤ الدین کے ماموں اور مولانا کے نانا تھے۔

علامہ شبلی نعمانی، مولانا روم کو بحیثیت متکلم پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے علامہ نے تاریخ نویسی پر بھی زیادہ توجہ نہیں دی ہے۔ الغزالی اور النعمان کی طرح سوانح مولانا روم بھی نیم علمی اور نیم تاریخی کتاب ہے۔ شبلی کے تصنیف و تالیف کا مقصد مسلمانوں کے دل سے احساسِ کمتری کو نکالنا تھا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے تاریخ کے علاوہ بھی بہت سے راستے تھے۔ یہ کام مسلمانوں کے آباء واجداد کے واقعات اور کارنامے سنا کر بھی کیا جا سکتا تھا اسی لیے انھوں نے اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ایک دوسری راہ اختیار کی۔ وہ تاریخ نویسی کے لیے خود کو وقف کر چکے تھے، اس لیے اس میدان سے زیادہ دور بھی نہ رہ سکے۔

---

[1] حیات شبلی-سید سلیمان ندوی، صفحہ ۳۷

[2] حیات شبلی-سید سلیمان ندوی، صفحہ ۳۷۸

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

ایک جگہ سوانح مولانا روم میں زرا موقع ملا تو فوراً مورخ شبلی بیدار ہو گیا۔ لکھتے ہیں:-

''چونکہ مولانا کے حالاتِ زندگی میں سلاطین روم کا ذکر آئے گا اور ان سلاطین میں سے اکثر کو مولانا سے خاص تعلق رہا ہے۔ اس لیے مختصر طور پر اس سلسلے کا ذکر ضروری ہے''۔ [1]

سلطان محمود اور آل سامان کے اندر یہ ذوق پیدا ہوا کہ شاہانِ عجم یعنی ان کے آباء و اجداد کے کارناموں کو نظم کی شکل میں لکھا جائے۔ تاکہ ضرب المثل بن کر لوگوں کی زبان پر آ جائیں۔ یہی مثنوی کے وجود میں آنے کا سبب ہے۔ مثنوی تاریخی واقعات کو بیان کرنے کا اصنافِ نظم میں سب سے بہتر ذریعہ ہے۔ فردوسی نے اس کو اس کے کمال تک پہنچا دیا، لیکن اصنافِ شاعری کی اس وقت تک جو بھی ترقی ہوئی تھی وہ صنائع و بدائع، خیال بندی اور واقعہ نگاری کے لحاظ سے ہوئی تھی۔ کیفیت اور ذوق اس وقت تک وجود میں نہیں آئے تھے۔ حضرت سلطان ابوسیر ابوالخیر نے رباعی میں اپنے خیالات کو ادا کرنے کے لیے تصوف اور طریقت کا سہارا لیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب فارسی شاعری میں وجد و مستی اور ذوق کی روح سرایت کر گئی۔ دولتِ غزنویہ کے اخیر زمانہ میں حکیم سنائی نے ''حدیقہ'' لکھی جو نظم میں تصوف کی پہلی تصنیف ہے۔ حدیقہ کے بعد خواجہ فریدالدین عطار نے تصوّف کے موضوع پر کئی مثنویاں لکھیں۔ ان میں منطق الطیر زیادہ مشہور ہوئی۔ مثنوی مولانا روم اسی سلسلے کی آخری کڑی ہے۔

اصل میں مولانا روم کی مثنوی کا موضوع علم کلام نہیں تصوّف ہے۔ مولانا مجذوب و مستغرق اور زاہد و مجاہد صوفی تھے۔ مولانا نے ''علم ظاہری'' کی تصانیف کو جلانے کے بعد مثنوی لکھنی شروع کی تھی۔ اس لیے ان کو مثنوی میں کلام کیا، قرآن و حدیث کی تعلیم سے بھی بحث نہیں۔ اس کا تعلق صرف اور صرف تصوّف سے ہے۔ اس لیے مولانا نے اس کے مسائل وارداتِ قلبی کے مانند بیان کئے ہیں۔ اس کی وجہ سے شاعرانہ کیفیت نہیں بلکہ الہام کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی لیے نظامی نے کہا ہے:-

مثنوی مولوی معنوی
ہست قرآن در زبان پہلوی
من چہ گویم وصف آن عالیجناب
نیست پیغمبر ولے دارد کتاب [2]

---

[1] سوانح مولانا روح۔ شبلی نعمانی، صفحہ ۹

[2] داستان تاریخ اردو۔ حامد حسن قادری، صفحہ ۸۲۳

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ اس میں ''علم کلام'' کا بالکل حصّہ نہیں ہے۔ ''متکلمین'' کے بیان میں نہیں، ''کتب کلامیہ'' کی زبان میں نہیں، بلکہ عارف حقائق کے طرز میں، کاشف اسرار کے اسلوب میں، صاحب وجد وحال کے طور پر، قطبِ ارشاد کے انداز سے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ مثنوی فتنۂ تاتار کے زہر کا تریاق بن کر وجود میں آئی تھی۔ چنگیز کے پوتے ہلاکو نے ۶۵۶ھ میں، خلیفہ کو قتل، خلافتِ عباسیہ کو برباد اور بغداد کو تباہ کر دیا تھا۔ ۵۷۲ھ میں مولانا روم کا انتقال ہوا۔ ان ہی سولہ سال کے درمیان مثنوی لکھی گئی۔ تاتاریوں کے مظالم کو مولانا نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ نتیجتاً مسلمانوں کے قلب، روح، فکر، نظر، عقائد اور اعمال کی جڑیں ہل گئی تھی۔ سکون وقرار مفقود تھا، دنیا نظروں میں دھندلی تھی، اضطرار کی سی کیفیت تھی، اضطراب چھایا ہوا تھا۔ ایسے حالات میں صرف اولیا اللہ کی صحبت میں ہی روحانی تسکین ملتی ہے۔ ان حالات میں جب مثنوی لکھی گئی تو اس کا اثر فوراً ظاہر ہوا۔ کیونکہ اس میں یقین و ایمان کی تسلی بھی تھی، امراض روحانی کا علاج بھی تھا اور تاتاریوں نے مسلمانوں کو جو زخم دیے تھے، ان کے لیے مرہم بھی تھا۔ اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ جب بھی کوئی فتنہ پیدا ہوتا مثنوی کی مقبولیت اور زیادہ بڑھ جاتی اور اس کی نئی نئی شرحیں وجود میں آنے لگتیں۔ نادر شاہ کے حملے، اکبر و جہانگیر کی دین سے بے پرواہی اور تیمور کی غارت گری نے مسلمانوں کے قلب اور روح کو اضطراب میں مبتلا کر دیا اور مثنوی انھیں اپنے پیغام سے تسکین بخشتی رہی۔

مثنوی کی جتنی بھی نئی شرحیں وجود میں آئیں سب میں معرفت، طریقت اور حقیقت کی توضیح کی گئی تھی۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ دورِ شارحین میں اس کی ضرورت تھی۔ جس وقت علاّمہ شبلی نے ''سوانح مولانا روم'' تصنیف کی اس وقت سرسید علم کلام پر زیادہ زور دے رہے تھے اور انھوں نے اسلامی عقائد کی عقلی وکلامی توجیہ وتاویل کا آغاز کر دیا تھا۔ شبلی، سرسید کی صحبت میں رہ کر کام کر چکے تھے۔ علم کلام کا ذوق شبلی میں وہیں سے پید اہوا تھا۔ چنانچہ الغزالی کے بعد ان کی نظر متکلم مولانا روم پر پڑی۔ علاّمہ شبلی نے جس غرض سے یہ کتاب لکھی، وہ یہ تھی کہ وہ مثنوی سے علم کلام کے مسائل اخذ کر کے دکھانا چاہتے تھے۔ اس وجہ سے علاّمہ شبلی نے تصوّف کے مقابلے میں کلام کو ترجیح دی ہے۔ بہر حال یہ دریافت علاّمہ کی فضیلت پر دال ہے۔

لیکن جہاں تک تاریخ نویسی کا سوال ہے کہیں کہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کو زبردستی برت رہے ہیں۔ اس تصنیف میں مولانا تاریخ نویسی کے لوازم کی جھلک بھی نہیں دکھا پائے۔ تحقیق اور جرح وتعدیل کے اصولوں کو بھی علاّمہ نے ایمانداری کے ساتھ نہیں برتا ہے۔ کچھ مقامات پر خصوصیت سے اس بات کا احساس

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

ہوتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ شبلی لکھتے ہیں کہ:-

''ہلاکو خاں کے سپہ سالار بائجو خاں نے قونیہ پر حملہ کیا اور اپنی فوجیں شہر کے چاروں طرف پھیلا دیں۔ اہلِ شہر محاصرے سے تنگ آ کر مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے ایک ٹیلے پر جو بائجو خاں کے خیمے کے سامنے تھا جا کر مصلیٰ بچھا دیا اور نماز پڑھنی شروع کر دی۔ بائجو خاں کے سپاہیوں نے مولانا کو تاک کر تیر باراں کرنا چاہا لیکن کمانیں کھنچ نہ سکیں آخر گھوڑے بڑھائے کہ تلوار سے قتل کر دیں لیکن گھوڑے جگہ سے نہ ہل سکے .....لوگوں نے بائجو خاں سے جا کر یہ واقعہ بیان کیا۔ اس نے خیمے سے نکل کر کئی تیر چلائے لیکن سب پھٹ کر اِدھر اُدھر نکل گئے۔ جھلا کر گھوڑے سے اتر پڑا اور مولانا کی طرف چلا لیکن ہاتھ پاؤں نہ اٹھ سکے۔ آخر محاصرہ چھوڑ کر چلا گیا''۔[1]

مندرجہ بالا واقعہ کو صحیح ماننے میں تردد ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے اس واقعہ میں تحقیق اور تدقیق سے کام نہیں لیا۔ اس کو مالانا بھی تسلیم کرتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ علاّمہ شبلی اس کاوش میں مبتلا نہیں ہونا چاہتے ہیں، اس لیے صرف اتنی سی بات کہہ کر آگے بڑھ گئے ہیں:

''مولان نے جب اطمینان، استقلال اور بے پروائی سے عین بائجو خاں کے آگے مصلیٰ بچھا کر نماز بھی شروع کی ہوگی اور اہلِ فوج کی تیر باراں کا کچھ خیال نہ کیا ہوگا، اس نے خود بائجو خاں کے دل مرعوب کر دیا ہوگا''۔[2]

مولانا روم کے نزدیک نبوّت کی تصدیق کے لیے ''معجزہ'' شرط نہیں جس کے دل میں ایمان کا مزہ ہوتا ہے۔ پیغمبر کی صورت اور اس کی باتیں اس کے حق میں معجزہ کا کام دیتی ہیں۔

در دلِ ہر کس کہ از دانش مزہ است
روئے آوازِ پیغمبر معجزہ است

لیکن مولان نے اسی پر قناعت نہیں کی، بلکہ صاف تصریح کی کہ معجزہ ایمان کا سبب نہیں ہوتا اور اس سے ایمان پیدا بھی نہیں ہوتا ہے۔ جبری ایمان پیدا ہوتا ہے، نہ ذوقی چنانچہ فرماتے ہیں:

---

[1] سوانح موالانا روم- علامہ شبلی نعمانی، حصہ دوم، صفحہ ۳۱

[2] سوانح موالانا روم- علامہ شبلی نعمانی، حصہ دوم، صفحہ ۳۲

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

موجب ایمان بنا شد معجزات

بوئے جنسیت کند جذب صفات

معجزات ایمان کا سبب نہیں ہوتے۔ جنسیت کی بو صفات کو جذب کرتی ہے۔

معجزات از بہر قہر دشمن است

بوئے جنسیت سوئے دل بُردن است

معجزات اس لیے ہوتے ہیں کہ دشمن دب جائیں لیکن جنسیت کی بو اس غرض کے لیے ہے کہ دل تک پہنچ جائے۔

مر گرد و دشمن اما دوست نے

دوست کے گردبہ بستہ گردنے

دشمن دب جاتا ہے، لیکن دوست نہیں ہوتا وہ شخص بھلا کیا دوست ہوگا جو گردن پکڑ کر لایا گیا ہے۔

مولانا نے اس بحث میں ایک اور دقیق نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔

معجزہ سے نبوّت پر جو استدلال کیا جاتا ہے اس کی منطقی ترتیب یہ ہوتی ہے:-

اس شخص سے یہ فعل (معجزہ) صادر ہوا ہے، اور جس شخص سے یہ فعل صادر ہو وہ پیغمبر ہے، اس لیے یہ شخص پیغمبر ہے۔

اس صورت میں پیغمبر کا اثر بالذات خارجی چیز ہوتا ہے، مثلاً دریا کا پھٹ جانا، سنگریزوں کا بولنا وغیرہ وغیرہ۔ اس اثر سے بھرپور بواسطہ قلب پر اثر پڑتا ہے، یعنی آدمی اس بنا پر ایمان لاتا ہے کہ جب اس شخص نے دریا کو شق کر دیا تو ضرور پیغمبر ہے۔

لیکن بجائے اس کے کہ معجزہ کسی پتھر یا دریا، یا جمادات پر اثر کرے یہ زیادہ آسان ہے کہ پہلے پہل دل ہی پر اثر کرے۔ خدا جب یہ چاہتا ہے کہ پیغمبر پر لوگ ایمان لائیں تو یہ زیادہ آسان اور زیادہ دل نشیں طریقہ ہے کہ بجائے جمادات خود لوگوں کے دلوں کو متاثر کر دے کہ وہ ایمان قبول کر لیں اور یہی اصل معجزہ کہا جا سکتا ہے۔ مولانا اس نکتہ کو ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں:-

معجزہ گاہ بر جمادے کر داثر

یا عصایا بحر یا شق القمر

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

گر اثر بر جاں زند بے واسطہ
متصل گردد بہ پنہاں رابطہ
بر جمادات آں اثر عاریہ است
آں پے روح خوش متواریہ است
تازاں جامد اثر کیسرد ضمیر
جذاناں بے ہیولا بے خمیر
بر زند اں جان کامل معجزات
بر صغیر جانِ طالب چوں حیات

اخیر شعر میں معجزہ کی اصلی حقیقت بتائی ہے، یعنی پیغمبر کا روحانی اثر خود طالب کی روح پر پڑتا ہے۔ کسی واسطہ اور ذریعہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔[1]

آخر میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام میں عقل کا دخل نہیں ہے۔ اللہ کو ماننا ہے، چاہے عقل تسلیم کرے یا نہ کرے۔ نبی کی نبوت کو قبول کرنے کیلیے معجزہ کی ضرورت نہیں اور نہ ہی کسی دلیل کی ضرورت ہے۔ اپنی دوسری تصانیف کی طرح علامہ شبلی نے ''سوانح مولانا روم'' کی تحریر کی اکتاہٹ کو محسوس کیا اور اس کو دور کرنے کے لیے پرلطف قصے اِدھر اُدھر بکھیر دیے ہیں اور مولانا روم کی عظمت کی داستانیں بیان کی ہیں۔ لیکن ان تاویلوں سے کسی تاریخی تصنیف کے رتبے میں کوئی فرق نہیں آتا ہے۔ ادبیت کے اعتبار سے تو یقیناً ہی سوانح مولانا روم ایک بلند مرتبہ رکھتی ہے، لیکن تاریخی حیثیت سے اسے عظمت کی نشانی نہیں کہا جاسکتا ہے۔

---

[1] سوانح موالانا روم- علامہ شبلی نعمانی، حصہ دوم، صفحہ ۱۴۱

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

د۔مضامین اور مقالات میں تاریخی عناصر

علامہ شبلی نعمانی نے مختلف عنوانات مثلاً سیاست ،ادب ،تاریخ اور علمی موضوعات پر بہت سے مضامین لکھے ہیں جو ان کی مستقل تصانیف کے علاوہ ہیں۔اور یہ مختلف رسائل اور اخبارات میں بکھرے ہوئے تھے کچھ لوگوں کا اصرار تھا کہ ان کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے تا کہ ان سے پوری طرح استفادہ کیا جا سکے۔ حالانکہ علامہ شبلی کے کچھ مضامین ان کی زندگی ہی میں ''رسائل شبلی'' اور ''مقالات شبلی'' میں بھی چھپے تھے۔لیکن یہ دونوں مکمل مجموعہ نہیں تھے۔ان میں صرف تھوڑے سے علمی اور تاریخی مضامین تھے۔اس مسئلہ کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ طے ہوا کہ ان کے ہر عنوان کو ایک مستقل جلد کا درجہ دیا جائے۔تا کہ ان کے مضامین جن جن موضوعات پر ہوں وہ الگ الگ موقع میں نظر آسکیں۔اس بات کو دھیان میں رکھتے ہوئے مختلف اخبارات اور رسائل ، جو اس وقت ملک میں معروف تھے یہ تمام مضامین نہایت محنت وجستجو سے جمع کئے اور مختلف موضوعات کے اعتبار سے ان کی الگ الگ تقسیم کی گئی اور ان کی اشاعت کی سعی کی گئی۔

دارالمصنفین نے مقالات شبلی آٹھ (۸) جلدوں میں درج ذیل ترتیب سے شائع کیے ہیں:-

۱-	جلد اول	مذہبی مضامین
۲-	جلد دوم	ادبی مضامین
۳-	جلد سوم	تعلیمی مضامین
۴-	جلد چہارم	تنقیدی مضامین
۵-	جلد پنجم	سوانحی مضامین
۶-	جلد ششم	تاریخی مضامین
۷-	جلد ہفتم	فلسفیانہ مضامین
۸-	جلد ہشتم	قومی مضامین

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

علامہ شبلی نعمانی کا سب سے پہلا مضمون ''مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم'' ہے۔ تصانیف کے ساتھ ساتھ شبلی وقتاً فوقتاً چھوٹے بڑے مقالات مختلف رسالوں میں قلم بند کرتے رہے۔ اس کے بعد ندوۃ العلماء سے ''الندوہ'' ماہانہ رسالہ شروع کیا۔ اس میں ہر قسم کے مضامین کثرت سے لکھتے رہے ''رسائل شبلی'' میں بھی مولانا کے طویل مضامین ہیں۔

علامہ شبلی کے بھی مضامین ان کی دقت نظر، وسعت تحقیق، قوت استدلال اور زور قلم کے شاہد ہیں۔ کہیں کہیں ان کے خیالات سے اختلاف ہوسکتا ہے۔ یا بعض جگہ ان کی رائے اور نظریہ مختلف ہوسکتا ہے یہ باتیں جزئی ہیں۔ علامہ شبلی نے کچھ ایسے موضوعات پر بھی طبع آزمائی کی جن کی طرف پہلے کسی کا دھیان نہیں گیا تھا۔ مثلاً تاریخ۔ علامہ شبلی کے معاصرین میں سب سے بڑا مقالہ نگار مولوی عبدالحلیم شرر لکھنوی کو مانا جاتا ہے۔ علامہ شبلی کے مقابلے میں ان کے مجموعہ مضامین بہت زیادہ ضخیم اور کثیر ہیں۔ ''مقالات شرر'' کے چھ سات موضوعات ''مقالات شبلی'' میں بھی ملتے ہیں تاریخ کے میدان میں دونوں کا تقابل کرنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ شرر تحقیق و تدقیق پر زیادہ زور نہیں دیتے ہیں۔ بلکہ ان کی کوشش مضمون کو دلچسپ اور نادر بنانے کی ہوتی ہے۔ جب کہ شبلی تحقیق و جستجو کی طرف زیادہ دھیان دیتے ہیں۔ خواجہ غلام الثقلین نے علامہ شبلی کے تاریخی مضامین کے بارے میں ایک جگہ لکھا ہے:-

> ''یہ عجیب بات ہے کہ مولانا شبلی کی حریت خیال جہاں مذہب اور اپنے زمانے کے پالیٹکس میں حاوی تھی، وہاں تاریخی معاملات میں خاص کر مطلق العنان اور جابر بادشاہوں کی تائید میں وہ مفقود ہوجاتی تھی۔ انسانی دماغ اس قسم کے متبائن رجحانات سے معمور ہے۔ ان کے اس میلان کی زیادہ تر یہ بھی وجہ تھی کہ یورپین اور عیسائی مورخوں اور آریہ مناظروں نے طریقۂ اعتدال کو چھوڑ کر ہر مسلمان حکمراں پر اعتراضات کی ناواجب سختی روا رکھی تھی، اور اس بات کو عمداً نظر انداز کر دیا تھا کہ قرآن کے افعال کو بد نیتی کی طرف محمول کرنا ایک غیر عاقلانہ اور غیر فلسفیانہ فعل ہے۔ اس بے اعتدالی کے جواب میں مولانا شبلی بعض تاریخی مضامین و تصانیف میں اس غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں کہ عموماً مسلمان بادشاہ (لہٰذا ان کے عام درباری اور اہل زمانہ) نہایت مفید اور اچھے کام کرتے تھے۔ حالانکہ اگر کل تک یہ حالت تھی تو یہ کیونکر ہوسکتا ہے کہ مسلمانوں کی حالت

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

آج اس قدر خراب نظر آتی ہے۔ لیکن یہ رائے کا اختلاف ہے مولانا شبلی کا خیال تھا کہ عالمگیر، جہاں گیر یا عبدالحمید خاں کی تائید سے اصل اسلام پر الزام تک کی نوبت نہیں پہونچے گی، ہمارا خیال اس کے خلاف ہے۔

ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد''[1]

مذکورہ بالا بیان میں بڑی حد تک صداقت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ علامہ شبلی کبھی کبھی جانبداری کی وجہ سے اعتدال کھو دیتے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب صرف اتنا ہے کہ شاہان جابر کے جن افعال سے انکار کی گنجائش نہیں ہوتی، ان کی تاویل نہیں کرنی چاہیے۔ ان کو جابر اور ظالم ہی رہنے دینا چاہیے۔ علامہ شبلی نے کبھی ایسا نہیں کیا کہ اہل زمانہ بادشاہوں یا ان کے درباریوں کے ایسے کام جو مخالف اسلام یا منافی شرع ہوں، کو مستحسن اور جائز بنایا ہو۔ اس لیے انھی بزرگوں پر ان کے افعال کی ذمہ داری آتی ہے۔ اسلام پر کسی طرح کا کوئی الزام نہیں آتا ہے۔ علامہ کی تاویل سے صرف اتنی سی بات کہنے کی گنجائش نکلتی ہے کہ

''ناکردہ گناہ در جہاں کیست بگو''

لیکن اس کے ساتھ ہی جہاں علامہ شبلی نے اسلام مخالفین کے تعصب کو ثابت کیا ہے، تاریخی فرخرفات کو ختم کیا ہے اور بے بنیاد الزامات کی بیخ کنی کی ہے، وہ علامہ شبلی کا ہی حصہ ہیں۔

بعض مصنفین کو اپنے مضامین اور مقالات کی وجہ سے خاص اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ علامہ شبلی نعمانی کے بھی اکثر مضامین اور مقالات ان کی تصانیف کے مقابلے میں زیادہ مقبول ہیں۔ مولوی عبدالحق نے ۳۰ برس پہلے لکھا تھا کہ ''مولانا کی تصانیف کو ابھی سے نونی لگنی شروع ہوگئی ہے''[2]

اس کو زمانے کا عمل جراحی کہتے ہیں اور اس سے کوئی انکار بھی نہیں کرسکتا ہے۔ اگر ایسا ہی ہوتا تو سر سید احمد خاں اور مولوی ذکاء اللہ تو کبھی کے نونی لگنے سے ڈھ گئے ہوتے۔ صرف ''عناصر اربعہ'' کے آب وگل میں کچھ جان باقی ہے۔ ان میں صرف علامہ شبلی ہی ایسے ہیں جو کافی عرصہ تک زمانہ کے ساتھ چلیں گے۔ لیکن ان سب مصنفین کے مقالات ومضامین بہت پر اثر ہیں یہ فنا نہ ہوں گے بلکہ ان میں ''بقائے اصلح'' کا قانون جاری رہے گا۔ علامہ شبلی کے مقالات کی جلدوں میں چھوٹے بڑے مضامین کی تعداد ۱۰۰ (سو) سے زیادہ ہے۔

---

[1] مضمون مطبوعہ سیر المصنفین، صفحہ ۵۵

[2] المقدمہ خطوط شبلی۔ مطبوعہ ۱۹۲۶ء، صفحہ ۲۱

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

بعض مضامین ۴۰، ۵۰ صفحات پر محیط ہیں۔ بعض مضامین عام دلچسپی کے نہ ہونے کے باوجود بیحد نادر اور جدید ہیں۔

انگریزوں نے ہندوستان کی حکومت سمبھالتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ہندوستانیوں کو اپنی بڑائی کے جھوٹے قصے سنا کر متاثر و مرعوب کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کا ایک خاص طبقہ یورپ ہی کو واقعیت، لیاقت اور قابلیت کا واحد ذریعہ سمجھنے لگا۔ لیکن انگریزوں کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی تاریخ کو کچھ اس طرح توڑ مروڑ کر پیش کیا جائے کہ خود مسلمان اپنی تاریخ سے نفرت کرنے لگیں۔ اور اپنی تاریخ کا ذکر کرنا بھی پسند نہ کریں۔ اس کو علامہ شبلی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:-

> ''یورپ کے بے درد واقعہ نگاری نے سلاطین اسلام کی غفلت شعاری، عیش پرستی اور سیہ کاری کے واقعات کو اس بلند آہنگی سے تمام عالم میں مشہور کیا ہے کہ خود ہمیں کو یقین آچلا اور تقلید پرست تو بالکل یورپ کے ہم آہنگ بن گئے''[1]

ذہنی پستی اور دوسری قوموں سے کمتر ہونے کا جو احساس مسلمانوں کے اندر پیدا ہو گیا تھا، اس کو دور کرنے کا شبلی کے ذہن میں ایک ہی طریقہ سمجھ میں آیا اور وہ یہ تھا کہ اسلامی تاریخ کے ایسے اوراق مسلمانوں کے سامنے لائے جائیں جن سے مسلمانوں کو یہ خیال پیدا ہو کہ ہمارے پاس ایسی دولت ہے جو اللہ کے خزانوں کی سب سے قیمتی دولت ہے اور وہ دولت ایمان کی دولت ہے۔ جس کے سامنے ساری کائنات ہیچ ہے۔ یہاں تک کہ ساتوں زمین اور ساتوں آسمان بھی۔

سرسید نے جو اصلاحی تحریک شروع کی تھی، اس کا واحد مقصد یہ تھا کہ جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں کے اندر جو احساس کمتری پیدا ہو گیا تھا اس کو دور کیا جائے اور یہ ذمہ داری سرسید احمد خاں نے مولانا شبلی کو سونپی۔

ابتداء میں شبلی نے مکمل اسلامی تاریخ لکھنے کا ارادہ کیا۔ لیکن پھر ان کو خیال ہوا کہ یہ اتنا وسیع میدان ہے کہ اس کا احاطہ کرنا ایک آدمی کے بس کی بات نہیں ہے۔ لہٰذا انھوں نے اپنا یہ ارادہ ترک کر دیا اور ''رائل ہیروز آف اسلام'' (یعنی نامور فرمانروایان اسلام) کا سلسلہ شروع کیا۔ اس کے لیے علامہ شبلی نے ان شخصیتوں کو منتخب کیا جو اپنے طبقے میں ہر اعتبار سے یکتا تھیں۔ اس کے لیے علامہ شبلی نے حضرت عمر فاروقؓ،

---

[1] شبلی بحیثیت مورخ = اختر وقار عظیم صفحہ ۸۷

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

خلیفہ مامون الرشید، امام غزالیؒ، مولانا رومؒ جیسے ناموروں کی سوانح عمریاں لکھیں۔ مستقل تصانیف کے علاوہ مقالات اور مضامین میں بھی وقتاً فوقتاً ایسی شخصیتوں کا ذکر کرتے رہے۔ شخصیتوں کے ساتھ ساتھ مختلف زبانوں کے علوم وفنون سے بھی بحث کرتے رہے۔ کس زبان نے کتنی ترقی کی اور کس زبان سے دوسری زبانوں نے استفادہ کیا۔ غرض یہ کہ ہر موضوع ان کے مضامین اور مقالات میں موجود ہے۔

شبلی کی علمی دلچسپیوں کا دائرہ اتنا وسیع تھا کہ کوئی بھی موضوع اس دائرے سے باہر نہ تھا۔ مثلاً ادب، تاریخ، کلام، فلسفہ فنون جنگ، نظام ونصاب تعلیم، الٰہیات وغیرہ۔ الندوہ میں شبلی کا زور علمی خبروں پر رہتا تھا۔ علمی رجحانات اور علمی رفتار سے پوری طرح باخبر رہتے تھے۔ مولانا احسن مارہروی نے ۱۹۱۵ء میں لکھا تھا:-

''علامہ کی دور ایڈیٹری میں الندوہ میں جس پائے کے مضامین نکلے ان سے اہل ذوق واقف ہیں یہ مضامین اردو ادب کے لیے بہترین سرمایہ ناز رہیں گے''[1]

رمضان المبارک میں جرجی زیدان پر شبلی نے مضمون لکھا۔ اس کے بارے میں مولانا احسن مارہروی لکھتے ہیں:-

''ضخیم مجلدات کے ہزاروں صفحات الٹنے پڑے آخر جب نقد ختم ہوئی تو نقد بصارت بھی نذر ہو چکی تھی''[2]

مستشرقین نے مسلمانوں پر کتب خانہ اسکندریہ کو جلانے کا الزام لگایا تھا۔ شبلی نے بغور اس پورے لٹریچر کا مطالعہ کیا۔ وائٹ، گبن، ڈیسائسی (DESCACY) کریل کی تحریریں، SPECTATOR کے پرچے، اور ENCYCLOPAEDIA کی جلدوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ہی علامہ نے اس بحث میں حصہ لیا تھا۔ اور ان الزامات کی تردید پر زور دلائل کے ساتھ کی اس کے بعد لکھتے ہیں کہ ایک دن یورپین اس بات کو تسلیم کریں گے کہ

ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

شبلی نے اسلامی نظام حکومت میں اہل ذمہ کی حیثیت اور جزیہ کے بارے میں جو عام غلط فہمی تھی، اس کو دور کرنے کے لیے دو رسائل ''الجزیہ'' اور ''حقوق الزمیین'' لکھے۔ انھوں نے فقہ اسلامی کی روشنی میں ان

---

[1] کسوف الشمسین، ص ۱۴

[2] کسوف الشمسین، ص ۳۴

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

مسائل پر بحث کی اور بہت سی غلط فہمیوں کو دور کیا۔ اس عنوان پر عربی ممالک میں خاطر خواہ لٹریچر موجود نہ تھا اور نہ اس سے پہلے کسی نے ان مسائل پر اس طرح سے غور کیا تھا۔ سرسید کا کہنا تھا کہ اس طرح کی تحقیق شبلی کا ہی حصہ ہے۔

اسی طرح شبلی نے تحقیق کے ساتھ اورنگزیب پر لگائے جانے والے الزامات کا ازالہ کیا۔ علوم قرآن سے متعلق ان کے مقالات ''تاریخ ترتیب قرآن''، ''علوم القرآن''، ''اعجاز القرآن'' وغیرہ ہیں۔ ان کو تحقیق اور ترجمانی کا بہترین نمونہ کہا جاسکتا ہے۔ عربی زبان سے متعلق ان کے مضامین، عربی اور فارسی شاعری کا موازنہ، شعر العجم، ان کے تبحر علمی کی بہترین نشانیاں ہیں۔

اگر علامہ شبلی کو موقع ملتا تو وہ ''شعر العجم'' کے ساتھ ''شعر العرب'' بھی لکھتے۔ مولانا شبلی نے درس نظامی اور قدیم وجدید نظام تعلیم کا جس طرح موازنہ کیا اور جو کچھ بھی مسلمانوں کی نظام تعلیم کے بارے میں لکھا وہ ان کی ذہنی کیفیت کی ترجمانی کرتا ہے۔

ہندوستانی تاریخ اور تمدن کے متعلق ان کے مقالات ہمایوں نامہ، مآثر رحیمی، تزک جہاں گیری، تحفۃ الہند، زیب النساء بصیرت سے بھرے ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کے تمدنی کارناموں کو دنیا کے سامنے لانے کے لیے شبلی ''اسلامی حکومتیں اور شعا خانے''، ''میکنس اور مسلمان''، ''ہندوستان میں اسلامی حکومت کے تمدن کا اثر'' وغیرہ مضامین بھی وقتاً فوقتاً لکھتے رہے۔

شبلی کی تاریخ نگاری کا صحیح طور پر اندازہ لگانے کے لیے ان کے دو مختصر مقالے پیش کیے جاتے ہیں۔ یہاں ایک دو مقالوں کے اقتباس درج کیے جاتے ہیں،۔ ہر مقالے میں سے کچھ عبارتیں چھوڑ دی گئی ہیں۔

(الف) زیب النساء کی ولادت

زیب النساء، اورنگ زیب کی سب سے پہلی اولاد تھی۔ اس کی ماں جس کا نام دلرس بانو بیگم تھا، شاہ نواز خاں صفوی کی بیٹی تھی، شاہ نواز کا اصلی نام بدیع الزماں ہے، جہاں گیر کے زمانے میں معزز عہدوں پر ممتاز ہو کر شاہ نواز خاں کے خطاب سے ملقب ہوا، شاہ جہاں کے زمانے میں بھی کارہائے نمایاں کیے چونکہ لیاقت ذاتی کے ساتھ عالی خاندان بھی تھا، شاہ جہاں نے ۱۰۴۷ھ میں جو کہ اس کی سلطنت کا دسواں سال تھا، اورنگ زیب کی شادی اس کی بیٹی سے کردی، چار لاکھ کا مہر باندھا گیا، طالب کلیم نے مادہ تاریخ کہا،

دو گوہر بیک عقد دوراں کشیدہ

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

زیب النساء شادی کے دوسرے سال شوال ۱۰۴۸ھ میں پیدا ہوئی۔ عالمگیری امراء میں عنایت اللہ خاں نہایت معزز عہدہ دار تھا، اس کی ماں حافظہ مریم قابل اور تعلیم یافتہ تھی۔ زیب النساء جب پڑھنے کے قابل ہوئی، تو اورنگ زیب نے اس کی تعلیم کے لیے حافظہ مریم کو مقرر کیا جس نے حسب دستور سب سے پہلے قرآن مجید کی تعلیم دی۔ زیب النساء نے قرآن مجید حفظ یاد کیا، جس کے صلے میں اورنگ زیب نے تیس ہزار اشرفی انعام میں دی۔

تمام تاریخیں اور تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ زیب النساء نے عربی اور فارسی کی تعلیم نہایت اعلیٰ درجہ کی حاصل کی تھی اور بڑے بڑے علماء، فضلا اس کی خدمت میں رہتے تھے، لیکن اس کے اساتذہ میں سے زیادہ مقرب اور باریاب ملا سعید اشرف ماژندرانی تھے، ملا سعید نقی مجلسی کے نواسے تھے۔ عالم گیر کے آغاز جلوس میں ایران سے آئے اور عالمگیر نے ان کو زیب النساء کی تعلیم کے لیے مقرر کیا، اس وقت زیب النساء کی عمر تقریباً اکیس برس کی تھی، اس سے قیاس ہوسکتا ہے کہ تیموریوں میں مستورات کی تعلیم کا سلسلہ کس قدر ممد ہوتا تھا۔ زیب النساء نظم ونثر میں ملا سعید ہی سے اصلاح لیتی تھی۔

ملا اشرف شاعر بھی تھے، اور شاعری ہی کے وصف سے مشہور ہیں۔

زیب النساء نے شادی نہیں کی، عام طور پر مشہور ہے کہ سلاطینِ تیموریہ لڑکیوں کی شادی نہیں کرتے تھے۔ اس غلط روایت کو یورپین مصنفوں نے بہت شہرت دی ہے، اور اس سے ان کو شاہی بیگمات کی بدنامی پھیلانے میں بہت مدد ملی ہے، لیکن یہ قصہ ہی سرے سے بے بنیاد ہے، خود عالمگیر کی دو بیٹیاں، زبدۃ النساء اور مہر النساء بیگم، سپر شکوہ اور ایرد بخش (پسر شہزادہ مراد) سے بیاہی گئی تھیں، چنانچہ مآثر عالمگیر میں دونوں شادیوں کی تاریخیں اور مختصر حالات لکھے ہیں اور خاتمہ کتاب میں بھی اس کا ذکر کیا ہے۔

زیب النساء نے ۱۱۱۳ھ میں جو عالمگیر کی حکومت کا اڑتالیسواں سال تھا، دلی میں انتقال کیا، ادخلی جنتی مادہ تاریخ ہے۔

فانی خاں نسخہ مطبوعہ کلکتہ میں زیب النساء کا نام اور اس کے واقعات ۱۱۲۲ھ تک آتے ہیں، لیکن یہ صریحی غلطی ہے کاتبوں نے غلطی سے زینت النساء کو زیب النساء سے بدل دیا ہے۔

کمالات علمی اور عام اخلاق وعادات

تمام مورخین نے بہ تصریح لکھا ہے کہ زیب النساء علوم عربیہ اور فارسی زباندانی میں کمال رکھتی تھی،

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

نستعلیق، نسخ اور شکستہ خط نہایت عمدہ لکھتی تھی، لیکن اس کی تصانیف سے آج کوئی چیز موجود نہیں، عام طور پر مشہور ہے کہ وہ مخفی تخلص کرتی تھی، لیکن یہ سچ نہیں، کسی تاریخ یا تذکرہ میں اس کے تخلص یا دیوان کا ذکر نہیں۔

اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ وہ شاعر تھی، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کلام ضائع ہوگیا، اسی تذکرہ میں ملا سعید اشرف کے حال میں لکھا ہے کہ زیب النساء کی بیاض خاص ایک خواص کے ہاتھ سے جس کا نام ارادت فہم تھا، حوض میں گر پڑی چنانچہ سعید اشرف نے اس پر ایک قطعہ لکھا جو آگے آئے گا، غالباً یہ اشعار کی بیاض ہوگی، تذکروں میں یہ دو شعر زیب النساء کے نام سے منقول ہیں۔

بشکند دستے کہ خم در گردن ہارے نشد
کور بہ چشمے کہ کذت گیر دیرارے نشد
صد بہار آخوشرو ہر گل بہ فرقے جا گرفت
غنچہ باغ دل مازیب وستارے نشد

زیب النساء کی تصنیفات وتالیفات سے زیب المنشآت کا ذکر البتہ تذکروں میں آیا ہے، تذکرۃ الغرائب کے مصنف نے لکھا ہے کہ ''میں نے اس کو دیکھا ہے'' یہ زیب النساء کے خطوط اور رقعات کا مجموعہ ہے۔

علم پروری

زیب النساء نے خود کوئی تصنیف کی ہو یا نہ کی ہو، لیکن اس سے اپنی نگرانی میں اہل فن سے بہت سی عمدہ عمدہ کتابیں تصنیف کرائیں۔

زیب النساء کا دربار حقیقت میں ایک اکاڈیمی (بیت العلم) تھی۔ ہر فن کے علماء اور فضلاء نوکر تھے۔ جو ہمیشہ تصنیف وتالیف میں مصروف رہتے تھے، یہ کتابیں عموماً اس کے نام سے موسوم ہوتی تھیں، یعنی ان کتابوں کے نام کا پہلا جز زیب کا لفظ ہوتا تھا، اس سے اکثر تذکرہ نویسوں کو دھوکا ہوا ہے، اور انھوں نے وہ کتابیں زیب النساء کی تصنیفات میں شمار کیں۔

زیب النساء نے جو کتابیں تصنیف کرائیں ان میں زیادہ قابل ذکر، تفسیر کبیر کا ترجمہ ہے، یہ مسلم ہے کہ تفسیروں میں امام رازی کی تفسیر سے زیادہ جامع کوئی تفسیر نہیں، اس لیے زیب النساء نے ملا صفی الدین اردبیلی کو جو کشمیر میں مقیم تھے، حکم دیا کہ اس کا فارسی میں ترجمہ کریں۔ چنانچہ اس کا نام زیب التفاسیر رکھا گیا۔ بعض

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

تذکرہ نویسوں نے غلط لکھ دیا کہ وہ زیب النساء کی مستقل تصنیف ہے۔

زیب النساء نے تصنیف و تالیف کا جو محکمہ قائم کیا تھا، اس کے ساتھ ایک عظیم الشان کتب خانہ کا ہونا بھی ضروری تھا، جس سے مصنفین فائدہ اٹھا سکیں، چنانچہ بیگم موصوف نے ایک نہایت عظیم الشان کتب خانہ قائم کیا، مصنف مآثر عالمگیری کا بیان ہے کہ اس کتب خانہ کی نظیر کسی کی نظر سے نہ گذری ہوگی، مصنف مذکور کے اصلی الفاظ یہ ہیں:-

''در سرکار علیہ کتاب خانہ گرد آمدہ بود کہ بہ نظر، ہیچ یکے در بنامدہ باشد'' (صفحہ ۵۳۹)

اخلاق و عادات

زیب النساء اگر چہ درویشانہ اور مصنفانہ مزاق رکھتی تھی، تاہم شاہجہان کی پوتی تھی، اس لیے نفاست پسندی اور امارت کے سروسامان بھی لازمی تھے، عنایت اللہ خاں امرائے عالمگیری میں مقرب خاص تھا، زیب النساء کا میر خانسامان تھا۔

۱۰۹۰ء میں ابرک کا ایک بڑا خیمہ تیار کرایا تھا، جو تمام تر شیشیہ معلوم ہوتا تھا، نعمت خان عالی نے اس کی تعریف میں ایک چھوٹی سی مثنوی لکھی۔

بھائیوں سے نہایت محبت رکھتی تھی، ۱۱۰۵ھ میں جب اعظم شاہ مرض استسقا میں سخت بیمار ہوا تو زیب النساء نے اس کی تیمارداری اس محبت سے کی کہ تمام ایام مرض تک اس پرہیزی غذا کے سوا جو خود شہزادہ کھاتا تھا، کوئی اور غذا نہیں کھائی، محمد اکبر جس زمانے میں عالمگیر سے باغی ہو کر راجپوتوں سے مل گیا تھا اس زمانے میں بھی زیب النساء نے اس سے برادرانہ راہ و رسم اور خط و کتابت ترک نہ کی، جس کے صلے میں اس کی تنخواہ اور جاگیر ضبط ہوگئی۔

زیب النساء کے متعلق جھوٹے قصے

زیب النساء کے متعلق متعدد جھوٹے قصے مشہور ہو گئے ہیں، جن کو یورپین مصنفوں نے اور زیادہ آب و رنگ دیا ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ زیب النساء اور عاقل خاں سے عاشقی اور معشوقی کا تعلق تھا، اور زیب النساء اس کو چوری چھپے سے محل میں بلایا کرتی تھی۔

عاقل خاں کا مفصل تذکرہ مآثر الامرا میں موجود ہے، اور چونکہ شاعر تھا، تمام تذکروں میں اس کے حالات مذکور ہیں، لیکن اس واقعہ کا کہیں نام و نشان نہیں، جن کتابوں میں اس کا حال مل سکتا تھا اور جو مستند اور

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

معتبر خیال کی جاتی ہیں حسب ذیل ہیں:-

عالمگیر نامہ، مآثر الامرا، مآثر عالمگیری، تذکرہ سدخوش خزانہ عامرہ، سرو آزاد، ید بیضا، ان کتابوں میں ایک حرف بھی اس واقعہ کے متعلق نہیں، حالانکہ اس کی وفات کا تذکرہ سب نے لکھا ہے جو ۱۱۰۷ھ میں واقع ہوئی۔

دوسرا واقعہ یہ مشہور ہے کہ ایک دفعہ زیب النساء نے یہ مصرع کہا:

از ہم نمی شود ز حلاوت جدا لبم

چاہتی تھی کہ مطلع ہو جائے لیکن دوسرا مصرع اس کی جوڑ کا موزوں نہیں ہوتا تھا، ناصر علی کے پاس مصرع لکھ کر بھیجا اس نے برجستہ کہا:-

از ہم نمی شود ز حلاوت جدا لبم
شاید رسید برلب زیب النساء لبم

لیکن جو شخص تیموریوں کے جاہ وجلال اور آداب وآئین سے واقف ہے، وہ سمجھ سکتا ہے کہ بیچارے ناصر علی کو خواب میں بھی اس گستاخی کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی۔[1]

دوسرا مقالہ:- تحفۃ الہند

مسلمانوں کی توجہ برج بھاشا پر۔ برج بھاشا کا فن معانی وبیان تحفۃ الہند جو ہمارے مضمون کا عنوان ہے، ایک کتاب کا نام ہے۔ جو اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں تصنیف ہوئی، مصنف کا نام میرزا خان بن فخر الدین محمد ہے، دیباچہ میں لکھا ہے کہ میں نے یہ کتاب شہنشاہ عالمگیر کے زمانہ میں شہزادہ اعظم شاہ کے لیے تصنیف کی۔ کتاب کا موضوع ہندوؤں کا فن بلاغت اور عروض وقافیہ وغیرہ ہے، اس میں ۷ باب ہیں۔

۱- پنگل یعنی علم عروض ۲- تک یعنی قافیہ
۳- النکار یعنی علم بدیع ۴- سرنگار یعنی عشق ومحبت
۵- سامررک یعنی علم قافیہ ۶- کوک یعنی علم النساء
۷- لغاب ہندی

اس میں برج بھاشا کے ضروری کثیر الاستعمال الفاظ لکھے ہیں اور ان کی معنی بتائے ہیں۔

---

[1] الندوۃ، جلد ۶، نمبر ۱۹، اکتوبر ۱۹۰۹ء صفحہ ۲۱

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

اس کتاب میں سے ہم صرف صنائع و بدائع کے حصہ کا اقتباس درج کرتے ہیں، جس سے اندازہ ہوگا کہ ہندی زبان کے فن بدیع کو عربی سے کیا نسبت ہے؟ اس موقع پر یہ بات بھی اظہار کے قابل ہے کہ مصنف نے ہندی صنائع و بدائع تفصیل سے لکھ کر چند صفتیں خود اضافہ کی ہیں، ان کے خود نام رکھے ہیں، اور صنعتوں میں خود ہندی اشعار کہہ کر درج کتاب کئے ہیں، جس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ مصنف کو خود اس زبان میں کہاں تک قدرت تھی، یہ صنائع اکثر بلکہ قریباً کل عربی سے لئے ہیں، اور عربی ناموں کا ترجمہ بھاشا میں کردیا ہے۔

بھاشا میں علم بدیع کو النکار کہتے ہیں، چونکہ بلاغت کا اصلی کام جذبات اور احساسات پر اثر ڈالنا ہے، اس لیے النکار کی تین قسمیں قرار دی ہیں۔

۱-نورس

اس میں تمام احساسات کا استقصاء کیا ہے اور ان کی نو قسمیں قرار دی ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

سرنگار رس

اس کی دو قسمیں ہیں۔ سنجوک، بیوک، سنجوک یعنی وصال وفراق۔

ہاسیہ رس = مسرت وخوشی، گرونارس = رحم وہمدردی، ویررس = شجاعت و بہادری، رودررس = غیظ وغضب، بھے رس = خوف وبیم، بی بھتس رس = نفرت وکراہت، شانت رس = سکون واطمینان، او بھت رس = استعجاب۔

عربی اور فارسی زبان میں اس قسم کی سائنٹفک تقسیم نہیں ہے۔ اور اس لحاظ سے ہندی کو فارسی اور عربی پر ترجیح ہے۔

۲-وے نیگ

کسی مضمون کو لطیف، نازک اور شوخ پیرایہ میں ادا کرنے کو کہتے ہیں، مثلاً عورت اپنے محبوب شوہر سے جو کسی اور عورت پر عاشق ہے کہتی ہے کہ پیارے! تیری پیشانی پر جو سرخی ہے، یہ تیری سرخ ٹوپی کا عکس ہے یا رقیبہ کی حنا کا اثر ہے۔

شوہر نے رقیبہ کے پاؤں پر پیشانی رگڑی ہے، جس سے پیشانی میں سرخی آگئی ہے، یہ وہ صنعت ہے، جس کو عربی میں تعریض کہتے ہیں۔

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

سنسکرت کا انشا پرداز اس صنعت کو اس قدر وسعت دیتا ہے کہ الفاظ اور عبارت کی ضرورت نہیں صرف حالت کا دکھا دینا بھی اسی صنعت میں داخل ہے۔

۳-اپمان

اس کے معنی تشبیہ کے ہیں، تشبیہ ایک نہایت لطیف صنعت ہے، عربی میں اس کو نہایت وسعت دی ہے، اور اس کی بہت سی قسمیں کی ہیں، بھاشا میں بعض باتیں تو مشترک، مثلاً میں مکہ ایمان یعنی جب تشبیہ کے الفاظ مذکور ہوں، مثل چوں، مثل وغیرہ۔

لپت اپمان

حرف تشبیہ مذکور نہیں لیکن مقدر ہے جیسے ''قند لب'' یعنی لب چوں قند اس کو عربی میں استعارہ کہتے ہیں۔

ورود ہابھاس النکار

یعنی عبارت کے معنی واقع میں صحیح ہوں، لیکن بظاہر غلط معلوم ہوں۔ جب ایک لفظ کے معنی مختلف ہوتے ہیں تو اس صنعت سے کام لیتے ہیں۔ مثلاً بھاشا میں سیام کالے کو بھی کہتے ہیں، اور معشوق کو بھی۔ اسی طرح لال سرخ کو بھی کہتے ہیں اور محبوب کو بھی، اب اگر یہ کہا جائے کہ ''سیام زرد ہے'' تو بظاہر غلط ہوگا، کیونکہ سیاہ چیز زرد نہیں ہوسکتی، لیکن اگر سام کے معنی محبوب کے لیے جائیں تو یہ جملہ صحیح ہوسکتا ہے۔

عربی میں اس صنعت کو نہایت وسعت دی ہے۔

سکارن اُت پریچھا

حسن تعلیل کو کہتے ہیں، یہ صنعت عربی اور فارسی میں بہت مستعمل ہے، بھاشا میں اس کے نہایت لطیف نئے نئے پیرائے ملتے ہیں، مثلاً چاند معشوق کا حسن چرا کر آسمان پر بھاگ گیا، اسی وجہ سے ہمیشہ چوروں کی طرح رات کو نکلتا ہے، فارسی کا شاعر کہتا ہے!

از شرم ابردان بلند تو ماہ نو
خودر چناں نمود کہ کس دید وکس نہ دید

یعنی معشوق کے ابرو کی شرم سے ماہ نو اس طرح چھپ کر نکلا کہ کسی نے دیکھا کسی نے نہیں دیکھا۔

اس موقع پر یہ نکتہ خاص لحاظ کے قابل ہے کہ اگر چہ ہمارے انشا پردازوں نے سنسکرت اور برج بھاشا کے علم ادب کے نکتہ کو سمجھا، اور اس سے بہت فائدہ اٹھایا لیکن اس کے خاص فیض سے وہی محروم رہ گیا، جو

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

سب سے زیادہ حقدار تھا یہ ظاہر ہے کہ اردو بھاشا سے نکلی اور اس کے دامن میں پلی لیکن بھاشا سے جو سرمایہ اس کو ملا صرف الفاظ تھے۔ مضامین اور خیالات سے اس کا دامن خالی رہا، بخلاف اس کے عربی زبان جس کو بھاشا سے کسی قسم کا تعارف نہ تھا، وہ سنسکرت اور بھاشا دونوں سے مستفید ہوئی۔

اس کی وجہ یہ ہوئی کہ آج سے ۵۰ برس پہلے مسلمان، اردو کو کوئی علمی زبان نہیں سمجھتے تھے، خط و کتابت تک فارسی میں تھی، اردو شعرا جس قدر گزرے ان میں سے ایک بھی عربی کا فاضل نہ تھا، یا یوں کہو کہ کوئی عالم اردو کو اس قابل نہیں سمجھتا تھا کہ اس میں انشا پردازی یا شاعری کا کمال دکھائے علمی زبان اس وقت صرف عربی تھی، اس لیے جہاں سے جو سرمایہ ملتا تھا، اسی کے خزانہ میں جمع کیا جاتا تھا، بہر حال ہندی شاعری کے مضامین عربی زبان میں بعینیہ نقل ہوئے، یعنی علمائے ادب نے سنسکرت اور بھاشا کی نظموں کا بعینیہ عربی میں ترجمہ کیا، ہم چند مثالیں ذیل میں لکھتے ہیں۔ یہ مثالیں سبحۃ المرجان سے لی گئی ہیں، ان میں مولوی غلام علی آزاد نے ہر جگہ تصریح کر دی ہے کہ وہ ہندی سے ترجمہ کی گئی ہیں۔

لقد غلت إنی یوم راح جیبها

إلی ان هوی من ساعر یها تضارها

ولما اتاها مخبو عن قدومها

علی ساعر الملان ضاق سولدها

(یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہندی میں عاشق عورت ہے، اور مرد معشوق ہے)

یعنی جس دن معشوق نے سفر کیا، میں اس قدر دبلی ہوگئی کہ ہاتھ کے کڑے ڈھیلے ہو کر گر پڑے، لیکن جس دن قاصد نے آکر معشوق کے آنے کی خبر دی، اور میں نے کڑوں کو پہنانا چاہا تو اب وہ تنگ ہو گئے اور چڑھتے نہ تھے۔

ماه فی مسفتیک کمل رابق

انی انینه بحسن بیان

ختمت علی مشفتیک ذات بدلل

کیلاتعلمی علی اه حیان

''واقعہ یہ ہے کہ شوہر، کسی اور محبوبہ سے مل کر آیا، اور چونکہ اس نے اسی سرمگیں آنکھوں کو چوما، اس لیے

Maulana Azad Library, Aligh Muslim University

اس کے ہونٹوں پر سیاہی لگ گئی ہے، اب عورت شوہر سے کہنے آئی ہے کہ تیرے ہونٹوں پر جو سیاہی ہے، میں بتاؤں کیوں ہے، اور کہاں سے آئی ہے، کسی کافر ادا نے تیرے ہونٹوں پر مہر کردی ہے کہ تو کبھی مجھ سے بات نہ کرے''[1]

جن دو مقالوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ان میں پہلے مقالے میں علامہ شبلی نے اورنگزیب عالم گیر کی سب سے بڑی بیٹی زیب النساء کی پیدائش، اس کی تعلیم، اس کے اخلاق، اس کی علم پروری، اس کے خلاف جو جھوٹے قصے مشہور تھے، ان کا ذکر کیا ہے اور مغل شہنشاہوں پر لگائے جانے والے جھوٹے الزامات کی مدلل تردید کی ہے۔ دوسرے مقالہ میں اورنگزیب پر تعصب کا جو الزام تھا کہ اس نے اپنے عہد حکومت میں ہندوؤں کے مدارس اور مندر اور پاٹھ شالے بند کروادیے تھے، علامہ شبلی نے ان الزامات کو تاریخ کی روشنی میں رفع کیا ہے، اس کی مثال یہ مضمون ہے، جو ''تحفۃ الہند'' کے نام سے مشہور ہے۔ اس مضمون میں تفصیل کے ساتھ ہندوؤں کے فن بلاغت اور عروض وقافیہ کا ذکر کیا ہے۔

---

[1] الندوہ فروری ۱۹۱۱ء

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

تیسرا باب

شبلی کی تنقید نگاری ۱۰۱-۱۶۷

ا- تنقید کی زبان اور اسلوب

ب- شعر العجم کا تنقیدی جائزہ

ج- موازنۂ انیس و دبیر اور عملی تنقید کے مطالبات

ح- موازنۂ انیس و دبیر پر اعتراضات کا ادبی محاکمہ

د- خطبات اور مقالات میں ادبی تنقید کا جائزہ

Maulana Azad Library, Aligrh Muslim University

۱- تنقید کی زبان اور اسلوب

ادب اور تنقید میں بہت گہرا تعلق ہے۔تنقید کی مدد سے ادب کی پیروی ہوتی ہے ادب سے جدا ہو کر یہ زندہ نہیں رہ سکتی ہے۔جس زبان میں ادب نہیں پایا جاتا ہے یا اس کا معیار بہت پست ہوتا ہے۔تو اس زبان میں تنقید کی نشو ونما نہیں ہوسکتی ہے۔ پہلے ادب جنم لیتا ہے اس کے بعد تنقید،تنقید نگار کے اصول فن ادبی کارناموں سے ماخوذ ہوتے ہیں۔اردو میں ایک لمبے عرصے تک ادب اور شاعری مترادف رہے۔اور غزل کو شاعری کے سر کے تاج کی حیثیت حاصل رہی ساری دنیا غزل کی پراگندگی کے بارے میں جانتی ہے۔

اس کمی کا احساس مطمح نظر کی بلندی کے ساتھ بڑھتا گیا۔لیکن پراگندئ تخیل نے فطرت ثانی کی حیثیت حاصل کر لی تھی بنیادی اصول کی طرف کسی بھی نقاد نے دھیان نہیں دیا یہ ایک ''گناہ'' کے مترادف تھا جس سے نجات حاصل کرنے کے لیے ضروری تھا کہ اس سے دور رہا جائے۔تنقید ایک فن ہے اس سے سب ہی واقف ہیں۔لیکن غلطی سے بھی کسی نے اس کے بارے میں معلومات حاصل نہیں کی۔ادب کو لوگوں نے دل بہلانے کا ذریعہ بنالیا تھا اور تنقید کی حیثیت بھی لغو ولایعنی کی بنی رہی۔

تنقید کی ماہیت کسے کہتے ہیں؟اس کے فنی اصول کون کون ہیں؟یہ سوالات کسی کے بھی ذہن میں نہیں آئے جب سوالات ہی ذہن میں نہیں ہیں تو ان کا حل کہاں سے آئے گا۔اگر کسی وقت اس کا خیال آیا تو مشرقی یا مغربی زبانوں سے کچھ مستعار لے لیا۔یہی اودھار لی ہوئی باتیں زندگی اور ادب کے رشتہ،شاعری کی اہمیت اور حیثیت اور ادب کی ماہیت کے سلسلے میں بھی ملتی ہیں۔لیکن یہ قطعاً ناکافی ہیں۔مستعار لیے ہوئے نظریات،خیالات اور باتوں کا معیار سطحی ہوتا ہے اور یہ لی بھی سطحی طرح سے جاتی ہیں۔ان میں مفہوم کو سمجھنے کی صلاحیت کا بھی فقدان ہوتا ہے۔ اسی بنا پر اس کے صحیح مفہوم کو بیان نہیں کیا جاسکتا ہے فکر کی آزادی کی روشنی میں ان نظریوں کو دیکھنے کی استعداد ہمارے اندر موجود نہیں ہے۔جزئیات کے بیان میں ناکامیابی کی

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

وجہ بنیادی اصول سے بے اعتنائی اور بے خبری ہے۔صحیح ،اچھے اور بلند معیار سے بے خبر ہونے کی وجہ اعلیٰ تنقید کارناموں کی کمی ہے۔

اردو تنقید کو مشاعروں سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔مشاعروں میں شعروں کی مذمت یا مدح شعریت یا عدم شعریت کی بنا پر نہیں ہوتی ہے۔مدح اور مذمت دونوں کی وجہ غیر متعلق ہوتی ہے۔یہی صورت حال تنقید کی بھی ہے۔اگر تعریف کرنی شروع کردیں تو زمین آسمان ایک کردیتے ہیں اور اگر کمی نکالنے پر آجائیں تو اس میں بھی حد سے گزر جاتے ہیں۔اسی کا نام تنقید ہے۔کوئی بھی لکھنے والے کے مقصد کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا۔اس بات کا اندازہ تک نہیں لگایا جاتا ہے کہ اس کو اپنے مقصد میں کہاں تک کامیابی حاصل ہوئی۔اس تنقید کا کیا معیار ہونا چاہیے؟ تنقید کی زبان اور اسلوب کیسا ہونا چاہیے؟

اردو کے ممتاز نقادوں میں شبلی کا نام بہت نمایاں ہے۔اردو تنقید کی باقاعدہ ابتداء یا باقاعدہ آغاز وارتقاء میں شبلی نے اہم خدمت انجام دی ہے ابتدائی دور کے تنقید نگاروں میں شبلی کے ساتھ آزاد اور حالی کے نام خصوصیت کے ساتھ لیے جاسکتے ہیں۔ان دونوں نقادوں کے مقابلے میں شبلی کی تنقید کا انداز جداگانہ ہے۔اس میں کوئی دورائے نہیں کہ اس کی اپنی مخصوص انفرادیت ہے اور اس نے اردو تنقید کو ایک نئی راہ دکھائی ہے۔آزاد کی تنقید ایک ہی اسلوب کے سہارے آگے بڑھتی ہے۔اس میں محض انداز نگارش کی کارفرمائی ہے۔آزاد بہت ہی پرلطف فقرے استعمال کرتے ہیں اور ان کی وجہ سے بعض تنقیدی حقائق کی نقاب کشائی ہوتی ہے۔آزاد کا مزاج تجزیاتی نہ ہونے کی وجہ سے ان کی تنقید کا اندازہ تجزیاتی نہیں ہے۔اس کے بالمقابل حالی کا مزاج تجزیاتی تھا۔اس بنا پر ان کی تنقید میں تجزیہ کا عنصر حاوی ہے۔حالؔی نے موضوع کے کسی بھی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑا۔ان کی تنقید کو معاملہ فہمی کی عمدہ مثال قرار دیا جاسکتا ہے اور اس سے ہمارے اندر بصیرت کا احساس پیدا ہوتا ہے لیکن اسلوب اور انداز نگارشش کا حسن حالؔی کی تنقید میں کم ملتا ہے اس میں اسلوب کی وہ دلکشی نہیں پائی جاتی جو محمد حسین آزاد کا حصہ ہے۔حالؔی کی تمام تر تنقید میں حقائق کی تلاش اور اس کا تجزیہ ہے۔اس میں بصیرت تو ہے لیکن اس میں بذاتِ خود حسن موجود نہیں ہے۔اسلوب کا حسن شبلی کی تنقید میں پایا جاتا ہے۔لیکن شبلی کی تنقید کا حسن فقط اسلوب تک محدود نہیں ہے۔اس کا انداز حالؔی کی طرح تجزیاتی بھی نہیں ہے۔شبلؔی کی تنقید کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ اس میں بصیرت اور حسن کا خوشگوار امتزاج ملتا ہے اور اسی کو شبلی کی سب سے بڑی خوبی کہا جاسکتا ہے۔

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

شبلی صرف نقاد نہیں ہیں۔ ان کی فطرت میں شاعری کا رنگ بھی پایا جاتا ہے۔ اسی لیے اس میں وہ دل آویزی ہے جو جذبے اور تخیل کے باہمی امتزاج سے وجود میں آتی ہے۔ شبلی کا شمار جذبے کے پرستاروں اور تخیل کے علم برداروں میں ہوتا ہے اس صورت حال کی وجہ سے ان کا مزاج رومانی ہو گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے ان کی تنقید بھی متاثر ہوگی اور اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے کہ جگہ جگہ ان کی تنقید میں رومانیت کی جھلک ملتی ہیں۔ علامہ اردو کے سب سے پہلے رومانی نقاد ہیں۔ اور رومانی رنگ و آہنگ سے اردو تنقید کو سب سے پہلے علامی شبلی نے ہی آشناء کیا۔

اردو ادب میں علامہ کی بیک وقت بہت سی حیثیتیں ہیں۔ وہ ایک عالم، ایک مؤرخ، ایک سوانح نگار، ایک ماہر زبان، ایک شاعر اور ایک نقاد ہیں۔ غرض علامہ کی شخصیت خاصی ہمہ گیر، وسیع، متنوع اور پہلو دار ہے اور اس کے اثرات ان کی تنقید پر بھی پڑتے ہیں۔ یہ عالمانہ ہے اور اس میں تاریخی شعور بھی پایا جاتا ہے۔ انفرادی اور اجتماعی نفسیات کی جھلکیاں بھی ان کے یہاں ملتی ہیں اس میں زبان کے مختلف پہلوؤں کی طرف بھی توجہ کی گئی ہے اور اس میں شاعرانہ زاویۂ نظر کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ علامہ کی تنقید ان عناصر کی وجہ سے کافی ہمہ گیر، وسیع اور پہلو دار ہو گئی ہے۔

علامہ کا مزاج فلسفیانہ تو نہیں تھا لیکن اتنا ضرور ہے کہ زندگی کے حقائق کی تلاش و جستجو مختلف علوم کی مدد سے کرنا، ان کے مزاج کی اہم خصوصیت ہے۔ لہٰذا ان کی تنقید میں یہ خصوصیت صاف طور پر نظر آتی ہے۔ تنقید کو نقاد کی افتاد طبع اور مزاج کا عکس تسلیم کیا جاتا ہے۔ علامہ کا مزاج جذبے، عقل اور علم کا سنگم ہے۔ ان کی تنقید میں بھی ان سب کا متوازن امتزاج صاف نظر آتا ہے۔ اس میں زندگی کے ذوقی اور جمالیاتی پہلوؤں کا بھی رنگ بھرا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ انسانی زندگی کے جذباتی نظام کا بڑا دخل نظر آتا ہے، یہ ایک تہذیبی روایت کے پس منظر میں ابھرتی ہے۔ اس میں علمیت ہے اور اس میں گہرا تاریخی اور معاشرتی شعور ہے۔ اور یہی اس کی ایسی خصوصیت ہے جو شبلی کی انفرادیت کو نمایاں کرتی ہے۔

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا ہے کہ علامہ شبلی کا تنقیدی شعور بہت گہرا تھا۔ اس تنقید شعور کو پیدا کرنے میں ان کے انفرادی اور اجتماعی حالات کا بڑا حصہ ہے۔ انھیں زندگی سے محبت تھی انھوں نے زندگی کی حقیقتوں کو برتا تھا۔ علامہ اس کو برتنے اور بسر کرنے کی خواہش بھی رکھتے تھے۔ ان کی طبیعت میں انفعالیت نہیں تھی۔ علامہ کبھی بھی زندگی سے بیزار نہیں ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے زندگی کے کسی بھی پہلو کو نظر انداز

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

نہیں کیا۔ علامہ زندگی کے نشیب وفراز کو جاننے اور اس کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کے خواہش مند تھے۔ مختلف علوم کو سیکھنے میں شبلی نے خاص انہماک سے کام لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں سے اکثر علوم پر انھیں دسترس حاصل تھی۔ وہ ایک جید عالم تھے۔ تہذیب اور تاریخ سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ اس کے اتار چڑھاؤ سے پوری طرح واقف تھے۔ علامہ کو ادب وشعر سے گہری مناسبت تھی۔

علامہ نے عربی اور فارسی کا مطالعہ خصوصیت کے ساتھ کیا تھا اور ان کی روح تک ان کی رسائی تھی۔ مغربی ادب سے بھی خاص واقفیت تھی۔ ان کے تنقیدی شعور کو ان حالات نے نکھارا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی علامہ کے سماجی اور اجتماعی ماحول نے بھی ان کے تنقیدی شعور کو فروغ دینے میں مدد دی۔ اس عہد میں خوش قسمتی سے مسلمانوں کو سرسید کی قیادت حاصل ہوئی۔ سرسید کی قیادت میں مسلمانوں کو ہر اعتبار سے ایک نئی زندگی سے ہم کنار ہونے کا موقع ملا۔ مثلاً مسلمانوں کی دینی، معاشرتی، تہذیبی، علمی اور تعلیمی ترقی کی ابتداء اس زمانے میں ہوئی۔ لہٰذا مسلمانوں میں خوشنما بدلاؤ آنا شروع ہوا۔ شبلی پر بھی اس ماحول کا اثر تھا۔ بعض باتوں میں انھیں سرسید سے اختلاف بھی تھا۔ علامہ انگریزوں کی مخالفت میں بہت آگے آگے رہتے تھے لیکن سرسید کی تحریک سے مسلمانوں میں جو نشاۃ الثانیہ کی داغ بیل پڑی تھی، علامہ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ مغربی تہذیب کی وجہ سے جو خیالات عوام کی زندگی پر اثر ڈال رہے تھے۔ بظاہر تو علامہ ان سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے۔ لیکن ان خیالات کی وجہ سے جو فضا تیار ہوئی تھی۔ اس سے علامہ اپنے آپ کو پوری طرح نہ بچا سکے سرسید کے عہد میں انھیں حالات کے زیر اثر علامہ کی تنقید جنم لیتی ہے اور اس تنقیدی شعور کے مختلف محرکات کی جھلکیاں ہم علامہ کی تنقید میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔

علامہ نے تنقید کے دونوں پہلوؤں یعنی عملی اور نظری کی طرف یکساں توجہ دی ہے۔ شاعری کی تنقید ان کا خاص میدان ہے۔ علامہ نے شاعری پر عملی تنقید بھی کی ہے، اصناف سخن کے اصول بھی مرتب کیے ہیں اور شاعری کے اصولوں سے بھی بحث کی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے ان کی تصنیف شعر العجم کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ شعر العجم پانچ جلدوں پر مشتمل ہے۔ چوتھی جلد میں شبلی نے نظریاتی اور اصولی تنقید سے بحث کی ہے۔ اس جلد میں علامہ نے اصناف سخن کا تنقیدی جائزہ لیا ہے اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر بصیرت افروز تنقیدی بحث کی ہے۔ باقی جلدوں میں علامہ نے فارسی شعراء اور فارسی شاعری کے مختلف رجحانات کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ غرض علامہ نے شعر العجم میں عملی اور نظری تنقید کے بہت اچھے نمونے پیش کیے ہیں اور اس سے شبلی کے

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

تنقید شعور کا اندازہ ہو پاتا ہے۔

''موازنۂ انیس و دبیر'' بھی تنقیدی اعتبار سے ان کی اہم تصنیف ہے۔ اس میں مرثیہ نگاری کے فن پر اصولی بحث کی گئی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی تقابلی مطالعہ کے لیے انیس و دبیر کے مراثی کا جائزہ لیا گیا ہے۔ علامہ نے انیس کے کلام پر خاص توجہ دی ہے۔ اور ان کے کلام کی مختلف خصوصیات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے حالانکہ اس میں انھوں نے توضیحی اور تشریحی انداز اختیار کیا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی اس میں اعلیٰ درجے کی تنقید کے نمونے بھی ملتے ہیں اس کتاب کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں علامہ نے فصاحت اور بلاغت کے مختلف پہلوؤں پر نظریاتی اور اصولی اعتبار سے عالمانہ گفتگو کی ہے۔ ادبی تنقید کی تاریخ میں اس کتاب کی بہت اہمیت ہے۔

شبلی تمام عالم کو ایک شعر تصور کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی میں چاروں طرف شاعری ہی شاعری ہے۔ شبلی کا ماننا ہے جہاں زندگی ہے وہاں شاعری ہے اور جہاں شاعری ہے وہاں زندگی ہے اس سلسلے میں علامہ ایک یورپین مصنف کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:-

> ''ہر چیز جو دل پر استعجاب یا حیرت یا جوش اور کسی قسم کا اثر پیدا کرتی ہے۔ شعر ہے۔ اس بنا پر فلک نیلگوں، نجم درخشاں، نسیم سحر، گلگونۂ شفق، تبسم گل، جزام صبا، نالۂ بلبل، ویرانیٔ دشت، شادابیٔ چمن غرض تمام عالم شعر ہے۔''[1]

غرض شعریت کا عنصر ساری کائنات میں بکھرا ہوا ہے جس طرح یہ مناظر ہمارے دل پر اثر انداز ہوتے ہیں بالکل اسی طرح شاعری بھی ہمارے دل پر اثر انداز ہوتی ہے۔ مصوری، موسیقی اور صنعت گری بھی ہمارے دل پر اثر کرتی ہے۔ لیکن شاعری کا اثر زیادہ ہمہ گیر ہوتا ہے ایک جگہ علامہ شبلی لکھتے ہیں:-

> ''جو چیزیں دل پر اثر کرتی ہیں بہت سی ہیں مثلاً موسیقی، مصوری، صنعت گری وغیرہ لیکن شاعری کی اثر انگیزی کی حد سب سے زیادہ وسیع ہے۔ موسیقی صرف قوت سامعہ کو محظوظ کرسکتی ہے۔ سامعہ نہ ہو تو وہ کچھ کام نہیں کرسکتی۔ تصویر سے متاثر ہونے کے لیے بینائی شرط ہے لیکن شاعری تمام حواس پر اثر ڈالتی ہے، باصرہ، ذائقہ، شامہ، لامسہ، سب اس سے لطف اٹھاتے ہیں۔ فرض کرو شراب آنکھوں کے سامنے نہیں ہے۔ اس لیے آنکھ

---

[1] شبلی نمبر ادیب ستمبر ۱۹۶۰ء صفحہ ۲۱۱

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

اس سے حظ نہیں اٹھا سکتی ہیں۔لیکن جب ایک شاعر اس کو آتش سیال سے تعبیر کرتا ہے تو ان الفاظ سے ایک موثر منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اس طرح جب بوسے کو شاعرانہ انداز میں تنگ شکر کہہ دیتے ہیں تو کان وزبان کو مزہ محسوس ہوتا ہے۔''[1]

اس سے صاف طور پر یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ شبلی کی نظر میں شاعری کی اہمیت ساری چیزوں سے زیادہ ہے۔ یہ حواس سے تعلق رکھتی ہے۔اور ایک ہی وقت میں مختلف حواس کو متاثر کرتی ہے اور یہی اس کا بنیادی وظیفہ قرار دیا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ شاعری کا عمل دخل ہماری زندگی میں بہت زیادہ ہے اور ہمیں دوسرے فنون لطیفہ کے مقابلے میں شاعری سے زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔ اس سے ہمیں زیادہ لطف حاصل ہوتا ہے۔

شاعری کا تعلق جذبات سے ہے۔شاعری سے ہمارے جذبات میں ایک ہل چل پیدا ہو جاتی ہے اور اس سے جذبات تحریک میں آجاتے ہیں۔اس کو سننے یا پڑھنے کے بعد ہمارے اوپر جوش،خوشی یا رنج کی کیفیت چھا جاتی ہے۔علامہ لکھتے ہیں:-

''اسی لیے وہ سائنس اور دوسرے علوم وفنون سے ممتاز ہے۔شاعری کا تعلق جذبات سے ہے اور سائنس کا یقین سے۔سائنس استدلال سے کام لیتی ہے اور شاعری محرکات کو استعمال کرتی ہے۔ سائنس عقل کے سامنے کوئی علمی مسئلہ پیش کرتی ہے لیکن شاعری احساسات کو دلکش مناظر دکھاتی ہے۔''[2]

اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ شاعری تمام تر داخلی نوعیت رکھتی ہے۔شاعری میں دل کی باتیں بیان کی جاتی ہیں۔شاعر کو احساسات کی نیرنگیوں کا پورا ادراک ہوتا ہے۔یہ خصوصیات مؤرخ اور خطیب میں نہیں پائی جاتی ہیں۔اسی بنا پر تاریخ اور خطابت،شاعری سے اتنی الگ ہوتی ہیں۔تاریخ کا مقصد واقعات کی صداقت کے ساتھ پیش کرنا ہوتا ہے،خطابت میں لوگوں سے خطاب کیا جاتا ہے اور مخاطب کو کسی بات پر اکسایا جاتا ہے لیکن شاعر ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں رکھتا ہے۔شاعر صرف انسانی جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔شاعر کا مقصد دل میں پیدا ہونے والے جذباب،احساسات کو الفاظ کا جامعہ پہنانا ہوتا ہے۔شبلی صاف طور پر لکھتے ہیں:-

---

[1] شبلی نمبر ادیب ستمبر ۱۹۶۰ء صفحہ ۲۱۱

[2] شبلی نمبر ادیب ستمبر ۱۹۶۰ء صفحہ ۲۱۱

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

''اصلی شاعر وہی ہے جس کو سامعین سے کچھ غرض نہ ہو۔''[1]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعری کرتے وقت شاعر عوام کو سامنے نہیں رکھتا ہے۔ شاعر اپنی مخصوص کیفیات میں شعر کی تخلیق کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ شبلی اس کو مطالعہ نفسی اور تنہا نشینی کا نتیجہ مانتے ہیں۔ شاعری عوام پر اثر انداز ہوتی ہے لیکن شاعر کا مقصد عوام کو متاثر کرنا نہیں ہوتا ہے۔ شاعر تو اپنی داخلی کیفیات کا جمالیاتی اظہار کرتا ہے اور اسی کو شاعری کی اصل روح مانا جاتا ہے۔

یہ جمالیاتی اظہار شاعر مختلف عناصر کی مدد سے کرتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ شاعری کی تشکیل ہی ان عناصر سے ہوتی ہے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔

شبلی رقم طراز ہیں:-

''ایک شعر میں بہت سی عمدہ باتیں پائی جاتی ہیں۔ اس میں وزن ہوتا ہے۔ محاکات ہوتی ہے یعنی کسی چیز یا کسی حالت کی تصویر کھینچی جاتی ہے۔ خیال بندی ہوتی ہے۔ الفاظ سادہ اور شیریں ہوتے ہیں۔ بندش صاف ہوتی ہے۔ طرزِ ادا میں جدت ہوتی ہے۔''

لیکن ''حقیقت یہ ہے کہ شاعری دراصل دو چیزوں کا نام ہے، محاکات اور تخیل۔ ان میں سے اگر ایک بات بھی پائی جائے تو شعر کہلانے کا مستحق ہوگا۔ باقی اوصاف یعنی سلاست، صفائی، حسن بندش وغیرہ شعر کے حقیقی اجزاء اصلی نہیں بلکہ عوارض اور مستحسنات ہیں۔''[2]

اس سے ایک بات تو صاف ہو جاتی ہے کہ علامہ شعر و شاعری کے بنیادی عناصر پر نظر رکھتے ہیں۔ محاکات کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

''محاکات کے معنی کسی چیز یا کسی حالت کا اس طرح ادا کرنا ہے کہ اس شے کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے۔''[3]

لیکن تصویر اور محاکات دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ شبلی کا ماننا ہے کہ تصویر کی اصل خوبی یہ ہے کہ وہ اصل کے ساتھ مطالعہ مطابقت رکھتی ہو۔ اور اگر مصور میں اس بات کی صلاحیت ہے تو تبھی اس کو صحیح معنوں

---

[1] شبلی نمبر ادیب ستمبر ۱۹۶۰ء صفحہ ۲۱۱

[2] شبلی نمبر ادیب ستمبر ۱۹۶۰ء صفحہ ۲۱۲

[3] شبلی نمبر ادیب ستمبر ۱۹۶۰ء صفحہ ۲۱۲

Maulana Azad Library, Aligrh Muslim University

میں مصور کہا جا سکتا ہے۔ لیکن شاعر کے سامنے دو مشکل مرحلے آتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ اصل کی پوری تصویر نہیں کھینچ سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح کی پوری مطابقت، احساسات کو برانگیختہ نہیں کر پاتی ہے۔ دوسری یہ کہ وہ اصل سے بھی اپنے کو بہت زیادہ دور نہیں رکھ سکتا ہے۔ کیونکہ اس صورت میں اعتراض یہ ہے کہ تصویر صحیح طرح نہیں کھینچی۔ اس دشواری پر قابو پانے کے لیے شاعر کو تخئیل کی ضرورت پڑتی ہے۔ تخئیل کی مدد سے وہ ایسی تصویر کھینچتا ہے جو اصل سے بھی زیادہ خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔ وہ قوتِ متخیلہ سے یہ دکھانے کی کوشش کرتا ہے کہ یہ وہی شے ہے جس کو پہلے پیش کیا جا چکا ہے۔ اس اعتبار سے شاعر، مصور سے زیادہ باکمال ہوتا ہے۔ اسی صورت حال کو محاکات کہتے ہیں۔ جب شاعر میں یہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے تو محاکات اپنے کمال پر پہنچ جاتا ہے۔ اعلیٰ شاعری کا واحد مقصد یہی ہے کہ اس سے حقیقت کی ترجمانی ہو اور حقیقت کی اس ترجمانی میں محاکات کو اپنے کمال پر نظر آنا چاہئے۔

اس موقع پر علامہ شبلی نے تخئیل پر خیال افروز بحث کی ہے۔ ان کا خیال ہے:-

> ''تخئیل دراصل قوت اختراع کا نام ہے۔ عام لوگوں کے نزدیک منطق اور فلسفے کا موجد صاحب تخئیل نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ خود کسی فلسفہ داں کو اس لقب سے خطاب کیا جائے تو اس کو عار آئے گا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ فلسفہ اور شاعری میں قوت تخئیل کی یکساں ضرورت ہے۔ یہی قوت تخئیل ہے جو ایک طرف فلسفہ میں ایجاد اور اکتشاف مسائل کا کام دیتی ہے اور دوسری طرف شاعری میں شاعرانہ مضامین پیدا کرتی ہے۔''[1]

پیش رو نقادوں نے تخئیل کا جو تصور پیش کیا ہے یہ وہی تصور رہے اس بات پر سب متفق ہیں کہ تخئیل انسان میں پائی جانے والی غیر معمولی صلاحیت ہے۔ جس سے زندگی تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔ انھیں حقائق کو شاعری کے موضوعات اور مضامین کہا جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ جمالیاتی انداز میں ان حقائق کو بیان کرتا ہے تاکہ اس کا اثر ہم پوری طرح قبول کر سکیں۔ اسی کو شبلی جذباتِ انسانی کی تحریک کہتے ہیں۔ یہ تحریک ہمیں سائنس اور فلسفہ سے حاصل نہیں ہو پاتی ہے۔ ان موضوعات پر بحث کرتے ہوئے علامہ لکھتے ہیں:-

> ''فلسفہ اور سائنس میں قوت تخئیل کا استعمال اس غرض سے ہوتا ہے کہ کسی علمی مسئلے کو حل کیا جائے۔ لیکن شاعری میں فلسفی کو صرف ان موجودات سے غرض ہے جو واقع میں موجود ہیں

---

[1] شبلی نمبر ادیب ستمبر ۱۹۶۰ء صفحہ ۲۱۳

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

بخلاف اس کے شاعران موجودات سے بھی کام لیتا ہے جو موجود نہیں۔ فلسفے کے دربار میں، ہما سیمرغ، گاؤزمیں، تخت سلیمان کی مطلق قدر نہیں لیکن یہی چیزیں ایوان شاعری کے نقش ونگار میں۔ فلسفی کی زبان سے اگر سیمرغ زریں پر کا لفظ نکل جائے تو ہر طرف سے ثبوت کا مطالبہ ہوگا۔ لیکن شاعر اس قسم کی فرضی مخلوقات سے اپنا عالم خیال آباد کرتا ہے اور کوئی اس سے ثبوت کا طالب نہیں ہوتا۔ کیونکہ فلاسفر کی طرح وہ کسی مسئلے کی تعلیم کا دعویٰ نہیں کرتا بلکہ وہ ہم کو صرف خوش کرنا چاہتا ہے اور بے شبہ وہ اس میں کامیاب ہوتا ہے۔''[1]

اس طرح علامہ شبلی نے سائنس اور فلسفے کو سامنے رکھ کر تخیل کی ماہیت پر بہت ہی کارآمد بحث کی ہے اور شاعری میں اس کی اہمیت کو بتایا ہے۔ اس بحث سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ تخیل شاعری کا اہم جزو ہے۔ اس کے بغیر شاعری نامکمل ہے۔

تخیل اور محاکات کی حیثیت لازم وملزوم کی سی ہے۔ محاکات کا وجود تخیل کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ علامہ شبلی نے محاکات کو حقیقتاً جمالیاتی اظہار کے روپ میں پیش کیا ہے۔ جس میں تاثر کا سحر ملتا ہے۔ محاکات کے تحت انھوں نے ان سبھی باتوں کو لیا ہے جن کی بدولت شاعری وجود میں آئی ہے اور اس میں تاثیر پیدا ہوتی ہے۔ شبلی کا ماننا ہے کہ کئی چیزیں مل کر محاکات کی تکمیل کرتی ہیں اس میں اول تو شعر کا وزن اور آہنگ ہے۔ شاعرانہ خیال کا خود ایک وزن اور آہنگ ہوتا ہے اور اس کا جمالیاتی اظہار بھی اسی وزن اور آہنگ کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے۔ اسی وجہ سے خیال اور معنی کا پرتو فن کی صورت میں نظر آتا ہے۔ علامہ لکھتے ہیں:-

''محاکات جب موزوں کلام کے ذریعہ سے کی جائے تو سب سے پہلے وزن کا تناسب شرط ہے یہ ظاہر ہے کہ درد، غم، رنج، غضب، ہر ایک کے اظہار کا لہجہ اور آواز مختلف ہے۔ اس لیے جس جذبہ کی محاکات مقصود ہو، شعر کا وزن بھی اسی کے مناسب ہونا چاہیے تاکہ اس جذبے کی پوری حالت ادا ہو سکے۔ دوسری چیز جو محاکات کے اثر کو دوبالا کرتی ہے ایسی باتوں کی ترجمانی ہے جو بذاب خود لطیف اور دلآویز ہوں تاکہ ان کا اثر گہرا اور ہمہ گیر ہو۔

تیسری چیز الفاظ کا موضوع کی مناسبت کے ساتھ استعمال ہے تاکہ جس چیز کی محاکاتی تصویر

---

[1] شبلی نمبر ادیب ستمبر ۱۹۶۰ء صفحہ ۲۱۳

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

پیش کی جائے۔ وہ زیادہ اجاگر ہوکر موثر بن جائے۔ چوتھی چیز طرز ادا اور لہجے کا خیال ضروری ہے تاکہ جس ماحول کی تصویر کھینچی جارہی ہے وہ اصل سے قریب ہو اور خاطر خواہ اثر کرے۔''[1]

جمالیاتی اظہار یا محاکات کے لیے یہ ضروری ہے کہ کائنات کی ہر شے کا مطالعہ بغور کیا جائے۔ کیونکہ ایسا نہ ہونے پر شاعر سے غلط باتیں صادر ہونے کا خطرہ ہے۔ شبلی لکھتے ہے:-

''محاکات کے کمال کے لیے عالم کائنات کی ہر قسم کی چیزوں کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ شاعر کبھی لڑائیوں اور معرکوں کا حال لکھتا ہے۔ کبھی قوموں کے اخلاق و عادات کی تصویر کھینچتا ہے، کبھی جذبات انسانی کا عالم دکھاتا ہے، کبھی شاہی درباروں کا جاہ وحشم بیان کرتا ہے، کبھی ٹوٹے پھوٹے جھونپڑوں کی سیر کراتا ہے۔ اس عالم میں اگر اس نے عالم کائنات کا مطالعہ نہ کیا اور ایک ایک چیز کی خصوصیات اور قابل انتخاب باتوں کو دقت آفرینی سے نہ دیکھا تو وہ ان مرحلوں کو کیونکر طے کرسکتا ہے۔''[2]

یہی وجہ ہے کہ وہ جزئیات کے مطالعہ پر زور دیتے ہیں۔ شاعران جزئیان کو پیش کرنے کے لیے مختلف طریقے اختیار کرتا ہے۔ ایک ایک چیز کی تفصیل بیان کرنا اس کے لیے ضروری نہیں ہے۔ اشاروں کنایوں میں ہی وہ بات کو اس طرح کہتا ہے کہ پوری تصور ہماری آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب جزئیات پر اس کی نظر ہو۔ اگر وہ جزئیات پر نظر رکھتا ہے تو وہ کبھی مخالف اور متضاد پہلوؤں کو سامنے لاکر، کبھی اشاروں کنایوں میں، کبھی مہم طریقے سے، کبھی تشبیہ واستعاروں کی مدد سے شاعر کچھ ایسا نقشہ کھینچتا ہے کہ جو کچھ وہ دیکھتا ہے یا محسوس کرتا ہے اس کی مکمل تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ اس میں تخیئل کا رنگ گہرا ہونے کی وجہ سے جان پڑ جاتی ہے۔ کیونکہ محاکات کا مقصد بیان کرنا ہوتا ہے۔ اس بیان میں ترتیب وتناسب تخیئل ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ شاعری کا حسن اسی ترتیب وتناسب میں ہوتا ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حسن تخیئل ہی کی بدولت ہے۔

علامہ نے شعر وشاعری کی اہمیت بیان کرتے ہوئے تشبیہ واستعارہ پر خیال انگیز بحث کی ہے۔

---

[1] شبلی نمبر ادیب ستمبر ۱۹۶۰ء صفحہ ۲۱۱

[2] شبلی نمبر ادیب ستمبر ۱۹۶۰ء صفحہ ۲۱۳

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

ان کے خیال میں:-

''یہ چیزیں شاعری بلکہ عام زبان آوری کے خط وخال ہیں۔ جن کے بغیر انشاء پردازی کا جمال قائم نہیں رہ سکتا۔ ایک عامی سے عامی بھی جب جوش یا غضب سے لبریز ہو جاتا ہے تو جو کچھ اس کی زبان سے نکلتا ہے استعارات کا قالب بن کر نکلتا ہے۔ غم ورنج کی حالت میں انشاء پردازی اور تکلف کا کس کو خیال ہو سکتا ہے لیکن اس حالت میں بھی بے اختیار استعارات زبان سے ادا ہوتے ہیں۔''[1]

اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ استعارات فطری طور پر پیدا ہوتے ہیں اور شاعری میں شاعر کی اس ذہنی کیفیت کے تحت پیدا ہوتے ہیں جو شعر کہتے وقت طاری ہوتی ہے۔ اس میں اس کی شعوری کوشش کا زیادہ دخل نہیں ہوتا ہے۔ ان کی جدت اور ندرت میں ہی استعارہ کا حسن پنہاں ہوتا ہے۔ اس ندرت سے شاعر کا نیا اسلوب اور نیا انداز پیدا ہوتا ہے۔ شاعری میں نئے اسلوب اور نئے انداز کے بغیر دلکشی نہیں پیدا ہوتی ہے۔

اس انداز اور اسلوب کے وجود میں آنے میں الفاظ بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں کیونکہ الفاظ ہی سے شاعری میں حسن اور دلکشی پیدا ہوتی ہے۔ علامہ شبلی نے اس موضوع پر اظہارِ خیال کیا ہے اور سب سے پہلے ابن رشیق کی کتاب ''العمدہ'' کے باب فی اللفظ والمعنی کا خلاصہ پیش کیا ہے۔ ابنِ رشیق نے لفظ کو جسم اور مضمون کو روح قرار دیا ہے۔ دونوں میں وہی رشتہ ہے جو جسم اور روح کا ہے۔ اگر ایک میں کمزوری ہوگی تو دوسرا خود بخود کمزور ہو جائے گا۔ اس مثال سے یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ الفاظ وموضوع دونوں کے درمیان ہم آہنگی ضروری ہے۔ اس سلسلے میں علامہ شبلی کی رائے ہے کہ:-

''انشاء پردازی کا مدار زیادہ تر الفاظ ہی پر ہے۔ گلستاں میں جو مضامین اور خیالات ہیں، ایسے اچھوتے اور نادر نہیں لیکن الفاظ کی فصاحت اور ترتیب وتناسب نے ان میں سحر پیدا کر دیا ہے انہیں مضامین اور خیالات کو معمولی الفاظ میں ادا کیا جائے تو سارا اثر جاتا رہے گا۔''

لیکن آگے چل کر لکھتے ہیں:-

''اس تقریر کا یہ مطلب نہیں کہ شاعر کو صرف الفاظ سے غرض رکھنی چاہیے اور معنی سے

---

[1] شبلی نمبر ادیب ستمبر ۱۹۶۰ء صفحہ ۲۱۴

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

بالکل بے پروا ہو جانا چاہیے بلکہ مقصد یہ ہے کہ مضمون کتنا ہی بلند اور نازک ہو لیکن اگر الفاظ مناسب نہیں ہیں تو شعر میں کچھ تاثیر پیدا نہ ہو سکے گی۔''[1]

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شبلی کی نظر میں الفاظ اور موضوں دونوں کی یکساں حیثیت ہے۔ ان دونوں کی مناسبت اور ہم آہنگی کو وہ ضروری قرار دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کا ماننا ہے کہ محبت کے لطیف و نازک خیالات و جذبات کو صرف نازک اور لطیف الفاظ میں ہی ادا کرنا چاہیے۔ ان کے لیے بلند اور پر شوکت الفاظ کا استعمال غیر مناسب ہے۔ شاعر اسی لیے جذبات کو لطیف الفاظ کے سانچے میں ڈھال کر پیش کرتا ہے۔ قصیدے کے لیے غزل کے الفاظ اور غزل کے لیے قصیدے کے الفاظ کو استعمال میں نہیں لایا جا سکتا ہے کیونکہ اس سے مطلب تو ادا ہو جائے گا لیکن شاعری میں جو دلوں میں جگہ بنانے اور متاثر کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے وہ نہ پیدا ہو سکے گی۔ اسی لیے شاعر کے مدِ نظر سب سے پہلے یہی باتیں ہوتی ہیں۔ اسے اس بات کا بھی شعور ہوتا ہے کہ معنی کے اعتبار سے الفاظ کیا اثر رکھتے ہیں۔ فصیح اور مانوس الفاظ کے استعمال پر اسے قدرت ہوتی ہے۔ اور ان کی کیا اہمیت ہے وہ اس کو بھی سمجھتا ہے۔ اس میں اسے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑتی ہے۔ بلکہ یہ باتیں اس کا جز بن جاتی ہے۔ اسے شعر کے مختلف اجزاء کو ترتیب دینے اور سادگی ادا اور جدت ادا سے کام لینے میں زیادہ دشواریوں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا ہے۔

اس کے علاوہ شبلی نے شاعری میں مبالغے اور واقعیت کے مسئلے پر بہت ہی بصیرت افروز خیالات پیش کیے ہیں سب سے پہلے انھوں نے واقعیت اور مبالغے کے علم برداروں کے درمیان جو اختلاف ہے اس کا ذکر کیا ہے۔ اور پھر اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے:-

''شعر کی دو قسمیں ہیں تخیلی اور غیر تخیلی۔ تخیلی میں واقعہ سے غرض نہیں ہوتی بلکہ زیادہ تر یہ مطمح نظر ہوتا ہے کہ قوت تخیل کس قدر پر زور اور وسیع ہے۔ اس بنا پر اس قسم کی شاعری میں مبالغے سے کام لیا جائے تو بدنما نہیں لیکن وہاں بھی سامعین کی طبیعت پر استعجاب کا جو اثر پیدا ہوتا ہے وہ مبالغے کی وجہ سے نہیں بلکہ قوت تخیل کی بنا پر ہوتا ہے لیکن اور اقسام شاعری مثلاً فلسفیانہ، اخلاقی، تاریخی، عشقیہ، نیچرل ان میں مبالغہ بالکل لغو و چیز ہے اس لیے اگر شعر میں مبالغہ جائز بھی ہو تو صرف شعر کی ایک خاص نوع تخیل میں ہوگا۔

---

[1] شبلی نمبر ادیب ستمبر ۱۹۶۰ء صفحہ ۲۱۴

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

اس سے عام خوبی ثابت نہیں ہوسکتی۔''[1]

اس بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ شبلی کے نزدیک شاعری میں واقعیت اور اصلیت ضروری ہے۔ اس کی وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ شاعری کا مقصد زندگی اور خاص طور پر جذباتی اور داخلی زندگی کی اصلیت اور واقعیت سے بھرپور ترجمانی کرنا ہے لکھتے ہیں:-

''شاعری سے اگر صرف تفریح طبع مقصود ہو تو مبالغہ کام آسکتا ہے لیکن وہ شاعری جو ایک طاقت ہے، جو قوموں کو زیروزبر کرسکتی ہے۔ جو ملک میں ہلچل ڈال سکتی ہے، جس سے عرب قبائل میں آگ لگا دیتے تھے، جس سے نوحے کے وقت در و دیوار سے آنسو نکل پڑتے تھے، وہ واقعیت اور اصلیت سے خالی ہو تو کچھ کام نہیں کرسکتی۔ جاہلیت میں ایک شعر ایک معمولی آدمی کو تمام عرب میں روشناس کر دیتا تھا۔ بخلاف اس کے ایران کے شعراء نے جن ممدوحوں کی تعریفوں میں دفتر کے دفتر سیاہ کر دئے ان کا نام بھی کوئی نہیں جانتا۔ اس کی یہی وجہ ہے کہ شعرائے جاہلیت کے کلام میں واقعیت ہوتی تھی۔ اس لیے اس کا واقعی اثر ہوتا تھا پرانی شعراء باتوں کی طوطا مینا بناتے تھے جس سے دم بھر کی تفریح ہوسکتی تھی باقی ہیچ۔''[2]

اس سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ شاعری کا مقصد باتوں کے طوطا مینا بنانا نہیں ہے۔ شاعر کی باتیں محض خیالی نہیں ہوتی ہیں۔ شاعری کا مقصد اصلیت کو سامنے لانا ہوتا ہے۔ یہ حقیقت اور اصلیت کی ترجمان ہوتی ہے۔ اس میں صرف مبالغے سے کام نہیں لیا جاتا ہے۔ شاعری زندگی میں انقلاب پیدا کرسکتی ہے، قوموں میں ہلچل پیدا کرسکتی ہے، ملکوں کو زیروزبر کرسکتی ہے۔

غرض شاعری ایک پراثر شے ہے وہ دلوں پر چھا جاتی ہے اور دلوں کو لبھاتی بھی ہے۔ یہ دل و دماغ پر گہرے نقوش قائم کرتی ہے۔ اس کے موثر ہونے کے جو اسباب ہیں ان کی بھی شبلی نے وضاحت کردی ہے۔ نقالی کا جو نظریہ ارسطو نے اپنی کتاب میں پیش کیا ہے اس کی وضاحت علامہ نے ان الفاظ میں کی ہے:-

''ارسطو نے جو وجوہ بیان کیے ہیں گو بجائے خود صحیح ہیں لیکن شعر کی تاثیر ان ہی باتوں

---

[1] شبلی نمبر ادیب ستمبر ۱۹۶۰ء صفحہ ۲۱۵

[2] شبلی نمبر ادیب ستمبر ۱۹۶۰ء صفحہ ۲۱۵

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

(یعنی نقل اور موسیقیت) پر موقوف نہیں جن کی وجہ سیوہ دلوں کو متاثر کرتا ہے۔''[1]

اور آگے چل کر اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ:

''شاعری کو جذبات ہی سے تعلق ہے۔ اس لیے تاثیر اس کا بنیادی عنصر ہے۔ شاعری ہر قسم کے جذبات کو برانگیختہ کرتی ہے اس لیے رنج، خوشی، جوش، استعجاب، حیرت میں جو اثر ہے، شعر میں بھی وہی اثر ہوتا ہے۔ مصورانہ شاعری اس لیے دل پر اثر کرتی ہے کہ جو مناظر اثر انگیز ہیں، شاعری ان کو پیش نظر کر دیتی ہے۔ بادِ سحر کے جھونکے، آبِ رواں کی رفتار، پھولوں کی شگفتگی، غنچوں کا تبسم، سبزے کی لہلہاہٹ، خوشبوؤں کی لپٹ، بادل کی پھوار، بجلی کی چمک یہ مناظر آنکھوں کے سامنے ہوں، دل پر وجد کی کیفیت طاری ہو جائے گی۔ شاعری ان مناظر کو بعینہٖ پیش کر دیتی۔ اس لیے اس کی تاثیر سے کیونکر انکار ہو سکتا ہے۔

شاعری صرف محسوسات کی تصویر نہیں کھینچتی، بلکہ جذبات اور احساسات کو بھی پیش کر دیتی ہے۔ اکثر ہم خود اپنے نازک اور پوشیدہ جذبات سے واقف نہیں ہوتے یا ہوتے ہیں تو صرف ایک دھندلا دھندلا سا نقش نظر آتا ہے۔ شاعری ان پس پردہ چیزوں کو پیش کر دیتی ہے۔ دھندلی چیزیں چمک اٹھتی ہیں۔ مٹا ہوا نقش اجاگر ہو جاتا ہے۔ کھوئی ہوئی چیز ہاتھ آ جاتی ہے، خود ہماری روحانی تصویر جو کسی آئینے کے ذریعے سے ہم نہیں دیکھ سکتے، شعر ہم کو دکھا دیتا ہے''۔[2]

شبلی نے شعر کے اثر کے سلسلے میں ان چند سطروں میں بہت ہی مفید باتیں پیش کی ہیں۔ شاعری میں جذبات کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ ان جذبات کی ترجمانی شاعری کی مدد سے کی جاتی ہے۔ شاعری کے ذریعہ انھیں جذبات کا خیالی پیکر ہمارے سامنے آتا ہے۔ زندگی کی اس کیفیت کو ہم صرف شاعری ہی کے ذریعے سے پیش کر سکتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہمارے دل میں جو کچھ بھی ہوتا ہے۔ اس کا عکس ہمیں شاعری میں نظر آتا ہے۔ لہٰذا شاعری قاری پر اثر انداز ہوتی ہے اور شاعری کے باعث اس کے جمالیاتی ذوق کی تسکین بھی ہوتی ہے۔

---

[1] شبلی نمبر ادیب ستمبر ۱۹۶۰ء صفحہ ۲۱۵

[2] شبلی نمبر ادیب ستمبر ۱۹۶۰ء صفحہ ۲۱۶

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

چونکہ شاعری ایک اثر رکھتی ہے۔اس لیے شبلی اسے ایک قوت سے تعبیر کرتے ہیں۔ان کا ماننا ہے کہ یہ قوت بڑے بڑے کام کرسکتی ہے۔لیکن اس کے لیے یہ شرط ہے کہ اس کو صحیح معنوں میں اور صحیح طور سے استعمال میں لایا جائے۔شاعری ہمارے اندر زندگی بسر کرنے کی خواہش پیدا کرتی ہے۔اس سے ہم شریفانہ اخلاق پیدا کرسکتے ہیں۔اقدارِ خیر کو بڑھاوا دینے کے لیے لوگوں کو ترغیب دی جاسکتی ہے۔فلسفیانہ حقائق کو ذہن نشین کرنے کے لیے شاعری ایک بہترین ذریعہ ہے۔زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جسے شاعری متاثر نہ کرتی ہو۔شاعری کا اثر بہت گہرا ہوتا ہے اور بہت دیر تک رہتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ شاعری کی عظمت ہر زمانے میں یکساں محسوس ہوتی ہے۔

علامہ شبلی نے اپنی تحریروں میں شاعری کی ماہیت سے متعلق پر بہت ہی خیال انگیز اور بصیرت افروز بحثیں کی ہیں۔ان مباحث کی کیفیت بہت ہی مربوط اور متوازن ہے۔علامہ اپنی ہر بات مدلل انداز میں پیش کرتے ہیں۔وہ شروع سے آخر تک ایک منطقی انداز قائم رکھتے ہیں۔انھوں نے عربی اور فارسی شاعری کی مثالیں دے کر اپنے خیالات کی وضاحت کی ہے۔اسی وجہ سے ان کی بحث میں بے لطفی، خشکی، اور مشکل پسندی کی جھلک بھی نہیں پائی جاتی ہے۔شعر و شاعری کے بہت سے پیچیدہ مسائل کو انھوں نے حل کیا ہے۔علامہ کے خیالات اور نظریات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔اس سلسلے میں عربی اور فارسی کا تنقیدی سرمایہ خصوصیت کے ساتھ علامہ کے پیش نظر رہا ہے۔شبلی یونانی تنقید سے عربی کے توسط سے آشنا ہوے اور یونانی تنقید کے اثرات بھی ان کے یہاں جگہ جگہ دیکھے جاسکتے ہیں۔مغربی اثرات کی جھلک بھی کہیں کہیں نظر آتی ہے۔اس میں اس عہد کی بدلتی ہوئی صورت حال نے اہم کردار ادا کیا ہے۔علامہ میں عمرانی، حالات اور جذباتی زندگی کا شعور ہر جگہ ملتا ہے۔اسی شعور اور احساس کی بدولت ان کے یہاں گیرائی اور گہرائی پائی جاتی ہے۔

علامہ کسی بھی تنقیدی خیال کو پیش کرتے وقت ان اصولوں کو ذہن نشین رکھتے ہیں۔جو ان کے نزدیک شاعری کے لیے ضروری ہیں۔مثلاً علامہ کا ماننا ہے کہ شاعری زمانہ کا ساتھ دیتی ہے۔اس میں نئے نئے مضامین پیدا ہونے کی یہی وجہ ہے۔ شاعروں کے تذکروں میں انھیں ان ہی مضامین کی جستجو رہتی ہے۔ رودکی کے بارے میں علامہ نے لکھا ہے کہ:

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

''اس نے کثرت سے نئے نئے مضامین پیدا کیے ہیں۔''[1]

شبلی شاعری میں واقعیت کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ رودکی ہی کے تذکرے میں لکھا ہے کہ:

''اس میں متانت اور واقعیت پائی جاتی ہے۔''[2]

فرخی کے بارے میں یہ رائے رکھتے ہیں۔

''اس نے واقعہ نگاری کو بہت ترقی دی۔''[3]

دل آویزی اور اسلوب بیان کی جدت کو علامہ نے شاعری کے لیے ضروری بتایا ہے۔ سنائی کے کلام میں ان کو یہ خصوصیت نہیں نظر آتی ہے۔ لہٰذا لکھا ہے:

''اور قصائد میں انھوں نے کوئی جدت نہیں پیدا کی لیکن پختگی، برجستگی اور صفائی میں ان کا کلام تمام معاصرین سے ممتاز ہے۔''[4]

شعرالعجم میں ایسے بہت سے تنقیدی فقرے ملتے ہیں۔ مجموعی طور پر دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی عملی تنقید کو تجزیاتی نہیں کہا جا سکتا ہے۔ اس میں تشریحی پہلو زیادہ ہے۔ شبلی کی نظر اس تشریح میں اس تنقیدی حقیقت تک پہنچ جاتی ہے۔ جو کسی شاعر کے کلام میں پائی جاتی ہے شبلی کا مقصد عملی تنقید سے یہی ہے۔ شعرالعجم بنیادی طور پر تنقیدی تصنیف نہیں ہے۔ شعرالعجم کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں فارسی شاعری کی تاریخ ہے۔ اگر شعرالعجم کو تنقیدی تصنیف مانا جائے تو اس میں تنقیدی پہلو غالب ہونا چاہیے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ اس کے باوجود فارسی کے مختلف شعرا اور فارسی شاعری کے اصناف کے بارے میں علامہ نے جو لکھا ہے اس کو اگر تنقیدی اعتبار سے دیکھا جائے تو کچھ بصیرت افروز باتیں نظر آتی ہیں۔ حالانکہ یہ باتیں اشاروں کی شکل میں ہیں لیکن پھر بھی ان میں کہیں کہیں تاثراتی رنگ نظر آتا ہے۔ اس سے علامہ کی تنقیدی اہمیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ان کے تاثراتی فقرے اور اشارے تنقیدی اعتبار سے زیادہ خیال انگیز اور بصیرت افروز دکھائی پڑتے ہیں، تو بیجا نہ ہوگا۔

---

[1] ادیب شبلی نمبر، صفحہ ۲۱۸

[2] ادیب شبلی نمبر، صفحہ ۲۱۸

[3] ادیب شبلی نمبر، صفحہ ۲۱۸

[4] ادیب شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء، صفحہ ۲۱۹

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

غرض یہ کہ شبلی کی تنقیدی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہے۔ علامہ کی تنقید نگاری اردو تنقید کی روایت میں اپنا ایک اہم مقام رکھتی ہے۔ جس عہد میں تنقیدی روایت عام نہیں تھی، اس زمانہ میں علامہ نے تنقید کی طرف توجہ کی۔ تنقیدی اعتبار سے ان کے زمانے کو اہم زمانے قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس زمانے میں تنقید کا ماحول پیدا کرنے والوں میں آزاد اور حالی کے نام نمایاں ہیں۔ اس میں شبلی کی تنقیدی تحریروں کا برابر کا حصہ ہے۔ نظریاتی اور عملی دونوں اعتبار سے علامہ نے اردو تنقید کو بڑا فروغ دیا۔ ان کی تنقید تجزیاتی نہ ہونے کی وجہ سے اس میں گہرائی کی کمی ہے۔ لیکن علامہ نے تاثراتی اور تشریحی انداز میں خیالات کو پیش کیا ہے۔ اس میں تنقید کا ایسا اسلوب ملتا ہے جس سے اردو تنقید اب تک آشنا نہیں ہوئی تھی۔

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

۲-شعرالعجم کا تنقیدی جائزہ

شاعری کی تنقید کے لئے ناقد کو ادیب، انشاء پرداز، صاحب مطالعہ اور نکتہ رس، ذہین ہونا تو ضروری ہے ہی لیکن ان خصوصیات کے علاوہ ناقد کے لئے جو بات سب سے زیادہ ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اس کو شعر کے ساتھ خاص مناسبت ہونی چاہیے۔ ذوق و وجدان پر شعری تنقید کا بہت کچھ دارومدار ہے کسی ناقد کے پاس اگر شعر کو پرکھنے کے لئے وجدان صحیح نہیں ہے تو وہ شعر کی حقیقت تک رسائی نہیں حاصل کر سکتا ہے ہاں شرح و بیان کے دفتر کے دفتر ضرور لکھ سکتا ہے۔

اصناف ادب میں شاعری کو سب سے زیادہ لطیف اور نازک صنف قرار دیا جاتا ہے۔ اس کے لئے ناقد کا ذوق بہت زیادہ پاکیزہ اور لطیف ہونا ضروری ہے۔ شیشوں اور آبگینوں کی کارگاہ میں اہنگر کی نہیں بلکہ ایک آئینہ ساز اور جوہری کی ضرورت ہوتی ہے۔

علامہ شبلی نعمانی کو قدرت نے وہ سبھی صلاحیات اور خصوصیات عطا کی تھیں جن کی ایک ادیب، شاعر، ناقد، مفکر اور مورخ کو ضرورت ہوتی ہے۔ علامہ بذاتِ خود ایک نغز گو شاعر تھے۔ لیکن علامہ کی دوسری خوبیوں کے سامنے ان کا یہ کمال خاطر خواہ ابھر کر سامنے نہ آسکا بلکہ دب کر رہ گیا بعض دوسرے اہل کمال کے ساتھ بھی یہ المیہ پیش آیا مثال کے طور پر اسحاق موصلی ایک مغنی اور مطرب کی حیثیت سے دنیا میں جانا جاتا ہے، علم و فضل میں حالانکہ اس کا مقام بہت بلند ہے۔ مانی کو ایک مذہب کا بانی قرار دیا جاتا ہے اور ''مانویت'' ایک مستقل مکتبۂ فکر تسلیم کیا گیا ہے لیکن اس کا نام بہزاد کے ساتھ لیا جاتا ہے جو ایران کا ایک مشہور مصوّر ہے۔

علامہ شبلی کا شاعرانہ ذوق بہت بلند تھا بلکہ اس کو ایک معیار قرار دیا جا سکتا ہے کچھ لوگوں کا تو یہاں تک کہنا ہے کہ جیسے کچھ علماء کے بارے میں یہ رائے ہوتی ہے کہ وہ ایک امت کے ہم پلہ ہیں اسی طرح علامہ شبلی کو ان کے شاعرانہ ذوق کی وجہ سے ایک امت کے برابر مانا جاتا ہے۔ جس پر علامہ کے شاعرانہ مذاق کا عکس بھی پڑ جائے گا وہ سخن فہم اور سخن سنج ہو جائے گا۔ شبلی تاریخ نگاری اور تنقید و انشا پردازی کا معلم اول ہے۔

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

''شعرالعجم'' کے مطالعہ سے شبلی کا شاعرانہ ذوق اور نقد ونظر کا کمال ہمارے سامنے آجاتا ہے۔اس کتاب نے اردو کی ترقی کو بلندی پر پہنچایا ہے اور اس کی آبرو کو بڑھایا ہے۔شعرالعجم نے بہت سے اردو جاننے والوں کا رشتہ فارسی زبان سے جوڑا ہے اور اس سے ان کا ذوقِ شاعری سوا ہے۔''ادبیات ایران'' پر ڈاکٹر رضا زادہ شفق اور پروفیسر براؤن کی معرکہ آرا تصانیف بھی ہماری نظروں سے گذری ہیں لیکن ان سب میں ''شعرالعجم'' ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔

شعرالعجم میں علامہ نے ایک ہزار سال کی ایرانی شاعری کا نقشہ ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔

شعرالعجم مولانا شبلی کی معرکہ آرا اور نہایت بلند پایہ ادبی تصنیف ہے۔اس کی چار جلدیں تو مولانا کی زندگی ہی میں شائع ہوگئی تھیں لیکن پانچویں جلد ان کے انتقال کے بعد شائع ہو پائی۔اس کتاب کو ادبی وعلمی حلقوں میں جو دادِ تحسین حاصل ہوئی۔اس کا بیان پروفیسر نذیر احمد نے ان الفاظ میں کیا ہے:-

''اس کتاب کو جس قدر مقبولیت ہوئی اور مولانا شبلی کو جو شہرت حاصل ہوئی اس کا اندازہ شاید مولانا کو بھی نہ رہا ہوگا۔اس سے پہلے دو تین حصوں کی تصنیف کو تقریباً ستر سال ہوئے اس درمیان فارسی کا وافر مواد جمع ہوا جو مولانا کی دست رس میں نہ تھا، لیکن اس کے باوجود اب تک کوئی کتاب ان موضوعات پر، جس کا احاطہ ''شعرالعجم'' نے کیا ہے، شعرالعجم جیسی وجود میں نہیں آسکی ہے۔مولانا شبلی کی یہ تصنیف ہنوز نقش اول کی حیثیت رکھتی ہے اور باوجود وسائل کی کمی کے ایسی کتاب مرتب ہوئی، جو ستر برس سے تاریخ شعر و ادب فارسی کے خطے کی تنہا حکمراں ہے۔''[1]

علامہ خود اس کی وجہ تصنیف ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:-

''ایران کی خاک فنون لطیفہ کی قابلیت میں بھی سب سے ممتاز تھی اور بالخصوص شاعری اس کا خمیر تھا۔اسلام نے اس خاص جوہر کو زیادہ چمکا دیا اور اس حد تک پہنچایا کہ تمام دنیا کی شاعری ایک طرف اور صرف ایران کی شاعری ایک طرف۔لیکن افسوس یہ ہے کہ آج تک کسی اسلامی زبان میں ایران کی شاعری کی کوئی ایسی تاریخ نہیں لکھی گئی جس سے ظاہر ہوتا کہ شاعری کب شروع ہوئی، کس طرح عہد بہ عہد بڑھی، کیا کیا انداز قائم ہوئے،

---

[1] ہندوستانی ادب کے معمار (شبلی) صفحہ ۶۳، از ظفر احمد صدیقی

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

کیا کیا صورتیں بدلیں، ملکی اور قومی حالتوں نے اس پر کیا کیا اثر کیے، خود اس نے ملک وقوم پر کیا اثر ڈالا؟

شعراء کے تذکرے بہت ہیں لیکن وہ درحقیقت بیاض اشعار ہیں، جن میں شعراء کے عمدہ اشعار انتخاب کر کے لکھ دیئے ہیں شعراء کے حالات اور واقعات کم اور نہایت کم ہیں اور شاعری کے عہد بہ عہد کے انقلابات اور ان کے اسباب کا تو مطلق ذکر نہیں۔ میں اس کمی کو مدت سے محسوس کر رہا تھا اور اکثر اس ادھیڑ بن میں رہتا تھا۔''[1]

علامہ نے فارسی شاعری کی تاریخ کو شعرالعجم کا موضوع بنایا ہے۔ علامہ نے شعرائے فارسی کے تین ادوار قائم کئے ہیں۔ قدیم، متوسطین اور متاخرین۔ اور ہر دور کے لئے ایک جلد کو خاص کر دیا ہے۔ لہٰذا پہلی جلد میں حقیقت شعر سے بحث کی ہے اور سامانیہ خاندان کے معاصر شعراء دقیقی اور رودکی، اس کے بعد غزنوی عہد کے شعراء فردوسی، اسدی طوسی، منوچہری، عنصری اور فرخی کے زندگی کے حالات کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کے کلام پر تنقیدی تبصرے بھی کئے ہیں پھر انوری، عمر خیام، سنائی اور نظامی گنجوی کے احوال وآثار پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

دوسری جلد کے شروع میں پہلے علامہ نے دور متوسطین کی شاعری کی خصوصیات بیان کی ہیں اور پھر اس کے بعد یہ بتایا ہے کہ ان خصوصیات کے اسباب کیا ہیں پھر ترتیب کے ساتھ فرید الدین عطار، کمال اسماعیل، شیخ سعدی، امیر خسرو، سلمان ساوجی، حافظ شیرازی، اور ابن یمین کے حالات زندگی کا ذکر کیا ہے اور ان کی شاعرانہ خصوصیات وامتیازات بیان کئے ہیں۔

تیسری جلد کے آغاز میں پہلے کی طرح عہد متاخرین کی شاعرانہ خصوصیات کی نشاندہی کی ہے۔ اس کے بعد فغانی شرازی، فیضی، عرفی، نظیری، طالب آملی، مرزا صائب، اور ابو طالب کلیم کے احوال وآثار پر روشنی ڈالی ہے۔

مولانا شبلی کلیم کے بعد کی فارسی شاعری کو شاعری نہیں مانتے بلکہ چیستاں گوئی سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس لیے انھوں نے اس کے بعد کے شاعروں کو شعرالعجم میں جگہ نہیں دی۔

مولانا نے سوچا تھا کہ شعراء کے حالات اور ان کے کلام پر تبصرہ کرنے کے بعد چوتھی جلد مین شعر کی

---

[1] شعرالعجم - علامہ شبلی نعمانی، جلد اول، صفحہ ۴، طبع سوم، ۱۳۳۹ھ

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

حقیقت، فارسی شاعری اور اس کے اہم اصناف وسخن پر تفصیلی ریویو کریں گے۔لیکن جب علامہ نے دیکھا کہ حقیقت شاعری اور اس کی لفظی ومعنوی خوبیوں کی بحث ہی ستر اسی صفحات پر پھیل گئی ہے تو مجبور ہو کر انھیں پانچویں جلد کا اضافہ کرنا پڑا۔موجودہ صورت حال کے مطابق چوتھی جلد کے پہلے باب کا تعلق شعر کی حقیقت سے ہے۔دوسرے باب کے کچھ اہم ذیلی عنوانات کچھ اس طرح ہیں:

ایران میں شاعری کا جنم کیوں ہوا؟ شاعری کی تدریجی رفتار، فارسی شاعری پر عربی شاعری کا اثر، شخصی اور خود مختارانہ حکومت کے کیا اثرات تھے، شاعری پر نظام حکومت کے کیا اثرات تھے، فوجی زندگی کے اثرات، اختلاف معاشرت کا کیا اثر تھا؟ آب وہوا اور مناظر قدرت کس طرح ے اثر انداز ہوئے؟

تیسرے باب میں علامہ نے فارسی شاعری پر اجمالی تبصرہ کیا ہے۔اس باب کے شروع کے چودہ صفحات میں فارسی شاعری کا موازنہ عربی شاعری سے کرایا گیا ہے اور فارسی شاعری کے محاسن ومعائب بتائے گئے ہیں۔اس کے بعد صنف مثنوی پر شاہنامۂ فردوسی کو پیش نظر رکھتے ہوئے تفصیل کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے۔اسی پر چوتھی جلد ختم ہوتی ہے۔

پانچویں جلد میں علامہ نے پہلے فارسی غزل اور قصیدے پر بحث کی ہے اور پھر فارسی کی عشقیہ، اخلاقی ،صوفیانہ اور فلسفیانہ شاعری پر تفصیلی تبصرہ پیش کیا ہے۔

شعرالعجم کا تنقیدی جائزہ ہم مختلف عنوانات کے تحت لے سکتے ہیں۔اس کا صحیح طور پر جائزہ لینے کے لئے ہم نے اس کو درج ذیل عنوانات میں تقسیم کر سکتے ہیں:

(ا) شاعری کیا ہے؟

شعر کسے کہتے ہیں؟ اس کو بہت سے ارباب علم ومعنیٰ اور ناقدین نے طرح طرح سے سمجھانے کی کوشش کی ہے اور اس کی مختلف تعریفیں بیان کی ہیں۔شبلی نے بہت ہی خوبصورت انداز میں اس کو سمجھایا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''حیوانات پر جب کوئی قوی جذبہ طاری ہوتا ہے تو مختلف قسم کی آوازوں یا حرکتوں کے ذریعے ظاہر ہوتا ہے مثلاً مور چنگھاڑتے ہیں، کویل کوکتی ہے، طاؤس ناچتا ہے، سانپ لہراتے ہیں۔انسان کے جذبات بھی حرکات کے ذریعے سے ادا ہوتے ہیں، لیکن اس کو

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

جانوروں سے بڑھ کر ایک اور قوت دی گئی ہے یعنی نطق اور گویائی، اس لئے جب اس پر کوئی قوی جذبہ طاری ہوتا ہے تو بے ساختہ اس کی زبان سے موزوں الفاظ نکلتے ہیں اسی کا نام شعر ہے۔''[1]

آگے لکھتے ہیں:

''شاعری ایک آگ ہے جو خود مشتعل ہوتی ہے۔ ایک جسمہ ہے جو خود ابلتا ہے۔ ایک برق ہے جو خود کوندتی ہے۔''[2]

شاعر جذبات و مناظر کی عکاسی اور مصوری اور فطرت کی ترجمانی کرتا ہے لیکن اس کی ایک ''دنیا'' اور بھی ہوتی ہے، جس کی تشریح علامہ شبلی نے ان الفاظ میں کی ہے:

''اس عالم میں شاعر کی تاریخی زندگی عجب دلچسپیوں سے بھری ہوتی ہے۔ بلبل نے اسی عالم میں اس سے زمزمہ سنجی کی تعلیم پائی ہے۔ پروانے اس کے ساتھ کے کھیلے ہوئے ہیں، شمع سے وہ رات رات بھر سوز دل کہتا رہتا ہے، نسیم سحری کو اکثر اس نے قاصد بنا کر محبوب کے پاس بھیجا ہے، بار بار اس نے غنچہ کی عین اس وقت پردہ دری کی ہے جب وہ معشوق کا تبسم چرا رہا تھا۔''[3]

علامہ شبلی خصوصیات تو فردوسی کی شاعری کی بیان کر رہے ہیں لیکن اصلاً یہ خصوصیات ایک اچھے شاعر میں پائی جاتی ہیں:-

''شاعری کا اصل کمال واقعہ نگاری اور جذبات انسانی کا اظہار ہے، ان دونوں باتوں میں وہ (یعنی فردوسی) تمام شعراء کا پیش رو امام ہے۔ وہ جس واقعہ کو لکھتا ہے اس کے تمام جزئیات اور گرد و پیش کے ہر قسم کے حالات اور واقعات ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر پیدا کرتا ہے پھر ان کو اس خوبی کے ساتھ ہو بہو ادا کرتا ہے کہ واقعہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے اور شعراء تو واقعہ کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر نظر ڈالنا ضروری نہیں سمجھتے یا سمجھتے ہیں، لیکن

---

[1] شعر العجم، جلد چہارم، صفحہ ۳۰۲

[2] شعر العجم، جلد چہارم، صفحہ ۱۷

[3] شعر العجم، جلد چہارم، صفحہ ۳۴

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

طبیعت فطرت شناس نہیں ہوتی، اس لئے باریک باتوں پر نظر نہیں پڑتی یا پڑتی ہے لیکن زبان پر قدرت نہیں کہ جوں کا توں ادا کر دیں۔ اس لئے یا بات کو بدل بدل کر کہتے ہیں یا استعارات وتشبیہات کے دامن میں پناہ لیتے ہیں۔''[1]

شاعر کے پسندیدہ اور منتخب اشعار سے اس کے ذوق کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ اس کسوٹی پر ہم کسی شاعر کے ذوق کو پرکھ سکتے ہیں:-

''ابوتمام ایک مشہور شاعر گزرا ہے جو متنبی کا ہم پلہ خیال کیا جاتا ہے، اس نے ایک مجموعہ انتخاب کیا تھا جو حماسہ کے نام سے مشہور ہے اور فن ادب کی جان ہے۔ اہل فن کا بیان ہے کہ ابوتمام کی شاعری کا کمال جس قدر اس انتخاب سے معلوم ہوتا ہے خود اس کے دیوان سے ظاہر نہیں ہوتا۔

میرزا صائب کے انتخاب کا بھی بعینہ یہی حال ہے جس شاعر کے جتنے اشعار انتخاب کر دیئے ہیں وہی اس کے تمام دیوان کا عطر ہے۔''[2]

شاعری درحقیقت ذوقی اور وجدانی چیز ہے۔ شاعری کا داسرا نام قوتِ احساس ہے۔ یہاں انگریزی شاعر ولیم ورڈز ورتھ (WILLIAM WORDS WORTH کی بیان کردہ شاعری کی تعریف ذہن میں آتی ہے۔ جس میں اس نے کیا تھا POETRY IS THE SPONTANEOUS OVERR FLOW OF POWERFUL FEELINGS. یہی احساس جب الفاظ کا جامہ پہن لیتا ہے تو شعر بن جاتا ہے۔ ورڈز ورتھ اور شبلی نے شاعری کی جو تعریفیں بیان کی ہیں۔ ان میں کافی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔ ورڈز ورتھ نے جس چیز کو "POWERFUL FEELINGS" کا نام دیا ہے، شبلی اس کو قوی جذبہ کہتے ہیں اور SPONTANEOUS کے لیے شبلی نے ''بے ساختہ'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔

(۲) الفاظ اور خیال

الفاظ اور خیال (IDEA & EXPRESSION) میں الفاظ کو فوقیت حاصل ہے یا خیال کو یہ شعر

---

[1] شعر العجم، حصہ اول، صفحہ ۱۵۲-۱۵۱

[2] شعر العجم، حصہ سوم، صفحہ ۲۰۱

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

وادب اور معانی و بیان میں بہت ہی معرکہ آرا، نازک اور دلچسپ بحث ہے۔ علامہ شبلی ''الفاظ'' کے حق میں اپنا فیصلہ سناتے ہیں: شبلی کہتے ہیں کتنا ہی اچھا خیال ہو الفاظ کے غلط استعمال اور بیان کی کمزوری کی وجہ سے مضحکہ خیز بن جاتا ہے۔ اس کے برخلاف کبھی کبھی کوئی معمولی سی بات خوبصورت الفاظ کے سانچے میں ڈھل کر ''سحر حلال'' بن جاتی ہے۔ شبلی کے وجدان شاعرانہ اور ذوقِ صحیح سے اسی فیصلے کی امید تھی۔

اہلِ فن کے دو گروہ بن گئے ہیں، ایک لفظ کو ترجیح دیتا ہے اور اس کی تمام تر کوشش الفاظ کے حسن وخوبی پر مبذول ہوتی ہے۔ عرب کا اصلی انداز یہی ہے بعض لوگ مضمون کو ترجیح دیتے ہیں اور الفاظ کی پرواہ نہیں کرتے، شبلی کہتے ہیں:-

> ''یہ ابن الرومی اور متنبی کا مسلک ہے۔ لیکن زیادہ تر اہل فن کا یہی مذہب ہے کہ لفظ کو مضمون پر ترجیح دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں مضمون تو سب پیدا کر سکتے ہیں، لیکن شاعری کا معیار کمال یہی ہے کہ مضمون ادا کن الفاظ میں ہوا ہے اور بندش کیسی ہے''۔

حقیقت یہ ہے کہ شاعری یا انشا پردازی کا مدار زیادہ تر الفاظ پر ہے، گلستاں میں جو مضامین اور خیالات ہیں ایسے اچھوتے اور نادر نہیں لیکن الفاظ کی فصاحت اور ترتیب اور تناسب نے ان میں سحر پیدا کر دیا ہے، انھیں مضامین اور خیالات کو معمولی الفاظ میں ادا کیا جائے تو سارا اثر جاتا رہے ظہوری کا ساقی نامہ، نازک خیالی، موشگافی، مضمون بندی کا ایک طلسم ہے، لیکن ''سکندر نامہ، کا ایک شعر پورے ساقی نامہ پر بھاری ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ ''ساقی نامہ'' میں الفاظ کی وہ متانت اور شان وشوکت اور بندش کی وہ پختگی نہیں جو سکندر نامہ کا عام جوہر ہے..... ذیل کے مصرعوں میں

ع تھا بلبل خوش گو کہ چہکتا ہے چمن میں

ع بلبل چہک رہا تھا ریاض رسول میں ''[1]

مضمون بلکہ الفاظ تک مشترک ہیں، پھر بھی زمین آسمان کا فرق ہے۔

مضمون خواہ کتنا ہی بلند اور نازک کیوں نہ ہو لیکن اگر الفاظ مناسب نہیں ہیں تو شعر میں کچھ تاثیر نہ پید اہو سکے گی اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ شاعر کو محض الفاظ سے غرض رکھنی چاہیئے۔ اور معنی سے بالکل بے پرواہو جانا چاہیئے۔ مضمون تو سب ہی پیدا کر لیتے ہیں لیکن شاعری کا کمال یہ ہے کہ مضمون ادا کن الفاظ میں

---

[1] شعر العجم، جلد چہارم، صفحہ ۷۳

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

کیا جارہا ہے اور بندش کیسی ہے؟ خود شبلی کا عقیدہ یہ ہے کہ شاعری یا انشا پردازی کا دارومدار زیادہ تر الفاظ ہی پر ہے۔

(۳) تشبیہ اور تخئیل

شاعری کا سارا وجود دلکش دریع ''الفاظ اور تخیل'' کے ستونوں پر ہی ٹکا ہوا ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اسی سے عبارت ہے تو کچھ بیجا نہ ہوگا۔ الفاظ و بیان کے سلسلے میں شبلی نے جو فیصلہ کیا ہے، اس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ شعر العجم میں علامہ شبلی نے تخیل پر بہت ہی کارآمد بحثیں کی ہیں:-

''ہم کو اس سے انکار نہیں کہ ایک معمولی سی معمولی چیز پر قوت تخیل مدتوں صرف کی جاسکتی ہے اور سینکڑوں مضامین پیدا کئے جاسکتے ہیں جن کی مخصوص مثال شعراء متاخرین کی نکتہ آفرینیاں ہیں، لیکن اس کی مثال سرکس کے گھوڑے کی ہے جو ایک خیمے کے اندر طرح طرح کے تماشے دکھا سکتا ہے لیکن طے منازل میں میدان جنگ میں، گھوڑ دوڑ میں کام نہیں آسکتا۔ اسی طرح تخیل کا عمل بھی ایک محدود دائرے میں جاری رہ سکتا ہے، لیکن اس کی وسعت کیا ہوگی؟ اور ایسی شاعری کس کام آئے گی؟ وہ شاعری جو ہر قسم کے جذبات کا آئینہ بن سکتی ہو، جو فطرت انسانی کا راز کھول سکتی ہو۔ جو تاریخی واقعات کو دلچسپی کے منظر پر لاسکتی ہو، جو فلسفہ اخلاق کے دقائق بتا سکتی ہو، اس کے لئے ایسا محدود تخیل کیا کام آسکتا ہے، تخیل جس قدر قوی، باریک، متنوع اور کثیر العمل ہوگا اسی قدر مشاہدات کی زیادہ ضرورت ہوگی جس قدر بلند پرواز طائر ہوگا اسی قدر اس کے لئے فضا کی وسعت زیادہ درکار ہوگی۔''[۱]

شعر کا حسن اور اثر آفرینی تخیل کے غلط استعمال کی وجہ سے بالکل ختم ہو جاتی ہے علامہ شبلی تخیل پر بہت گہری نظر رکھتے ہیں:-

''تخیل اور محاکات اگرچہ دونوں شاعری کے عنصر ہیں لیکن دونوں کے استعمال کے مواقع الگ الگ ہیں یہ سخت غلطی ہے کہ ایک کے بجائے دوسرے کا استعمال کیا جائے

---

[۱] شعر العجم، جلد چہارم، صفحہ ۵۲

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

مثلاً مناظر فطرت کا بیان محاکات میں داخل ہے اور بہار، خزاں، باغ، سبزہ، مرغزار، آب رواں کا بیان کیا جائے تو محاکات سے کام لینا چاہیئے یعنی اس طرح بیان کرنا چاہیے کہ ان چیزوں کا اصلی سماں آنکھوں کے سامنے پھر جائے - متأخرین کی سخت غلطی جس سے ان کی شاعری بالکل برباد ہوگئی ہے یہ ہے کہ وہ ان موقعوں پر محاکات کے بجائے تخیل سے کام لیتے ہیں مثلاً بہار کی تعریف میں کلیم کہتا ہے ؎

بہ نوع آتش گل در گرفتہ است

کہ بلبل رفت و در آب آشیاں کرد

یعنی پھولوں کی وجہ سے باغ میں اس طرح آگ لگ گئی ہے کہ بلبل نے جا کر پانی میں گھونسلا بنالیا۔'' [1]

''شاعری دراصل تخیل کا نام ہے، محاکات میں جو جان آتی ہے تخیل ہی سے آتی ہے ورنہ محاکات نقالی سے زیادہ نہیں، قوت محاکات کا یہ کام ہے کہ جو کچھ دیکھے یا سنے اس کو الفاظ کے ذریعہ بعینیہ ادا کردے، لیکن ان چیزوں میں ایک خاص ترتیب پیدا کرنا اور توافق کو کام میں لانا ان پر آب و رنگ چڑھانا قوت تخیل کا کام ہے۔'' [2]

علامہ شبلی نعمانی نے تشبیہ و استعارہ کی شعر و ادب میں ضرورت اس کے فرق اور اس کے وظیفہ عمل (Function) کا بیان بہت ہی واضح الفاظ میں کیا ہے۔

''یہ چیزیں (یعنی تشبیہ اور استعارہ) شاعری بلکہ عام زبان کے خط و خال ہیں جن کے بغیر انشاء پردازی کا جمال قائم نہیں رہ سکتا ایک عامی سے عامی بھی جب جوش یا غیظ و غضب میں لبریز ہو جاتا ہے تو جو کچھ اس کی زبان سے نکلتا ہے استعارات کا قالب بن کر نکلتا ہے۔ غم اور رنج کی حالت میں انشاپردازی اور تکلف کا کس کو خیال رہتا ہے، لیکن اس حالت میں بھی بے اختیار استعارات زبان سے ادا ہوتے ہیں۔ مثلاً کسی کا عزیز مر جاتا ہے، تو کہتا ہے ''سینا پھٹ گیا''، ''دل میں چھید ہو گئے''، ''آسمان ٹوٹ پڑا''، ''تجھ کو

---

[1] شعر العجم، جلد چہارم، صفحہ ۵۹-۶۰

[2] شعر العجم، جلد چہارم، صفحہ ۳۱-۳۲

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

کس کی نظر کھا گئی'' یہ سب استعارے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوگا کہ استعارہ دراصل فطری طرز ادا ہے، لوگوں نے بے اعتدالی سے تکلف کی حد تک پہنچا دیا۔''

اگر ہم یہ کہنا چاہیں کہ فلاں شخص نہایت شجاع ہے تو اگر ان ہی لفظوں میں اس مضمون کو ادا کر دیں۔ تو یہ تشبیہ ہوگی اور معمولی طریقہ کی بہ نسبت کلام میں کچھ زیادہ زور پیدا ہو جائے گا اور اگر یوں کہیں کہ ''وہ شخص شیر ہے'' تو زور اور بڑھ جائے گا۔ لیکن اگر کسی شخص کا مطلق ذکر نہ کیا جائے اور یوں کہا جائے ''کہ وہ جب میدان جنگ میں ڈکارتا ہوا نکلا تو ہل چل پڑ گئی'' (ڈکارنا خاص شیر کی آواز کو کہتے ہیں۔) یہ بھی استعارہ ہے اور پہلے کی بہ نسبت زیادہ لطیف ہے۔

اکثر موقعوں پر تشبیہ اور استعاروں سے کلام میں جو وسعت اور زور پیدا ہوتا ہے وہ کسی اور طریقے سے پیدا نہیں ہوتا۔ مثلاً اگر اس مضمون کو کہ فلاں موقعہ پر نہایت کثرت سے آدمی تھے، یوں ادا کیا جائے کہ وہاں آدمیوں کا جنگل تھا تو کلام کا زور بڑھ جائے گا۔ یہاں کلام کا اصلی مقصد آدمیوں کی کثرت کا بیان کرنا ہے۔ جنگل کی تشبیہ کی وجہ سے کثرت متعدد وجہوں سے زیادہ وسیع ہو جاتا ہے۔

شبلی نے شعر کی تعریف کرتے ہوئے تشبیہ اور تخیل کو بنیادی حیثیت عطا فرمائی ہے۔ شاعری میں تشبیہ اور تخیل کو یکساں حیثیت حاصل ہے۔ تشبیہ اور تخیل دونوں کی غنائی شاعری میں بہت زیادہ اہمیت ہے۔ خود تشبیہ میں کسی حد تک تخیل کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ تخیل انسان کے جذبات کے اندرون کو ابھارنے کا نام ہے۔ تشبیہ اور تخیل میں ہم آہنگی ایک بڑے شاعر کا کمال ہے۔

قادر الکلام شاعر کے یہاں تشبیہ اور تخیل مل کر ایک ہو جاتے ہیں اور ان کا الگ الگ وجود ختم ہو جاتا ہے۔

(۴) آب و ہوا کا اثر

ایران میں غزل کو ترقی کیوں حاصل ہوئی؟ اس کے کیا اسباب ہیں؟ ان سوالات کا جواب شبلی نعمانی ان الفاظ میں دیتے ہیں:-

''ایران کا تمدن کئی ہزار برس کا تمدن ہے۔ معاشرت اور کاروباری زندگی میں ہمیشہ سے نزاکت موجود تھی۔ تین ہزار برس کی مستقل عیش و نعمت اور جاہ و ثروت نے نفاست و

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

لطافت کو انتہا تک پہنچا دیا تھا۔ آب و ہوا سبزہ زار، آب رواں، لالہ وگل، دماغوں اور طبیعتوں کو ہمہ وقت نشاط انگیز اور ولولہ خیز رکھتے تھے۔ ان سب پر مستزاد یہ کہ حسن و جمال کے لحاظ سے ملک کا ملک بوستاں تھا، نوشاد، فلخ، فلخار، کشمیر حرسن کے چمن زار تھے۔ ایران کے دامن میں تھے، وہاں کی پیداواریں ایران ہی کے بازاروں کو سجاتی تھیں۔ ان سامانوں کے ساتھ ایران میں غزل گوئی کی ترقی ایک لازمی چیز تھی۔''[1]

اس تجزیے کے ایک ایک لفظ میں سچائی ہے، اس میں کسی طرح کا کوئی اضافہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی کلام کو طول دینا اور بات کو بڑھانا چاہے تو خوب پھیلا کر بیان کر سکتا ہے۔

علامہ شبلی نے غزل کے سلسلے میں ایران اور عرب کی شاعری کے فرق کو واضح کیا ہے۔ علامہ ایران کے معشوق کو مبتذل اور شاہد بازاری بتاتے ہیں جب وہ محفل میں جلوہ آرا ہوتا ہے تو چاروں طرف سے عشاق کا جمگھٹا ہوتا ہے، وہ کسی سے آنکھیں لڑاتا ہے، کسی سے اشارے کنائے کرتا ہے، کسی کی طرف دیکھ کر مسکرا دیتا ہے، کسی کو فریب آمیز نگاہوں سے جھوٹی محبت کا یقین دلاتا ہے۔ عشاق ایک ایک ادا پر بچھے جاتے ہیں ..... برخلاف اس کے عرب کا معشوق عفت وعظمت کا حرم نشین ہے، وہاں تک رسائی مشکل ہے۔ کوئی شخص ادھر کا رخ کرے تو پہلے تلواروں کا سامنا کرنا ہوگا۔

یہ بدیہی بات ہے کہ ملک کی آب و ہوا، سرسبزی اور شادابی کا اثر خیالات پر پڑتا ہے اور اس ذریعہ سے آب و ہوا کا یہ اثر انشاء پردازی اور شاعری تک پہنچتا ہے۔ عرب جاہلیت کا کلام دیکھو تو پہاڑ، جنگل، صحرا، بیابان، دشوار گزار راستے، مٹے ہوئے راستے، مٹے ہوئے کھنڈر، ببولوں کے جھنڈ، پہاڑی، جھاڑیاں، یہ چیزیں ان کی شاعری کا سرمایہ ہیں لیکن یہی عرب جب بغداد پہنچے تو ان کا کلام چمنستاں اور سنبلستاں بن گیا۔ ایران ایک قدرتی چمن زار ہے، ملک پھولوں سے بھرا پڑا ہے بادسحر کی جھونکے، خوشبوؤں کی لپٹ، سبزہ کی مہک، بلبلوں کی چہک، طاؤس کی جھنکار، آبشاروں کا شور، وہ سماں ہے جو ایران کے سوا اور کہیں نظر نہیں آ سکتا ہے۔

آب و ہوا کے ساتھ ساتھ شاعری پر تہذیب وتمدن کا بھی اثر پڑتا ہے کوئی بھی شاعر معاشرے کا اثر قبول کئے بغیر رہ ہی نہیں سکتا ہے۔

''پانچویں اور چھٹی صدی میں چونکہ ملکی تمدن خراب ہو گیا تھا۔ اس لئے زبان میں

---

[1] شعر العجم، جلد چہارم، صفحہ ۶۹

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

فحش الفاظ آ چکے تھے، جنہوں نے اس کو ترقی دی۔ یہاں تک کہ ملک کی عام زبان خراب ہوگئی۔ اب مہذب سے مہذب حضرات بھی شاعری کو فحش سے نہ بچا سکے۔ گلستاں کا باب پنجم اور مثنوی مولانا روم کی بعض حکایتیں اسی حالت کے نتائج ہیں۔''[1]

آب و ہوا کا اثر فطری طور پر ہماری طبیعتوں پر ہوتا ہے جس کا اثر ہمارے کلام میں صاف طور پر نظر آتا ہے۔ ایک امریکی ماہر لسانیات کا کہنا ہے:-

"IT IS VERY TEMPTING FOR INSTANCE TO THINK THAT CLIMATIC CONDITIONS MUST IN SOME WAYS INFLUENCE THE STATE OF PEOPLE VOCAL ORGANS AND HENCE THEIR HABITS oF PRONUNCIATIONS." (Introductory Linguistics Coaudo Toloney P.29) [2]

مذکورہ بیان کے مطابق اہل زبان پر ان کی وطنی آب و ہوا کا اثر پڑتا ہے۔ اس لئے کہ جن اعضاء صوت (Organs of Speech) سے وہ یہ آوازیں پیدا کرتے ہیں وہ اعضا ان کے خطے کی گرمی سردی اور برسات سے متاثر ہوتے ہیں۔

(۵) ایشیائی شاعری کی کمزوری

علامہ مشرقی تہذیب پر جان دینے والوں میں تھے۔ سرسید اور حالی کی طرح یورپ سے اثر قبول نہیں کرتے ہیں۔ علامہ منصفانہ مزاج تنقید رکھتے ہیں اسی لئے ان کمزوریوں کو نظر انداز نہیں کرتے ہیں جو ایشیائی شعراء میں پائی جاتی ہیں۔ بلکہ صاف طور پر کہتے ہیں:-

''ایشیائی شعراء کا قاعدہ ہے کہ کسی داستان کے بیان کرنے میں حسن و عشق کا کہیں اتفاقی موقع آ جاتا ہے تو اس قدر پھیلتے ہیں کہ تہذیب و متانت کی حد سے کوسوں آگے نکل جاتے ہیں۔ نظامی اور جامی جیسے لوگ اس حمام میں آ کر ننگے ہو جاتے ہیں۔''[3]

---

[1] شعر العجم، جلد چہارم، صفحہ ۱۷۲

[2] بحوالہ اردو اسالیب نثر - امیر اللہ خان شاہین، صفحہ ۲۱

[3] شعر العجم، جلد اول، صفحہ ۱۴۴

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

علامہ شبلی کو ایرانی شاعروں کے جو تذکرے اور سوانح حیات ملی ہیں۔ ان کی رائے ان کے بارے میں بالکل حقیقت کے مطابق ہے:-

''شعراء کے تذکرے بہت ہیں لیکن وہ درحقیقت بیاض اشعار ہیں جن میں شعراء کے عمدہ اشعار انتخاب کر کے لکھ دیئے ہیں۔ شعراء کے حالات اور واقعات کم اور نہایت کم ہیں۔''[1]

علامہ نے اپنی تنقیدی بصیرت کا استعمال کرتے ہوئے ایرانی شعراء کے تذکروں کی حقیقت کو ہمارے سامنے پیش کر دیا کہ ان کی حیثیت دراصل کیا ہے۔

(۶) عربی شاعری کا اثر

عربی شاعری جس طرح فارسی شاعری پر اثر انداز ہوئی، شعرالعجم میں اس کا ذکر جگہ جگہ ملتا ہے مثلاً:-

''عربی قصائد کی تمہید میں اکثر ممدوحوں یا معشوق کے ملنے کے لئے سفر کرنے کا حال لکھتے ہیں اور راستہ کی سختی، پہاڑوں کی چڑھائی، گھوڑوں کی جفاکشی اور گرم رفتاری کے ذکر سے اس کو طول دیتے ہیں۔ فارسی میں بھی قدیم شعراء کا یہ خاص انداز تھا جو آخر متروک ہوگیا۔ منوچہری، وامغانی اور عمعق بخاری نے متعدد قصیدے اس طرز پر لکھے ہیں.....۔''[2]

آگے لکھتے ہیں:-

''غور کرو شعرائے فارسی اس کے مقابلے مین کس چیز پر فخر کر سکتے ہیں۔ نظامی اور عرفی نے بڑے زور کے فخرئے لکھے ہیں لیکن فخر کی ساری کائنات یہ ہے کہ ہم اقلیم سخن کے بادشاہ ہیں۔ الفاظ اور حروف ہمارے باجگزار ہیں۔ مضامین ہمارے سامنے دست بستہ کھڑے رہتے ہیں۔ اس سے آگے بڑھے تو یہ کہ ہم پری پیکر ہیں۔''[3]

---

[1] شعرالعجم، جلد اول، صفحہ ۲

[2] شعرالعجم، جلد چہارم، صفحہ ۱۴۰

[3] شعرالعجم جلد چہارم، صفحہ ۲۸۰

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

ایرانی شعراء کی فطانت اور ذہانت پر کچھ جملے برہان قاطع ہیں:-

''اس کے علاوہ عرب کا شاعر اگر ایران میں آئے اور برسوں قیام کرے تاہم فارسی زبان میں شعر نہیں کہہ سکتا۔ لیکن ایران کا شاعر بے تکلف عربی میں شاعری کر سکتا ہے ''زمخشری'' اور سیبویہ'' عجمی تھے، لیکن زبان دانی میں عرب عربا سے کم نہ تھے۔''[1]

علامہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ عربی شاعری میں جو الفاظ کی کثرت اور قدرت پائی جاتی ہے وہ فارسی شاعری کو حاصل نہیں ہے۔ فارسی کے پاس الفاظ کا محدود خزانہ ہے عربی شعراء کو ایک آسانی یہ بھی ہے کہ ان کی شاعری میں زحافات کی کوئی حد نہیں ہے۔ انھیں زحافات کو استعمال کرتے وقت سوچنا نہیں پڑتا ہے .....لیکن

''ان تمام وسعتوں کے ساتھ عربی شاعری، فارسی شاعری پر غالب نہیں آسکتی ہے۔''[2]

شبلی کی اس رائے سے اتفاق کیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ کوئی تعصب میں علامہ پر عجمیت کا الزام لگائے۔

مجموعی طور پر علامہ شبلی فارسی شاعری کو عربی شاعری پر فوقیت دیتے ہیں لیکن جہاں تک قصیدہ گوئی کا تعلق ہے، علامہ شبلی کی نظر میں عربی شاعری زیادہ فطری، واقعاتی اور پر جوش ہے۔

(۷) تنقید

علامہ شبلی نعمانی نے شعر العجم میں شاعروں پر جو تحسین وتنقید کی ہے۔ اس کے کچھ نمونے درج ذیل ہیں۔ ایک جملہ میں علامہ نے نظامی گنجوی کی پوری غزل گوئی کا نقشہ ہمارے سامنے کھینچ دیا ہے:-

''غزل گوئی کی ایجاد گو سعدی سے منسوب ہے، لیکن سچ یہ ہے کہ اس صنم کدہ کے آذر نظامی ہی ہیں۔''[3]

''نظامی خدائے سخن ہے تاہم دارا کے خط میں جو سکندر کے نام تھا لکھتے ہیں ؎

---

[1] شعر العجم، جلد دوم، صفحہ ۱۵۰

[2] شعر العجم، جلد دوم، صفحہ ۱۵۰

[3] شعر العجم، جلد دوم، صفحہ ۲۱۰

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

وگرنہ چنانت وہم گوش پیچ

کہ دانی تو ہیچی و کمتر ز ہیچ

ترجمہ:- ورنہ میں ترے اس طرح کان ملوں گا کہ تو جان جائے کہ ناچیز سے بھی ناچیز ہے۔''[1]

نظامی گوشہ نشین شخص تھے شاہی درباروں میں جانے کا کم اتفاق ہوا تھا۔ شاہی آداب وطریق گفتگو سے واقف نہ تھے اس لئے وہی عام بازاری ''گوش پیچ'' (کان اینٹھنا) لکھ گئے اس نقص کی وجہ سے واقع کی صحیح تصویر نہ اتر سکی۔

شبلی نے سکندر نامہ پر تنقید اور شاہنامہ کے ساتھ اس کا موازنہ بہت ہی دقت نظر کے ساتھ پیش کیا ہے:-

''سکندر نامہ میں ہیرو کے انتخاب میں غلطی ہوگئی لیکن مجبوری تھی''۔

اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ کسی مشہور کشورستان کی داستان اختیار کی جائے، اس حیثیت سے سکندر کا کوئی ہمسر نہ تھا، ایشیاء اور یورپ دونوں اس کو مانتے ہیں۔

سکندر نامہ میں اگرچہ شاعری کے محاسن بہت زیادہ ہیں۔ باین ہمہ شاہنامہ کے برابر مقبول نہ ہوسکا۔ اس کے خاص اسباب ہیں:

(۱) سکندر نامہ میں اکثر جگہ تعقید ہے جو بات کہنا چاہتے ہیں اس طرح صاف نہیں کہہ سکتے کہ زبان سے نکلنے کے ساتھ ہی دل میں اتر جائے یہی وجہ ہے کہ کثرت سے شرحیں اور حاشئے لکھے گئے اور اکثر جگہ زبردستی مطلب پہنانا پڑا۔

(۲) عرب کا ہیرو ایک غیر شخص یعنی سکندر تھا اس لئے ایرانیوں کو اس کے واقعات سے ایسی دلچسپی اور محبت نہیں ہوسکتی تھی جو خود اپنی قوم سے ہوسکتی تھی۔ شاہنامہ کے مشہور ہونے کا بڑا اگر یہ تھا کہ خود اپنی قوم کی داستان تھی۔

(۳) تمام کتاب میں صرف ایک شخص کی داستان ہے، پڑھنے والا اکتا اکتا جاتا ہے، برخلاف اس کے شاہنامہ میں سینکڑوں اشخاص کے واقعات اور گوناگوں حالات ہیں، ایک غذا سے جی گھبرا جائے تو طرح طرح کے الوان نعمت موجود ہیں۔

(۴) تمام کتاب میں کوئی دردانگیز اور عبرت خیز واقعہ نہیں ہے۔ بہ خلاف اس کے شاہنامہ میں رستم،

---

[1] شعرالعجم، جلد چہارم، صفحہ ۲۲-۲۳

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

سہراب، منیزہ، جمشید وضحاک کی داستانیں نہایت پر اثر اور حسرت آمیز ہیں''[1]

کوئی بھی شخص اپنے فن میں مکمل طور پر مہارت حاصل نہیں کر سکتا ہے۔ کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ کمی رہ ہی جاتی ہے۔ مشاہیر شعراء کے کلام میں بھی یہ کمیاں پائی جاتی ہیں۔ شبلی کی نگاہ کمزوری پر رہتی ہے۔ علامہ نظامی کو بڑا شاعر مانتے ہیں لیکن ان کے ایک شعر میں کچھ کمی نظر آئی تو اس کو چھپانے کے بجائے سب کے سامنے پیش کر دیا تا کہ لوگ اس سے درس عبرت حاصل کریں۔ اسی طرح اور جہاں کہیں بھی ان کو کوئی کمی یا نقص نظر آیا تو فوراً اس کو سب کے سامنے کر دیا۔

(۸) تصوف

علامہ نے وحدت وجود کے مسئلہ کو سرتا پا شاعری قرار دیا ہے:-

''ہر چیز جو دل پر تعجب انگیزی کا اثر پیدا کرتی ہے جنتی شعر ہے، فضائے غیر محدود، بحرِ بیکراں، سیارہ متناہی، باد صرصر، امواج دریا، سب مجسم شعر ہیں، اسی بنا پر وحدت وجود کا مسئلہ سرتا پا شاعری ہے۔''[2]

''عالم طبعیات میں انسان ایک حقیر اور کمزور ذرہ ہے، لیکن تصوف جس نے آغوش میں دریا کو چھپا رکھا ہے۔ نقطہ ہے جو دائرے سے ہمدوش ہے۔''[3]

''عارف کی آنکھیں بند ہوتی ہیں لیکن وہ دل کی آنکھوں سے علانیہ اشیاء کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ایک لذت محسوس ہوتی ہے، یہ کیفیت بیان میں نہیں آسکتی اور مجبوراً کہنا پڑتا ہے ؎

ذوق این بادہ نہ دانی بخدا تا نہ چشتی ''[4]

فارسی شاعری میں تصوف نے ایک انقلاب برپا کر دیا ہے۔ فارسی شاعری اس وقت تک قالب بے جان تھی، جب تک اس میں تصوف کا عنصر شامل نہیں ہوا تھا۔ شاعری اصل میں اظہار جذبات کا نام ہے۔

---

[1] شعر العجم، جلد اول، صفحہ ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸

[2] شعر العجم، جلد پنجم، صفحہ ۱۵

[3] شعر العجم جلد پنجم، صفحہ ۱۴۷

[4] شعر العجم جلد پنجم، صفحہ ۱۵۳

Maulana Azad Library, Aligrh Muslim University

تصوف سے پہلے جذبات کا سرے سے وجود ہی نہ تھا۔ قصیدہ، مداحی اور خوشامد کا نام تھا۔ مثنوی واقعہ نگاری تھی، غزل زبانی باتیں تھیں، تصوف کا اصلی مایہ خمیر عشق حقیقی ہے، جو سرتا پا جذبہ اور جوش ہے، عشق حقیقی کی بدولت مجازی کی بھی قدر ہوئی اور اس آگ نے تمام شیشہ و دل گرما دئے، اب زبان سے جو کچھ نکلتا تھا گرمی سے خالی نہیں ہوتا تھا ارباب دل ایک طرف۔ اہل ہوس کی باتوں میں بھی تاثیر آ گئی۔

(۹) شعروں کا ترجمہ

شعر بالکل پھول کی طرح نازک ہوتا ہے جیسے پھول کو چھونے سے اس کی پتیاں بکھر جاتی ہیں اسی طرح ذرا سی بے احتیاطی سے شعر کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے اس لئے شعر کا ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ ہو پانا تقریباً ناممکن ہے۔ اگر ہو بھی جائے تو مفہوم تو ادا ہو جائے گا لیکن شعر کی باریکیوں، لطافت اور نازکی کو بالکل ویسے ہی پیش نہیں کیا جا سکتا ہے۔

فارسی شعروں کے ترجمہ میں علامہ نے جس کمال کا مظاہرہ کیا ہے، وہ علامہ کا ہی حصہ ہے۔ کہیں کہیں تو ترجمہ اصل شعر سے بھی زیادہ خوبصورت لگتا ہے۔ کچھ نمونے پیش خدمت ہیں:-

۱- آں کہ چوں درکتف چتر ہمایوں آثار
ہم عنان ظفر ازراہ غزا اگردد باز
زہرہ گیسو بکشاید کہ شود گردفشاں
از رکابش کہ پزیرفتہ غبار زتک وتاز
فتح گوید چہ کی چشم من است ایں نہ رکاب
سرمۂ چشم جہاں بین مرا باک بساز

(عرفی)

''یعنی جب رسول اللہؐ چتر کے سائے میدان غزا سے واپس آتے ہیں تو زہرہ چوٹی کھول کر چاہتی ہے کہ رکابوں پر جو گرد پڑ گئی ہے اس کو جھاڑ دے۔ فتح کہتی ہے، ایں یہ کیا کرتی ہے؟ یہ رکاب تھوڑی ہی ہے یہ تو میری آنکھیں ہیں اس کے سرمہ کو (گرد کو سرمہ قرار دیا ہے) کیوں چھڑاتی ہے۔[۱]

---

[۱] شعر العجم، جلد سوم، صفحہ ۱۱۵

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

۲- بگذشت ز پیش من و غیرش بہ حکایت

پیچیدہ کہ ہرگز نتواند بہ قفا دید

(علی قلی)

''شعر کا مطلب یہ ہے کہ معشوق سامنے سے جا رہا تھا، رقیب بھی ساتھ تھا، اس نے اس طرح اس کو باتوں میں لگایا کہ معشوق مڑ کر پیچھے نہ دیکھ سکا (ورنہ شاید میری طرف بھی اس کی نگاہ پڑ جاتی) ''پیچیدہ'' کے لفظ سے واقعہ کی صورت جس طرح ذہن میں آ جاتی ہے اور کسی لفظ سے نہیں آ سکتی۔''

۳- برقع بہ رخ افگندہ برو ناز بہ یاغش

تا نکہت گل بیختہ آید بہ دماغش

''معشوق جالی کا نقاب پہن کر باغ کی سیر کو نکلا۔ شاعر کو قوت تخیل سے یہ نظر آتا ہے کہ معشوق چونکہ نہایت نازک اور لطیف الطبع ہے، اس لئے چاہتا ہے کہ پھولوں کی خوشبو دماغ میں آئے تو چھن کر آئے، اس لئے اس نے جالی کا نقاب پہن لیا ہے۔'' [۱]

۴- باد در کہسار جام لالہ را بر سنگ زد

گل بہ خندہ گفت، آئے ایں چینی باید ہمی

''ہوا نے لالہ کا پیالہ اٹھا کر زمین پر پٹک دیا۔ پھول نے ہنس کر کہا خوب! یہی کرنا چاہیے تھا''۔ [۲]

علامہ نے کچھ شعروں کی شرح کی ہے۔ مثال کے طور پر ''دور گری'' کے معنیٰ ہیں الگ الگ کتراتے پھرنے کے۔ ''سخت کمان'' وہ شخص جس کا نشانہ دور تک جاتا ہے۔ ''آشنا رو'' وہ شخص جس کے دل میں محبت کا کچھ اثر نہ ہو، لیکن چہرے سے محبّت ظاہر ہوتی ہو۔ ''قاصدان بے تصرّف'' وہ قاصد جو اپنی طرف سے گھٹاتے بڑھاتے نہیں بلکہ جو کچھ سنا اس کو بے کم و کاست بیان کر دیا۔ ''سختہ برداشتن'' کتاب کی نقل کرنا۔ ''از شیر باز شدن'' دودھ چھڑایا جانا۔ ''بخواب گرفتن'' سوتے میں لے جانا۔

---

۱ شعر العجم، جلد چہارم، صفحہ ۲۰

۲ شعر العجم، جلد چہارم، صفحہ ۶۸

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

''بدیہہ آفریدن'' اعتراض کے جواب میں جھٹ پٹ بات گھڑ لینے کو کہتے ہیں۔ ''پاس غلط کردہ داشتن'' کے معنی شبلی نہ بتاتے تو یہ شعر بھلا سمجھ میں آ سکتا تھا۔

قمریاں پاس غلط کردۂ خود می دانند

ورنہ یک سرو دریں باغ بہ اندام تو نیست

''پاس کردہ داشتن'' کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص ناوقفیت سے کوئی غلط بات کہہ جائے اور واقف ہونے کے بعد بھی اپنی بات کی پچ کرتا رہے، شعر کا مطلب یوں ہے کہ قمریوں نے غلطی سے کہہ دیا تھا کہ سرو معشوق کے قد کا ہمسر ہے، اب ان کو اپنی غلطی معلوم ہوگئی لیکن بات پچ پچ کرتی ہیں، ورنہ ظاہر ہے کہ کوئی سرو معشوق کے اندام کی ہمسری نہیں کر سکتا۔[1]

سچ ہے کہ جس طرح غالبؔ نے اپنے کچھ مشکل اشعار کی تشریح کی تھی کہ اگر وہ ان کا مطلب نہ بتاتے تو شاید آج تک اس گتھی کو کوئی سلجھا نہ پاتا۔ بالکل یہی معاملہ علامہ شبلی نعمانی کے شعروں کے ساتھ بھی ہے کہ اگر شبلی ان کی شرح نہ کرتے تو یہ ہماری سمجھ میں شاید آسانی سے نہ آتے۔

ہم اس سے باخبر ہیں کہ کچھ نقادوں نے ''شعر العجم'' کی تاریخی غلطیوں کی گرفت کی ہے اور ان کے جوابات بھی فراہم کیے ہیں۔ شعر العجم کے شائع ہونے کے بعد مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، مولانا عبدالسلام ندوی اور مولانا عبدالحلیم شررؔ وغیرہ حضرات نے اس پر توصیفی تبصرے بھی قلم بند کیے ہیں۔ وہیں دوسری طرف تنقیدی تبصروں میں اس کی خامیوں کی طرف نشاندہی کی گئی ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور صاحب نے لکھا ہے:

''شعر العجم میں فارسی شاعری کی تاریخ ہے، انھوں نے مشاہیر کے تذکرے کو سامنے رکھا، اہم رجحانات اور ارتقاء کو نہیں۔ سوانح نگار کی حیثیت سے وہ حالی سے بلند نہیں کیے جا سکتے ہیں۔ وہ حالی کی طرح غیر جانبدار اور غیر شخصی نہیں کہے جا سکتے۔ ہاں حالی سے زیادہ تفصیل پیش کر سکتے ہیں۔ اور زیادہ وسعت پیدا کر سکتے ہیں۔''[2]

اوپر کی عبارت میں سرور صاحب کا صرف اتنا تبصرہ ٹھیک ہے کہ وہ جانبداری سے کام لیتے ہیں۔

---

[1] شعر العجم، جلد چہارم، صفحہ ۲۳۳

[2] مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں: عبداللطیف اعظمی، مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد ۱۹۴۵ء ص ۱۴

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

لیکن یہ عیب صرف شبلی میں نہیں پایا جاتا ہے۔ بلکہ حالی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں اور خود سرور صاحب بھی۔

حافظ محمود شیرانی نے بھی ایک محققانہ کتاب ''تنقید شعر العجم''، لکھی ہے۔ جو پانچ سو صفحات پر محیط ہے۔ انھوں نے اس تصنیف کے آغاز میں اپنے اعتراضات کی تلخیص اس انداز میں کی ہے:-

''شعر العجم کے مطالعے کے بعد میری ذاتی رائے یہ قائم ہوئی کہ علامہ شبلی اس تصنیف کے دوران میں مؤرخانہ و محققانہ فرائض کی نگہداشت سے ایک بڑی حد تک غافل رہے ہیں۔ رطب و یابس جو کچھ ان کے مطالعے میں آجاتا ہے، بشرطے کہ دلچسپ ہو، حوالۂ قلم کر دیتے ہیں ..... ممکن ہے شبلی تاریخ اسلام میں بہتر نظر رکھتے ہوں، لیکن شعرائے عجم کے حالات میں ان کی معلوماتِ تاریخی نہایت محدود ہیں ..... بہت سے غیر تاریخی افسانوں نے شعر العجم میں قابلِ عزت جگہ پائی ہے، عام اغلاط جنھیں تذکرہ نگاروں نے اپنی اپنی تصنیف میں دہرا کر ہماری ادبیات میں عام طور پر زبان زد کر دیا ہے، شعر العجم کے صفحات پر بھی موجود ہیں، ..... جو جو اطلاعات آسانی سے مولانا شبلی کے دست رس میں آسکیں، انھیں پر قناعت کی، زیادہ تحقیق و تفتیش سے کام نہیں لیا۔''[1]

حافظ محمود شیرانی صاحب کے ان اعتراضات سے کافی حد تک اتفاق کیا جا سکتا ہے لیکن اس سے شعر العجم کی اہمیت اور حیثیت میں کوئی کمی نہیں آتی ہے۔

بقول سید سلیمان ندوی:-

''شعر العجم''، شعراء کے اسماء و القاب، سنین و سال اور امراء و سلاطین کی تنقیدی تاریخ نہیں، بلکہ فارسی شاعری کا تنقیدی تبصرہ ہے۔ شعر العجم میں ہر شاعر کا تذکرہ اور سوانح پہلی چیز نہیں، دوسری چیز ہے۔ اس کی پہلی چیز ہر شاعر کا شاعرانہ کمال اور سخن وری کا معنوی جوہر ہے۔ غرض وہ جسم و مادہ کی تاریخ نہیں، بلکہ روح و دماغ کی تاریخ ہے۔''[2]

شعر العجم میں کچھ باتیں ایسی بھی ہیں جنھیں ذہن آسانی سے قبول نہیں کرتا ہے۔ شبلی نے بیدل کو نظر انداز ہی نہیں کیا بلکہ اس کا مقام اتنے نیچے کر دیا ہے کہ اس کو ناصر علی کی صف میں جگہ دی ہے ایک جگہ لکھتے ہیں

---

[1] تنقید شعر العجم: حافظ محمود شرانی، ص ۲۱

[2] سید سلیمان ندوی- حیات شبلی، صفحہ ۲۱۰

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

کہ مرزا غالبؔ کا انداز بالکل بدلا ہوا ہے۔ شروع میں

''وہ بیدلؔ کی پیروی کی وجہ سے غلط راستے پر پڑ گئے تھے۔''[1]

اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ صائبؔ تو انھیں متاثر کرتا ہے لیکن بیدلؔ کو اعتبار کے قابل نہیں سمجھتے ہیں۔

شبلی شعروں کو انتخاب کرنے میں معجزہ سے کام لیتے ہیں لیکن یہ شعر:-

طرز بے رحمان دیگر گشتہ بود الحق کہن

اختراع چند در نامہربانی کردہ است

یہ شعر علاّمہ نے کئی جگہ لکھا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو اس کا دوسرا مصرعہ غیر شاعرانہ اور کمزور ہے۔

علاّمہ نے ایک جگہ تصوّف پر تنقید کی ہے اور لکھا ہے:-

''اس مسئلہ کی تلقین کے وقت تصوّف سفسفہ کے قریب آجاتا ہے۔''[2]

بہت سی جگہ ایسا ہوا ہے کہ وہ تصوّف کی تحسین اور شعروں کی شرح کرتے ہوئے نکل جاتے ہیں حالانکہ بعض صوفیانہ اشعار دینی نقطۂ نظر سے یہ حق رکھتے تھے کہ رمز و کنایہ کے پیرایہ میں ان کا احتساب کیا جاتا۔ اس بات کو پیش کرنے کا سبب یہ ہے کہ شبلی محمد حسین آزاد کی طرح محض ادیب اور تذکرہ نگار نہیں ہیں بلکہ وہ ''سیرۃ النبیؐ'' اور ''الفاروق'' کے مصنف بھی ہیں۔

علامہ شبلی نے مرزا غالبؔ کا بیان ''شعر العجم'' میں ضمناً کیا ہے۔ حالانکہ ان کا فارسی کلام اس کا مستحق تھا کہ اس کی نظر ایک مستقل باب کیا جاتا ؎

مباش منکر غالبؔ کہ در دز مانہ تست

شعر العجم میں علاّمہ بجائے ''غزل یا نظم'' کہنے کے اکثر جگہ ''نظم لکھنا یا غزل لکھنا'' بولتے اور لکھتے ہیں۔ کہیں کہیں ایسا بھی ہوا ہے کہ مولانا نے لفظ و بیان کی صحت و خوبی کی پروا نہیں کی ہے، نہ اظہار خیال کے سلیقے کی طرف دھیان دیا ہے، نہ ہی زبان پر، نہ نظم کے آہنگ و لہجہ کی طرف خاص دھیان دیا ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ہمیں یہ بات ذہن نشیں رکھنی چاہیئے کہ شعر العجم ایسے زمانے کی تصنیف ہے جب کہ ہندوستان میں اچھی کتابیں نایاب تھیں۔ اس وقت کتب خانوں کی تعداد بھی بہت کم تھی۔ ایسے میں علاّمہ کی

---

[1] شعر العجم، جلد پنجم، صفحہ ۲۱

[2] شعر العجم، جلد پنجم، صفحہ ۱۵۸

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

شعرالعجم بڑا کارنامہ ہے۔ اس وقت علاّمہ کو صرف کچھ شاعروں کے تذکرے اور ہندوستانی مطبعوں کے غیر مستند فارسی کلام ہی دستیاب تھے۔ شعرالعجم نے نہ صرف ایک علمی ضرورت کو پورا کیا ہے بلکہ اس نے اردو کے گرانقدر سرمایہ میں اضافہ کیا ہے۔ اسی بنا پر اردو نصاب کی تصانیف میں شعرالعجم کے اقتباسات درج کئے جاتے ہیں۔ شعرالعجم کی طرز تحریر میں ایک خاص رنگ پایا جاتا ہے جس میں زور اور وقار دونوں کی آمیزش ہے۔

شعرالعجم اس دور میں جو کہ بے راہ روی کا دور ہے، خضرِ راہ کی حیثیت رکھتی ہے کہ بات کو اس انداز میں پیش کیا جاتا ہے، تنقید کا یہ اسلوب ہونا چاہیئے، شعر کو اس طرح پرکھنا چاہیئے، علمی مواد اور تاریخی واقعات تنقید میں اس عنوان سے استعمال کرنے چاہیئے۔

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

ج۔موازنہ انیس و دبیر اور عملی تنقید کے مطالبات

کسی بھی فن کو پرکھنے کے لیے سب سے زیادہ ضروری ہے کہ نقاد کا ذہن تربیت یافتہ ہو۔اس میں احتساب کی صلاحیت ہو۔شبلی عربی و فارسی کے عالم تھے۔مسلمانوں کے لیے کچھ کرنے کا جذبہ بھی رکھتے تھے اور یہی چیزیں شاید انھیں دھیرے دھیرے سرسید کے قریب لے آئیں۔شبلی کو سرسید کے یہاں مغرب کے تنقیدی رویہ سے آگاہ ہونے کا موقع ملا اور یہ بھی پتا چلا کہ تقابل مغربی تنقید کا ایک اہم رجحان ہے۔اردو میں باقاعدہ طور پر تنقید موجود نہ تھی۔چہ جائکہ تقابلی تنقید۔تذکروں میں ہمیں صرف جمالیاتی یا تاثراتی تنقید کے نمونے ملتے ہیں۔اردو شاعری کا باضابطہ جائزہ لینے والے محمد حسین آزاد پہلے نقاد ہیں ''آب حیات'' میں پہلی بار سائنٹفک انداز میں ادوار قائم کیے ہیں۔تقابلی تنقید کی جھلکیاں بھی ان کے یہاں کہیں کہیں نظر آتی ہیں۔میر و سودا، مصحفی و انشاء، غالب و ذوق کا ذکر کرتے ہوئے وہ تقابلی تنقید کی کوشش کرتے ہیں۔۱۸۹۳ء میں حالی نے اردو دیوان شائع کیا۔جس میں انھوں نے ایک جامع اور بسیط مقدمہ کو بھی شامل کیا۔اسی مقدمے کو اردو تنقید کا سنگ بنیاد مانا جاتا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حالی کے یہاں تقابلی تنقید کا رجحان نمو پا رہا ہے۔جب انھوں نے ملٹن اور ابن رشیق کے بیان میں فرق کو واضح کیا۔

شبلی نے ۱۹۰۳ء-۱۹۰۴ء میں موازنہ انیس و دبیر تصنیف کی۔متفرق مضامین پر مستزاد ادب میں مولانا شبلی نعمانی کا ''شعر العجم'' کے علاوہ ایک کارنامہ ''موازنہ انیس و دبیر'' بھی ہے رشید حسن خاں کا خیال ہے کہ یہ ۱۹۰۷ء میں مطبع ہندی آگرہ میں طبع ہوئی تقابل اس کتاب کا بنیادی عنصر ہے۔اس طرح اس کو اردو میں تقابلی تنقید کی پہلی کتاب کہا جا سکتا ہے۔اور اسے ہم تقابلی مطالعہ کا ایک نمونہ بھی کہہ سکتے ہیں۔اس میں علامہ نے سیر حاصل گفتگو کرنے کے لیے دو شعراء کے درمیان تقابل کا راستہ اپنایا ہے۔اس کے مطالعہ کا جواز اسی کو قرار دیا جا سکتا ہے کہ اس میں دو ایسے شاعروں کے کمال فن کا محاکمہ کیا گیا ہے جنھوں نے مرثیہ گوئی میں اپنے جوہر دکھائے ہیں۔عربی تنقید کی تاریخ میں موازنہ کی روایت مبہم انداز میں موجود تھی۔شبلی چونکہ

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

عربی زبان وادب کے متبحر عالم تھے۔ چنانچہ انھوں نے تقابلی تنقید کے طریقے سے پورا فائدہ اٹھایا۔ اس کو اردو کے دو بڑے شاعروں یعنی میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے کلام پر منطبق کرنے کی کوشش کی۔ اردو میں مرثیہ گوئی کی تاریخ پرانی اور متنوع ہے۔ مولانا نے اسے عربی شاعری کے سانچے میں رکھ کر دیکھا ہے کیونکہ عربی میں اس کا قابل قدر اور وافر ذخیرہ ہے۔

صنف مرثیہ میں آج تک لوگ طبع آزمائیاں کر رہے ہیں اور زیادہ تر اس وجہ سے کہ کربلا کے واقعات کی حیثیت اساطیری اور تاریخی ہے بھلائی اور برائی کے بیچ زبردست کشمکش ہے۔ اس کے دو اہم کردار حضرت حسینؓ اور یزید ہیں۔ اور یہ دونوں ہی لازوال ہیں۔ انسانی تاریخ کے ہر دور میں یاد کی جانے والی آفاقیت کی حامل کشمکش ہے۔ لیکن اس کشمکش کو ہم لازوال واقعہ کا نام دے سکتے ہیں۔ میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کو اس زمانہ میں ایک دوسرے کا حریف اور مد مقابل مانا گیا تھا۔ ان دونوں کے یہاں یکساں موضوعات پر طبع آزمائی کی گئی ہے لہٰذا ان کے مابین محاکمہ اور موازنہ ناگزیر ہو گیا تھا۔ اردو میں ادبی معرکوں اور چپقلشوں کی حیثیت لازمی جزو کی سی رہی ہے اور نتیجہ کے طور پر کبھی کبھی ماحول خاصا گرم بھی ہو جاتا تھا۔

میرؔ سوداؔ انشاءؔ وجراتؔ کی معرکہ آرائیاں اور ان کی نوک جھونک سے دلچسپی کا بڑا سامان مہیا ہوتا ہے۔ ہر بڑے استاد کے ساتھ ان کے حوارئین اور پیروؤں کی بڑی تعداد ہوتی تھی۔ جن کا کام یہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے استاد کی خوب مدح سرائی کرتے اور ان کو بڑھاتے چڑھاتے اور ان کے حریفوں کو مات دیتے، نیچا دکھانے کی بھی کوششیں ہوتیں۔ انیسؔ اور دبیرؔ کے معاملے میں بھی ایسا ہی ہوا اور ایک دوسرے پر توارد بلکہ سرقے کا الزام لگانا بھی معمولی بات تھی۔ لیکن موازنہ انیسؔ و دبیر اس روایت سے الگ ہے۔ شبلی حتی الامکان اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ عصبیت سے احتراز کیا جائے اور دونوں شاعروں کے محاسن و معائب کا بیان کرتے ہوئے ان کا ادبی مرتبہ متعین کیا جائے۔

ڈاکٹر عبداللہ نے موازنہ انیس و دبیر کو عملی تنقید کی کتاب قرار دیا ہے۔ کہ اس میں تقابلی تنقید کو عملی تنقید کے ایک اوزار (Tool) کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر عبداللہ نے جہاں اس پر اظہار خیال کیا ہے وہاں تقابلی تنقید کی اصطلاح کو استعمال نہیں کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> ''تنقید کا یہ انداز شبلی کی اختراع نہیں، (بلکہ) ہمارے پرانے نظام نقد و انتقاد میں ادبی گروہ بندیوں کے ماتحت مختلف شاعروں کی شاعری کی قدر و قیمت کا فیصلہ اور طریق

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

کے علاوہ اس انداز سے بھی کیا جاتا تھا شبلی نے بھی اسی طریقے پر عمل کیا ہے''۔ [1]

پھر آگے لکھتے ہیں:-

''اس خاص بات کے علاوہ شبلی کے محاکے کے اصول بہت حد تک سائنٹفک ہیں۔ انھوں نے سب سے پہلے شاعری کو پرکھنے کے صحیح اصول واضح کئے ہیں، پھر دونوں شاعروں کی تقابلی اہمیت ان اصولوں کی روشنی میں ظاہر کی ہے''۔ [2]

جس وقت علامہ شبلی ''موازنۂ انیس و دبیر'' لکھنے کی تیاری کر رہے تھے، اس وقت ان کے ذہن میں وہ اصول تھے جنھیں ''مقدمہ شعر و شاعری'' کی روح کہا جا سکتا ہے۔

عالم اسلام کی ترقی اور ہندوستان کے مسلمانوں، خاص طور سے اردو کے شعراء کو صحیح راستے پر لانے کے لیے شبلی نے جب اردو کے قدیم شعری سرمایہ کا مطالعہ کیا تو ان کو اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ اپنی بات کہنے کے لیے انیس اور دبیر سے زیادہ کوئی موضوع نہیں ہو سکتا۔ انیس کے یہاں سادگی ملتی ہے تو دبیر کے یہاں شوکت لفظی یہی وجہ ہے کہ موازنہ انیس و دبیر لکھ کر علامہ شبلی نے روزمرہ و محاورہ، فصاحت اور بلاغت کے معیارات متعین کئے۔

علامہ شبلی نعمانی جب عالم اسلام کی ترقی کے بارے میں فکرمند ہوتے ہیں تو فرماتے ہیں:-

''آج اگر اسلاف موجود ہوتے تو ..... تمام علوم و فنون کے متعلق قدیم و حال کی تخلیقات کا موازنہ کرتے اور ان دونوں کے عیب و ہنر دکھا کر فیصلہ کرتے کہ کیا چیزیں کس حد تک قبول کے قابل ہیں اور ان کی تخلیقات کو علوم قدیمہ کی روش کیونکر بدل سکتی ہے۔ ان کی روشنی میں ہم اس قدر معلوم کر سکتے ہیں کہ نئے راستے میں کیونکر قدم اٹھانا چاہیے اور قدیم و جدید راہیں کہاں جا کر مل جائیں گی۔'' [3]

سوانح لکھنے کی یہی بنیادی وجہ ہے۔ اسی وجہ سے ہیروز آف اسلام پر قلم اٹھایا اور تاریخی تصانیف مرتب کیں۔ علامہ نے یہ سارے کام ایک بہت سوچی سمجھی اسکیم کے تحت انجام دیے۔ اس کے بارے میں

---

[1] سرسید اور ان کے نامور رفقاء۔ سید عبداللہ صفحہ ۲۴۴

[2] سرسید اور ان کے نامور رفقاء۔ سید عبداللہ صفحہ ۲۴۴

[3] شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں۔ عبداللطیف اعظمی صفحہ ۷

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

عبدالطیف اعظمی نے لکھا ہے:-

''مولانا نے تصنیف وتالیف شروع کرنے سے قبل، ایک طرف تو اردو کا جائزہ لیا اور بدلے ہوئے زمانے اور یورپ کی بڑھتی ہوئی ترقی پر نظر ڈالی اور دوسری طرف اسلاف کے علمی کارناموں اور عہد دولت عباسیہ کی علمی خدمات اور دوسری زبانوں سے تراجم کو بہ نظر غائر دیکھا اور ایک مکمل اسکیم مرتب کی.....''[1]

شبلی کی تمام تحریروں میں یہی اسکیم رونما نظر آتی ہے اور جب یہ اسکیم پوری طرح تیار ہوگئی تو اس طریقہ کار پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی:-

''جس قسم کے مضامین پر آج کل یورپ میں تصنیفات ہو رہی ہیں۔ ان میں موازنہ کرتے ہوئے بتایا جائے کہ مسلمانوں کا طرز تصنیف کیا تھا اور یورپ کا طرز تصنیف کیا تھا۔ مثلاً تاریخ اسماء الرجال معانی وبلاغت، تحقیقات مذہب میں عربی زبان میں کثرت سے تصانیف موجود ہیں۔ ان ہی مضامین نے یورپ میں نئے نئے اسلوب اختیار کئے ہیں، موازنہ کر کے بتایا جائے کہ ان دونوں کے مختلف خصوصیات کیا ہیں اور کس کو کس حیثیت سے ترجیح ہے''۔[2]

اس طرح بالواسطہ طور پر شبلی نے تقابلی تنقید کے نمائندہ خطوط مرتب کئے۔ جن پر مستقبل میں تقابلی نقاد چل سکتے تھے۔ شبلی کا ماننا ہے کہ یہ ملک وقوم میں تبدیلی لانے کا بہترین طریقہ ہے لہٰذا شبلی نے اپنی تاریخی اور سوانحی تصانیف میں جو تحقیقات کی ہیں ان میں یہ بھی ہے کہ اپنی قوم کو راہ مستقیم پر لانے کے لیے اسلاف سے اپنا مقابلہ کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ ہم میں کیا کمی ہے۔

شبلی کا تنقیدی عمل مشرقی شعریات پر مبنی ہے اور اسی شعریات کے مسلمات سے ماخوذ ہے، لہٰذا ان کی ساری اصطلاحات وہیں سے لی گئی ہیں۔ بحث کا آغاز کرتے ہوئے وہ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:-

''جو الفاظ اور جو خاص ترکیبیں اہل زبان کی بول چال میں زیادہ مستعمل اور متوادل ہوتی ہیں، ان کو روزمرہ کہتے ہیں۔ روزمرہ اگرچہ ایک جداگانہ وصف سمجھا جاتا ہے،

---

[1] شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں۔ عبدالطیف اعظمی صفحہ ۶۸

[2] شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں۔ عبدالطیف اعظمی، صفحہ ۷۲

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

لیکن دراصل وہ فصاحت کا ہی ایک جزو خاص ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ عام بول چال میں وہی الفاظ زبان پر آئیں گے۔ جو سادہ صاف اور سہل الادا ہوں اور اگر ان میں کچھ ثقل اور گرانی بھی ہو تو رات دن کی بو چال اور کثرت استعمال سے وہ منجھ کر صاف ہو جاتے ہیں۔ روز مرہ کے لیے فصیح ہونا لازمی ہے۔ میر انیسؔ کے کلام میں روز مرہ اور محاورے کا استعمال پایا جاتا ہے''[1]

میر انیس کے کلام میں زبان کے امکانات کا گہرا شعور ملتا ہے اور ان کے استعمال کا انھیں ایسا سلیقہ ہے جس کو ہم کلاسیکی معیار ادب کہہ سکتے ہیں لیکن انیسؔ انھیں مفاہیم کی ترسیل کے سہارے بہت دور تک نہیں جا پاتے ہیں۔ ان کے ہاں سلاست، روانی اور ہمواری پائی جاتی ہے۔ وہ لفظوں کے آر پار دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہ الفاظ ہمیں وسیع فضاؤں سے آشنا کرتے ہیں۔ مماثلت کو برتنے کے لیے انیس قطعیت پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ بالواسطیت، گھناپن جیسے عناصر شعری ان کے کلام میں ملتے ہیں اور یہ شاعری کی اہم خصوصیات ہیں۔ زبان کو روز مرہ یا محاورے کے مطابق استعمال کرتے ہیں۔ زبان کے نئے نئے مرکبات کو وجود میں لاتے ہیں اور انھیں تخلیقی حسن کے ساتھ اس طرح کام میں لاتے ہیں کہ ان کے نئے نئے رنگ ہمارے سامنے آتے ہیں۔ انیس کے یہاں مجسمہ سازی اور تصویر کشی کا فن ہے ان کے کلام میں مختلف النوع نقوش کو اجاگر کرنے کی ایسی صلاحیت ہے جو کثیر العناصری یا گنجان پن کا تاثر پیدا کرتی ہے۔ اور معانی کی گونا گوں جہات اور ابعاد کو ہمارے سامنے لاتی ہے یعنی ان کے یہاں کسی طرح کی محدودیت کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ دیانت داری قاری کے ذہن پر پڑھتے وقت یہ چیز حاوی رہتی ہے۔ اور اس کے لیے اس محدود دائرے سے باہر نکلنا ذرا دشوار ہوتا ہے۔

موازنہ انیس و دبیر کی بنیاد پوری طرح سے انداز بیان پر ہے اور یہ انداز بیان کلاسیکی اصولوں پر مبنی ہے اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ شبلی نے دو اصطلاحیں یعنی فصاحت اور کو بلاغت کی مدد سے شعراء کا معیار متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان دونوں اصطلاحوں کو مشرقی شاعری میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔

فصاحت اور بلاغت کے درمیان جو امتیاز انھوں نے قائم کیا اس کا حاصل یہ ہے کہ فصاحت سے مراد سہولتِ اظہار، اس کے وسائل اور متعلقات ہیں یعنی ایک نوع کی سفافیت (TRANSPARENCY)

---

[1] موازنہ انیس و دبیر۔ علامہ شبلی نعمانی صفحہ۔ ۳۰

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

جسے عام طور سے سلاست، روانی اور برجستگی کا نام دیا گیا ہے۔ اس کے بالمقابل بلاغت کا تعلق الفاظ سے کم معانی سے زیادہ ہے۔ اسے ایک طرح کی پیچیدگی بالواسطہ پن اور ذومعنویت (AMBIGUITY) کا ہم پلہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

جدید نقطۂ نظر سے دیکھنے پر بھلے ہی یہ اصطلاحات ہمیں کافی نہ لگتی ہوں۔ مگر مرثیہ گوئی کے معاملہ میں اس امر کو اہم کہا جاسکتا ہے۔ اس صنف سخن کا تعلق واقعہ نگاری سے ہے اور اس کی رسمیات طے شدہ ہیں۔ مراد یہ ہے کہ اس کے موضوعات کو تاریخی/اساطیری کا ایک اہم جزو قرار دیا جاسکتا ہے۔

لہٰذا انیس نے تنقید اور توضیح پر ہی زبان و بیان کا سارا زور صرف کیا ہے۔ تحت الشعوری یا انفرادی یادوں اور تجربوں کو ادبی اظہار کی بنیاد نہیں بنایا ہے ۔ میر انیس نے جذبات و احساسات کی آئینہ داری، نقش گری اور بیان (RECITAL) کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ وہ مختلف تلازمات یا تفسیر و تعبیر وغیرہ سامنے نہیں لاتے ہیں حقائق اور مصدقہ و معلوم واقعات کو ہنرمندی اور حسن کے ساتھ معرض اظہار میں ڈھالتے ہیں۔ تجربے کی گہرائی اور ندرت کو مد نظر رکھتے ہیں ۔انیس کے یہاں فصاحت کو ایک بنیادی مفروضہ (DATUM) کی حیثیت حاصل ہے۔

شبلی نے بلاغت کو فصاحت کا یک حصہ قرار دیا ہے۔ دور قدماء سے برابر ان اصطلاحات کا استعمال ہوتا رہا ہے۔ کم و بیش انیسویں صدی تک یہ اصطلاحات مفید سمجھی جاتی رہیں۔ مگر شعر و ادب کی تحسین کے لیے جدید دور میں ان اصطلاحات کو ناکافی سمجھا گیا۔ شبلی کے نزدیک فصاحت روانی اور برجستگی کا نام ہے۔ تصنیف کے آغاز میں انھوں نے یہ خیال پیش کیا ہے:-

> ''ہر لفظ چونکہ ایک قسم کا سُر ہے اس لیے ضروری ہے کہ جن الفاظ کے سلسلے میں وہ ترکیب دیا جائے ان آوازوں سے اس کو خاص تناسب بھی ہو ورنہ گویا دو مختلف سُروں کو ترتیب دینا ہوگا۔ نغمہ اور راگ مختلف آوازوں یا سروں کا نام ہے۔ ہر سُر بجائے خود دلکش اور دل آویز ہے۔ لیکن اگر دو مختلف سروں کو باہم ترکیب دے دیا جائے تو دونوں مکروہ ہو جائیں گے۔ راگ کے دلکش اور موثر ہونے کا گر وہی ہے کہ جن سُروں سے اس کی ترتیب ہو، ان میں انتہائی توازن اور تناسب ہو''[1]

---

[1] موازنہ انیس و دبیر۔ شبلی نعمانی صفحہ ۲۵

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

بالکل یہی الفاظ ان کے مضمون ''فن بلاغت'' میں ملتے ہیں[1] اس سے جو بات ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ کہ تنا فر لفظی فصاحت کو حاصل کرنے میں رکاوٹ بنتی ہے اور الفاظ کی باہمی عدم آہنگی تنافر کا نتیجہ ہے۔ موسیقی میں ترنم کا دارومدار تناسب اور توازن پر سُروں کی کامل مطابقت اور ہم آہنگی اور سروں کے باہم امتزاج پر ہوتا ہے اور اس سے خلفشار نہیں پیدا ہوتا ہے۔

شبلی کا خیال ہے کہ تشبیہ واستعارہ کی جڑیں مماثلت (ANALOGY) میں ہیں۔ دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ تشبیہ میں مماثلت واضح اور خارجی سطح پر ہوتی ہے اور اس کو آسانی کے ساتھ ادراک کی گرفت میں لایا جاسکتا ہے۔ استعارہ میں مماثلت مستہزاد اور اندرونی سطح پر پائی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ امر بھی غور طلب ہے کہ استعارہ فن تدبیر قرار دیا جاسکتا ہے۔

شبلی نے تشبیہ کی دو قسمیں بتائی ہیں۔

(۱) مفرد (۲) مرکب

''مفرد'' جس طرح چہرے کو پھول سے تشبیہ دی جائے۔ اور مرکب یہ کہ جس طرح کہا جائے کہ میدان جنگ میں گرد اٹھی تو اس میں تلواریں اس طرح چمک رہی تھیں جیسے شب کو ستارے ٹوٹتے ہیں''[2]

علامہ شبلی نعمانی نے موازنہ انیس ودبیر کا بیشتر حصہ میر انیس کے شعری کارنامے کی پرکھ کے لیے وقف کیا ہے۔ اس محاکمے کے دوران مرزا دبیر پر نظر ذرا کم ہی پڑتی ہے۔ شبلی کا بیشتر سروکار میر انیس کے سلسلے میں یہ بتانے پر ہے کہ انیس اپنے کلام کی تزئین وآرائش میں زیادہ تر تشبیہات کے خوگر ہیں۔ استعارے وہ بہت زیادہ استعمال نہیں کرتے ہیں۔ اور اس میں کافی حد تک سچائی بھی ہے۔ مراثی انیس میں دونوں طرح کی تشبیہات کی مثالیں ملتی ہیں یعنی مفرد بھی اور مرکب بھی۔

تعریف میں چشمے کو سمندر سے ملا دوں
قطرہ کو جو دوں آب تو گوہر سے ملا دوں
ذرے کی چمک مہر منور سے ملا دوں
کانٹوں کو نزاکت میں گل تر سے ملا دوں

---

[1] فن بلاغت حوالہ: مقالات شبلی جدل دوم مطبوعہ اعظم گڈھ ۱۹۳۱ء

[2] موازنہ انیس ودبیر صفحہ ۶۹

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

یوں برچھیاں تھیں چار طرف اس جناب کے
جیسے کرن نکلی ہے گرد آفتاب کے

مقتل میں کیا ہجوم تھا اس نورعین پر
پروانے گر رہے تھے چراغ حسین پر

انھیں شبلی نے استعارہ کو براہ راست اور چشم زدن میں عرفان و انکشاف حقیقت کے ایک لطیف وسیلے کے طور پر برتا ہے۔ اس میں مفہوم (SENSE) اور حسّی ذریعے (SENSIBLE) کے درمیان ادغام کلی وقوع پذیر ہوتا ہے۔ استعارہ کو استعمال کرنے کے لیے انیس خارجی معروضی اور حسی ذریعے کے درمیان تعامل کو ظاہر کرنے کے لیے اپنی لسانی صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہیں۔ انیس نے پایانِ کا روابستگیوں کے تانے بانے کو متعین کیا اور نمایاں کیا۔ جو تجربے کے خلفشار کے باوجود بھی اشیاء کے بیچ موجود رہتا ہے۔ لیکن اسے عام انسانوں کی نظرین نہ دیکھ سکتی ہیں اور نہ ہی نمایاں کر سکتی ہیں۔

شعر کی دل فریبی اور دل آویزی کا ایک بڑا نکتہ اس کو قرار دیا جاتا ہے کہ ہر مضمون کے مناسب بحریں استعمال اور اختیار کی جائیں۔

قدیم مرثیوں میں ردیف کا استعمال بہت کم کیا جاتا تھا صرف قافیوں کا ہی التزام کیا جاتا تھا۔ میر انیس نے ردیف کا التزام کیا۔ عربی میں ردیف بہت بدنما لگتی ہے لیکن فارسی اور اردو میں ردیف کی مثال ایسی ہے جیسے سم و تال۔ اگر راگ میں تال نہ پایا جائے تو وہ بدمزہ رہتا ہے۔ اردو شعر کی بھی یہی حالت ہے۔ ردیف کے التزام کے لیے بڑا قادر الکلام ہونا شرط ہے۔ ورنہ یہ ہوتا ہے کہ ردیف کے التزام کے ساتھ آمد اور بے ساختگی قائم نہیں رہ پاتی ہے۔ یہ دو شعر ملاحظہ فرمائیں۔

ساقیا، عید ہے لا بادے مے مینا بھر کے
کہ مے آشام پیاسے ہیں مہینا بھر کے

چاہنا خلق کو صبا و صنم سے محروم
ایسی نیت یہ بہشت آپ کو واعظ معلوم

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

دونوں شعر بہت اچھے ہیں لیکن پہلے شعر میں ردیف کی وجہ سے الگ ہی شان پیدا ہوگئی ہے۔ بعض جگہ ردیف کی تکرار سے نہایت لطف پیدا ہو جاتا ہے۔ میر انیس کے یہاں اس کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔

کیں صفیں صاف، مگر منھ کی صفائی نہ گئی
سینکڑوں خون کیے اور کہیں آئی نہ گئی

شیطاں عمر، سعد کی گردن پہ چڑھا ہے
بھاگو، پسر شیر خدا رن پہ چڑھا ہے

رکتا نہ تھا علی ولی پسر کا ہاتھ
دو ہو کے گر پڑا جسے مارا کمر کا ہاتھ

میر انیس پر تفصیلی بحث کے بعد شبلی جب مرزا دبیر کی طرف توجہ کرتے ہیں تو کلام کا آغاز اس طرح کرتے ہیں:-

''اس کے ساتھ الفاظ میں فصاحت، سلاست، روانی، بندش میں چستی اور چستی کے ساتھ بے تکلفی، دلآویزی اور برجستگی، لطیف و نازک تشبیہات اور استعارات، اصول بلاغت کے مراعات، ان تمام اوصاف میں سے کون سی چیز مرزا دبیر میں پائی جاتی ہے۔ فصاحت ان کے کلام کو چھو نہیں گئی، بندش میں تعقد و اغلاق، تشبیہات و استعارات اکثر دور از کار، بلاغت نام کو نہیں کسی چیز یا کسی کیفیت یا حالت کی تصویر کھینچنے سے بالکل عاجز ہیں۔ خیال بندی اور مضمون آفرینی البتہ ہے لیکن اکثر جگہ اس کو سنبھال نہیں سکے''۔[1]

شبلی نے تعقد اور غرابت لفظی کی مثالیں تو دبیر کے کلام سے پیش کی ہیں لیکن یہ کہنا کہ وہ کسی حالت یا کیفیت کی تصویر بالکل نہیں کھینچ سکتے ہیں، انصاف سے پرے ہے۔ شبلی نے بہت ہی مجبوری میں دبیر کی اس خوبی کا اعتراف کیا ہے کہ مضمون بندی اور خیال آفرینی ان کے یہاں پائی جاتی ہے۔ لیکن ساتھ میں یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کو سنبھال نہیں پاتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ دبیر کے یہاں خود ضبطی نہیں پائی جاتی ہے۔

---

[1] موازنۂ انیس و دبیر صفحہ ۳۳۴

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

یہ چیز شبلی کو کھلتی ہے اور وہ اس کو سند قبولیت نہیں دینا چاہتے ہیں۔ آگے لکھتے ہیں:-

''ان کا (انیس) اصلی جوہر بندش کی چستی، ترکیب کی دل آویزی، الفاظ کا تناسب اور برجستگی وسلاست ہے۔ یہ چیزیں مرزا صاحب کے یہاں بہت کم ہیں۔ ایک ہی مصرع میں ایک لفظ نہایت بلند اور شاندار ہے اور دوسرا مبتذل اور پست ہے۔ بند کا ایک شعر اس زور وشور کا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ بادل گرجتا آرہا ہے اور دوسرا بالکل پھیکا اور کم وزن ہے۔ دو تین بند صاف اور سلیس نکل جاتے ہیں پھر تعقد اور بے ربطی شروع ہو جاتی ہے۔ اکثر جگہ اشعار بڑے دھوم دھام کے ہیں۔ لیکن حاصل کچھ نہیں''۔[1]

پھر خاص طور پر مرزا دبیر کے بارے میں کہتے ہیں۔

''وہ نہایت دقیق اور بلند مضامین پیدا کرتے ہیں، لیکن مناسب الفاظ ہاتھ نہیں آتے اس لیے مضمون ایک گورکھ دھندا بن کر رہ جاتا ہے''[2]

''مرزا صاحب کے کلام کا خاص جوہر تشبیہات اور استعارات ہیں اس میں شبہ نہیں کہ وہ اپنی دقت آفرینی سے ایسی عجیب اور نادر تشبیہات اور استعارات پیدا کرتے ہیں جن کی طرف کبھی کسی کا ذہن منتقل نہیں ہوا ہوگا۔ لیکن اس زور میں وہ اس قدر بلند اڑتے ہیں کہ بالکل غائب ہو جاتے ہیں''[3]

پھر اس مقدمے کی توثیق ان الفاظ میں کرتے ہیں:-

''اس میں کچھ شبہ نہیں کہ مرزا صاحب کی قوت متخیلہ نہایت زبردست ہے۔ وہ اسی قدر دور کے استعارات اور تشبیہات ڈھونڈ ڈھونڈ کر پیدا کرتے ہیں کہ وہاں تک ان کے حریفوں کا طائر وہم پرواز نہیں کر سکتا..... وہ قوت متخیلہ کے زور سے نئے نئے اور عجب دعوے کرتے ہیں اور خیالی استدلال سے ثابت کرتے ہیں''[4]

---

[1] موازنہ انیس ودبیر صفحہ ۳۳۸

[2] موازنہ انیس ودبیر صفحہ ۲۱۶

[3] موازنہ انیس ودبیر صفحہ ۲۴۹-۲۴۸

[4] موازنہ انیس ودبیر صفحہ ۵۲

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

اور پھر تتمہ کلام کے طور پر لکھتے ہیں:۔ ''مختصر یہ کہ خیال آفرینی دقت پسندی، حدت استعارات، اختراع، تشبیہات، شاعرانہ استدلال، شدت مبالغے میں ان کا جواب نہیں۔ کبھی پھبتیاں بن جاتی ہیں اور کہیں محض فرضی خیال رہ جاتا ہے۔[1]

جیسا کہ ہم جانتے ہیں مراثی انیس و دبیر میں کربلا کے واقعات موضوع کے اعتبار سے مشترک ہیں ۔ یہاں پر ان واقعات کی AUTHENTICITY سے بحث کرنا مقصود نہیں ہے یہاں صرف اتنا بتانا ہے کہ حضرت حسینؓ اور یزید کی فوج سے نبرد آزمائی ہے اور اس کے نتیجے کے طور پر ہزیمت و پسپائی اور شکست جہاد میں شرکت کے لیے اہل بیت اور جاں نثاروں کا جانا، اس میں ان کی شہادت، عورتوں اور بچوں کی آہ و بکا، ان کی قوت برداشت کا آزمایا جانا، ان کا ایک دوسرے کے لیے جذبات کا اظہار کرنا آمد رزمیہ کے عناصر جن میں تلواروں اور گھوڑوں کے سراپے کا بیان بھی ہے۔ یہ سب ایسے حادثات، مواقع اور واقعات ہیں جو کسی نہ کسی طور پر تسلیم کر لیے گئے ہیں ۔ان میں ڈرامائی عنصر بھی پایا جاتا ہے ۔ اس میں تشویش کی حالت یعنی (SUSPENSE) کی کیفیت اور کشمکش کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔ جس سے جذبات شدید طور پر متاثر ہوتے ہیں۔ شبلی لکھتے ہیں:۔

شاعری درحقیقت مصوری ہے اور یہ ظاہر ہے کہ مادیات اور محسوسات کی تصویر کھینچنا ہو تو کسی قسم کی تخیل اور دیدہ وری کی ضرورت نہیں۔[2]

شبلی کا ماننا ہے کہ مرتعش جذبات اور احساسات کی تصویر کھینچنے کے لیے تخئیل کی پوری اور فمر اواں تو انائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کی بہت اچھی مثال انیس کا وہ مرثیہ ہے جس کی ابتدا اس شعر سے ہوتی ہے۔

آج شبیر پر کیا عالم تنہائی ہے
ظلم کی چاند پر زہرا کے گھٹا چھائی ہے

اسی کا ہم پلہ دبیر کا مرثیہ بھی ہے جس کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے

کس شبیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے
رن ایک طرف چرخ کہن کانپ رہا ہے

---

[1] موازنہ انیس و دبیر صفحہ ۲۴۹-۳۵۲

[2] موازنہ انیس و دبیر صفحہ ۸۵

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

ایک دوسرا مرثیہ کچھ اس طرح ہے

جب سرنگوں ہوا عالمِ کہکشانِ شب

خورشید کے نشاں نے مٹایا نشانِ شب

جن کیفیات اور مواقع کا ذکر ان مراثی میں کیا گیا ہے، شبلی کے مطابق انھیں نبھانے میں انیس کو زیادہ مہارت حاصل ہے۔ اس اعتبار سے انیس کو دبیر پر فوقیت حاصل ہے۔ غالباً اس سے شبلی کی مراد یہ ہے کہ ایسی انسانی نفسیات میں دبیر سے زیادہ انیسؔ درک رکھتے ہیں۔

مرثیہ پر ایک اعتراض ایسا ہے جس کا مورد دونوں کو ٹھہرایا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ کربلا کے واقعات کا تعلق عربی ماحول سے ہے۔ لیکن انھیں اس طور پر پیش کیا گیا ہے کہ گویا یہ واقعات ہندوستان میں بالخصوص لکھنؤ میں رونما ہوئے ہیں۔ اس اعتراض میں کافی حد تک سچائی ہے لیکن یہ بھی دھیان میں رکھنا چاہیے کہ یہ دونوں حضرات لکھنؤ میں بیٹھ کر یہ مراثی لکھ رہے تھے تو وہ عربوں کا محاورہ گفتگو کیسے پیدا کر سکتے تھے اور یہ التباس کیسے پیدا ہو سکتا تھا۔ ان مراثی میں مقامی رنگ کا پایا جانا فطری بات ہے۔

میر انیس کے محاکے کے سلسلے میں اور موازنے کے دوران بھی شبلی نے بند کے بند تو لکھ ڈالے ہیں لیکن ایسا بہت کم ہوا ہے کہ متن کے خاص خاص اجزاء پر انھوں نے اظہار خیال کیا ہو اور اس پر تجربے کا عمل کیا ہو۔ ایک ہی صورت حال، واقعہ یا فضا کو دھیان میں رکھتے ہوئے یہ مفرد اشعار سے زیادہ سروکار رکھتے ہیں۔ لیکن موضوع کی یکسانیت کے اعتبار سے بھی مفرد اشعار کے انتخاب سے ایک غلط طریقہ کار کی غمازی ہوتی ہے۔

شبلی کے ذہن پر فصاحت بہ معنی سادگی، روانی اور سلاست اور پاکیزگی کا اتنا گہرا نقش ہے کہ ان کے لئے لسانی اظہار کے کسی اور پیرائے کا تصور کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ شبلی نے بہت ہی سادگی کے ساتھ بلاغت کو بھی فصاحت سے ملا دیا ہے اس کے باوجود کہ وہ بلاغت کا رشتہ معانی سے اور فصاحت کا رشتہ الفاظ سے جوڑتے ہیں شبلی کے یہاں تشبیہات واستعارات کے بیچ امتیاز وفرق کا کوئی واضح تصور نہیں ملتا ہے۔ خیال آفرینی اور مضمون کو وہ قابلِ تعریف تو قرار دیتے ہیں لیکن ان کے نزدیک یہ کمتر درجہ کی چیزیں ہیں وہ قوت متخیلہ کے بھی قائل ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ شاعری میں فلسفیانہ استدلال کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہوتی ہے بلکہ جذباتی منطق (EMOTIVELOGIC) کو منظر عام پر لایا جاتا ہے۔ اپنے اس اعتراض کو انھوں نے کئی بار دہرایا ہے کہ مرزا دبیر کے یہاں خیال آرائی بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔ لیکن وہ اسکو قابو میں

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

نہیں رکھ پاتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ہم اس کو اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ ان کے یہاں نظم وضبط کا فقدان ہے۔ اور اس کمی کا احساس شدت سے ہوتا ہے۔ لیکن شبلی نے ان کی وضاحت اس طرح نہیں کی ہے جس طرح کے تنافر لفظی اور غرابت لفظی کی وضاحت کی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شبلی کے ذہن میں اصلاحات کا ایک تسلیم شدہ اور مروجہ سانچہ تھا جس میں انھوں نے اپنی گفتگو کا آغاز کیا اور اپنے مقدمے کو اس سانچے میں رکھ کر پیش کیا اور اختتام کو پہنچا دیا۔ اس سانچہ میں جن ادبی اور تنقیدی قدروں کو ایک مقام حاصل ہے وہ سادگی، اصلیت، ہمواری، بندش کی چستی اور برجستگی ہیں۔ خیال آفرینی، دقت نظر، طرفگی اور مبالغہ، جس کو شاعری کا مابہ الامتیاز مانا جاتا ہے کو کم اہمیت دی ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ نہیں دی ہے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔

میر انیس کے یہاں فصاحت کے علاوہ ارتعاش اور تہذیب ہے، احساسات اور جذبات کی جو نرمی ہے، موقع ومحل کے اعتبار سے ان کے مدارج میں جو فرق ہے، اس کا شبلی کے یہاں کوئی ذکر نہیں ملتا ہے۔ اسی طرح مرزا دبیر کے یہاں معلوم ومانوس سے ماورا ہونے کی جو صلاحیت ہے اور جو نکتہ آفرینی پائی جاتی ہے، اس کی طرف بھی انھوں نے کچھ خاص توجہ نہیں کی ہے۔ شبلی نے بہت سی باتوں کو موازنے میں کچھ اس طرح خلط ملط کر دیا ہے کہ ایک طرح کی الجھن کا احساس ہوتا ہے۔

شبلی میر انیس کے سلسلے میں جائز حدود کو پار کر گئے ہیں انھوں نے جانب داری سے کام لیا ہے شبلی شعرالعجم کی جلد چہارم میں اور موازنے میں تخیل کی بے پناہ قوت کو تو تسلیم کرتے ہیں جس کی مدد سے ہم لا محدود امکانات کا پتا لگاتے ہیں اور نئی نئی دنیاؤں کی تخلیق کرتے ہیں۔ لیکن وہ نہ تو اس صلاحیت کو ممیز کرتے ہیں جس کے ذریعہ ہم اس میں اعتدال پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جسے ہم حس امتیاز یا قوت فیصلہ کا نام دے سکتے ہیں اور نہ ہی خیال آفرینی کے متعلق کوئی مثبت رویہ اختیار کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ موازنے میں ہمیں اس بصیرت کا احساس نہیں ہوتا جیسا کہ حالی کی ''یادگار غالب'' میں ہوتا ہے۔

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

ح-موازنہ انیس ودبیر پر اعتراضات کا ادبی محاکمہ

''موازنہ انیس ودبیر'' علامہ شبلی کا مایہ ناز کارنامہ ہے۔ علامہ کی تمام تصانیف میں اردو کے تدریسی حلقوں میں یہ تصنیف سب سے زیادہ متداول مروج اور مقبول ہے۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ ''موازنۂ انیس ودبیر'' کے علاوہ اردو شعر وسخن پر شبلی کی کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے۔ علامہ نے اس تصنیف کا مقصد ان الفاظ میں بیان کیا ہے:-

> ''مدت سے ارادہ تھا کہ کسی ممتاز شاعر کے کلام پر تقریظ وتنقید لکھی جائے، جس سے اندازہ ہو سکے کہ اردو شاعری، باوجود کم مائیگی زبان کیا پایہ رکھتی ہے؟ اس غرض کے لیے میر انیس سے زیادہ کوئی شخص انتخاب کے لیے موزوں نہیں ہوسکتا تھا کیوں کہ ان کے کلام میں شاعری کے جس قدر اصناف پائے جاتے ہیں، اور کسی کے کلام میں نہیں پائے جاتے ہیں''[1]

شبلی موازنۂ انیس ودبیر کا ایک تمہید سے آغاز کرتے ہیں، اس میں سب سے پہلے علامہ نے یہ بیان کیا ہے کہ شاعری کی اہیب اور شعر کا معیار کیا ہونا چاہیے۔ اشخاص مرثیہ کا تعارف پیش کیا ہے۔ اس کے بعد مرثیہ گوئی کی اجمالی تاریخ کا ذکر کیا گیا ہے۔

تمہیدی حصے کو لکھنے کے بعد انیس کی شاعرانہ خصوصیات شروع ہوتی ہیں۔ اس حصے میں مولانا نے تشبیہ واستعارہ، روزمرہ ومحاورہ، فصاحت اور بلاغت اور مختلف صنائع وبدائع کی تعریف کرنے کے بعد انھیں انیس کی شاعری پر منطبق کرنے کی کوشش کی ہے۔ پھر منظر نگاری، واقعہ نگاری، کردار نگاری اور محاکات وغیرہ عنوانات قائم کئے گئے ہیں اور انیس کے بہترین مراثی مثال کے طور پر پیش کئے گئے ہیں پھر سلام، رباعیات، اعتراضات اور سرمات سے متعلق بھی ابواب ہیں۔ اور آخر میں انیس ودبیر کے کلام کا مقابلہ وموازنہ کرایا گیا ہے۔ اور یہیں یہ تصنیف اپنے اختتام کو پہنچ جاتی ہے۔

---

[1] موازنہ انیس ودبیر-علامہ شبلی نعمانی، انوار المطابع لکھنؤ (دیباچہ) صفحہ ۲،۳

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

میر انیس کا انتقال ۱۸۷۴ء میں اور مرزا دبیر کا ۱۸۷۵ء میں ہوا۔ اس وقت یہ دونوں شہرت کے عروج پر تھے۔ لیکن کچھ وجہوں سے ان کی مقبولیت ایک خاص حلقہ تک محدود تھی۔ اکثر و بیشتر اسی وجہ سے تذکرہ نگاروں نے ان کا ذکر ہی نہیں کیا ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے غالباً سب سے پہلے ناقدانہ اور علمی انداز میں ''آب حیات'' میں ان کی جانب توجہ کی اور باوجود بہت سے موانع کے ان کا مقام متعین کرنے کی سعی کی ہے۔ پھر اردو مرثیہ کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے حالی نے مختصر طور پر انیس کی شاعرانہ عظمت کی طرف متوجہ کیا ہے۔ سب سے بعد میں میر انیس پر اور ضمناً مرزا دبیر پر علامہ شبلی نے ''موازنہ انیس و دبیر'' میں مفصل تبصرہ پیش کیا ہے۔ لہٰذا اس دور کے تینوں ممتاز نقادوں نے اپنے اپنے طور پر مرثیہ نویسوں اور مرثیہ نگاری کے متعلق اپنی رائے پیش کر کے اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان کا تعلق صرف مذہبی ادب سے ہے۔

پہلی دفعہ مرثیہ کے شاعرانہ پہلوؤں کی طرف دھیان دیا گیا اور اس کی اہمیت وحیثیت متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ علامہ کے موازنہ کو مبسوط ہونے کی بنا پر سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔

شعر وادب میں سیرت اور شخصیت سے علیحدہ علامہ شبلی کی زندگی کے بہت سے پہلو ہیں وہ شاعر، مورخ، نقاد، فلسفی، سوانح نگار سب کچھ ہیں۔ ان کی شخصیت میں ان مختلف ادبی حیثیتوں کی وجہ سے ایک نوع کی رنگینی پیدا ہوگئی ہے۔ ان کی ذات اور علمی کاوشیں اسی وجہ سے کبھی نہ ختم ہونے والی بحث کا موضوع بن گئی ہیں۔ کوئی بھی رائے قائم کرنے میں اس عہد کی غیر متوازن اور پیچیدہ تہذیبی اور سماجی نوعیت کی وجہ سے دشواریاں پیدا ہوگئی ہیں علمی، اخلاقی، سماجی اور مذہبی اصول، جو صدیوں سے بنے ہوئے تھے اور ان میں کسی تبدیلی کی امید نہیں تھی۔ بحث کا موضوع بنے ہوئے تھے۔ نہ قدیم کے ساتھ لگے رہنا آسان تھا اور نہ ہی ہر نئی آواز کے ساتھ چلا جا سکتا تھا۔ اس وقت اپنے جذبات، علم اور ذہن کی قوت کی مدد سے مسائل کو سمجھنا اور پرکھنا اتنا سہل نہ تھا جتنا آج ہوتا ہے۔ ان حقیقتوں کا جن لوگوں کو احساس نہیں ہے وہ سرسید حالی اور شبلی اور آزاد کے متعلق سطحیت، کم بینی اور لاعلمی کے الزامات لگا سکتے ہیں۔ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ہم ان کا تنقیدی جائزہ نہ لیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ امر بھی قابل غور ہے کہ ان حضرات سے ہم علم و آگہی کے وہ مطالبات نہیں کر سکتے ہیں جن سے آج کے نقاد بہرہ ور نظر آتے ہیں۔ ان سے بہرہ ور ہونے کے باوجود نہ انھیں اپنے تہذیبی اور ادبی سرمائے سے کوئی لگاؤ ہے، نہ ان میں ان سے صحیح کام لینے کی صلاحیت ہے اور نہ ہی مخلصانہ غور وفکر سے کام لینا چاہتے ہیں۔ ان ہی حقائق کی روشنی میں ہمیں علامہ کے تنقیدی کمالات کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

ساتھ ہی یہ بھی ذہن میں رہنا ضروری ہے کہ مختلف رجحانات میں وہ کسی خاص رجحان ہی کو کیوں پسند کرتے ہیں۔ علامہ کے کسی مخصوص نقطۂ نظر کو اختیار کرنے میں ان کی ابتدائی مذہبی تعلیم، خانگی ماحول، سرسید کی اصلاحی تحریک، علی گڈھ میں قیام، مشرق ومغرب، قدیم وجدید کی کشمکش، دوسرے علماء کے تصورات، عام قومی بیداری، بیرونی اسلامی ممالک میں تجدد کی ابتداء، مسلمانوں کے لیے نئے لائحہ عمل کی تلاش، ادبی ماحول سب چیزوں کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ اسی کو پیش نظر رکھ کر کلیم الدین احمد نے یہ لکھا:-

''شبلی کا زاویہ نظر شبلی کی تنقید کا ساز وسامان، شبلی کا اسلوب ان سب چیزوں میں پرانی تنقید کی صاف کارفرمائی ہے۔ نئی تنقید کے اصول، نئی تنقید کا زاویۂ نظر، نئی تنقید کی ٹکنیک یہ سب چیزیں کہیں نہیں ملتی ہیں''۔[1]

ڈاکٹر احسن فاروقی شبلی کو نقاد نہیں بلکہ نکتہ چین مانتے ہیں اور لکھتے ہیں:-

''بالکل حالی کے انداز میں قوم کی بداخلاقی کا رونا روتے ہیں اور مذاق کو صحیح راہ پر لگانے کا بیڑہ اٹھاتے ہیں''۔[2]

شبلی سے اصلاحی نقطہ نگاہ سے محفوظ رہنے اور نئی تنقید کے زاویہ نظر کو اپنانے دونوں کی امید نہیں کی جاسکتی ہے۔

موازنہ انیس ودبیر اور شعر العجم ان کے چھوٹے اور بڑے ادبی مقالوں کے علاوہ دو ایسی کتابیں ہیں، جن کے مطالعہ کے بعد ہم شبلی کی نقادانہ صلاحیات کے بارے میں رائے قائم کرسکتے ہیں۔ اس وقت ہمارے پیش نظر صرف ''موازنہ انیس ودبیر'' ہے۔

موضوع کے انتخاب کا مسئلہ سب سے پہلے ہمارے سامنے آتا ہے قرائن سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عربی اور فارسی شعر وادب سے علامہ اپنی ادبی دلچسپیوں کا سلسلہ شروع کرتے ہیں۔ لیکن کچھ عرصے بعد ہی اردو ادباء اور شعراء کی تصانیف ان کے مطالعہ میں داخل ہوجاتی ہیں۔ اور حجاز پاک کے سفر سے واپس آنے کے بعد اردو میں بھی غزلیں لکھنی شروع کیں۔ لکھنؤ کے ''پیام یار'' میں ان کی اس زمانہ کی زیادہ تر غزلیں شائع ہوتی تھیں۔ اور پھر جب ندوۃ العلماء میں قیام کرنا ہوا تو مولانا کے لکھنؤ سے تعلقات اور گہرے ہوگئے۔

---

[1] اردو تنقید پر ایک نظر- پروفیسر کلیم الدین احمد، فروغ اردو لکھنؤ ۱۹۵۷ء صفحہ ۱۱۷

[2] ادیب (شبلی نمبر) ستمبر ۱۹۶۰ء صفحہ ۱۰۲

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

مختصر طور پر یہ کہ ان کی لکھنؤ سے واقفیت کا وہ دور ہے جب کہ میر انیس اور مرزا دبیر کی مرثیہ نگاری لوگوں کی زبانوں پر باقی تھی۔ انھوں نے عربی ادب میں ''حماسہ'' کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ ایسا قیاس کیا جاتا ہے کہ انھیں ایسی شاعری پسند تھی جس میں حماسہ کا عکس ہوا اور انیس کے مرثیوں میں انھیں یہ جھلک نظر آئی ہو۔ ''حیات انیس'' کے دیباچے میں امجد علی اشہری نے لکھا ہے کہ مولانا شبلی نے ۱۸۹۸ء میں بذات خود ان سے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ وہ انیس پر ایک تصنیف لکھیں۔ اور یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ وہ ان کی مدد کریں گے۔ ''حیات انیس'' کے مکمل ہونے سے پہلے ہی ۱۹۰۳ء یا ۱۹۰۴ء میں علامہ نے موازنہ لکھ کر پیش کر دیا۔ حالانکہ کچھ وجوہ کی بنیاد پر یہ چھپا ۱۹۰۶ء میں۔

دوسرا اہم سبب میر انیس کی طرف متوجہ ہونے کا یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کے پیش نظر اس عہد کی زوال پذیر شاعری کی اصلاح تھی۔ اس دور کے سبھی ادیب، شاعر اور مفکر اس فکر میں تھے کہ ملک اور قوم کو کیسے اس زوال سے چھٹکارہ دلایا جائے۔ اس لیے موازنہ کی تمہید میں بھی مولانا اسی خیال کو ظاہر کیا ہے:-

> ''فلسفہ اور شاعری برابر درجہ کی چیزیں ہیں، لیکن قوم کی بدمذاقی سے جس قسم کی شاعری نے ملک میں قبول عام حاصل کر لیا ہے اس نے لوگوں کو یقین دلایا کہ اردو شاعری میں زلف و خال و خط یا جھوٹی خوشامد اور مداحی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ میر تقی کی غزلیت، درد کا تصوف، غالب کا فلسفہ شاعری کی جان ہیں، لیکن ان بیش بہا خزانوں میں سے بھی عام لوگوں کی نگاہ صرف خزف ریزوں پر پڑتی ہے۔ میر انیس کا کلام شاعری کے تمام اصناف کا بہتر سے بہتر نمونہ ہے لیکن ان کی قدر دانی کا طغرائے امتیاز صرف اس قدر ہے کہ کلام فصیح ہوتا ہے اور بین اچھا لکھتے ہیں..... اس بناء پر مدت سے میرا ارادہ تھا کہ کسی ممتاز شاعر کے کلام پر تقریظ و تنقید لکھی جائے، جس سے انداز ہو سکے کہ اردو شاعری باوجود کم مائیگی زبان کیا پایہ رکھتی ہے اس غرض کے لیے میر انیس سے زیادہ کوئی شخص انتخاب کے لیے موزوں نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ انکے کلام میں شاعری کے جس قدر اصناف پائے جاتے ہیں اور کسی کے کلام میں نہیں پائے جاتے.....''[1]

حالانکہ آزاد اور حالی میر انیس کی ادبی اہمیت کا ذکر کر چکے تھے۔ لیکن شبلی انیس کو اپنے معیاری شاعری

---

[1] موازنہ انیس و دبیر۔ علامہ شبلی نعمانی صفحہ ۲، ۳

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

اور اصولوں کی روشنی میں ایک مکمل اور منفرد شاعر ثابت کرنا چاہتے تھے انیس کو انتخاب کرنے کی ایک وجہ یہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ علامہ کی نظر میں جن شاعرانہ خصوصیات کی اہمیت تھی ان کے بہترین نمونے انھیں انیس کی شاعری میں نظر آئے۔ شعر العجم کی چوتھی جلد میں جب وہ فارسی شاعری کے سلسلے میں فن شعر گوئی سے متعلق کچھ اصولی بحثیں کر رہے تھے۔ اس وقت بھی انھوں نے انیس کی اردو شاعری سے مثالیں پیش کیں مراد یہ ہے کہ شبلی نے مختلف وجوہات کی بنا پر میر انیس کو منتخب کیا ہیرو کا جو تصور ان کے تاریخی نقطہ نظر میں ملتا ہے، اس کی بھی کارفرمائی یہاں محسوس ہوتی ہے۔ انیسؔ کی خصوصیات کو اور زیادہ واضح کرنے کے لیے مرزا دبیر کا ذکر کیا گیا ہے نہ کہ موازنہ کے لیے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ دبیرؔ کا مطالعہ مولانا نے اس گہرائی سے نہیں کیا تھا جیسا کہ میر انیس کا کیا تھا۔ مصنف ''المیزان'' کے نام ایک خط میں علامہ شبلی نے اس بات کو تسلیم کیا ہے۔ نامکمل، سرسری اور تشنہ انداز میں ''موازنۂ انیس و دبیر'' کے آخری پچاس یا ساٹھ صفحات میں مرزا دبیر کی شاعرانہ کمیوں، کوتاہوں اور خامیوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ علامہ نے دونوں شعراء کے متحد المضامین اشعار پیش کر کے موازنہ کی صورت پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اسی بنا پر اس کا نام ''موازنۂ انیس و دبیر'' تجویز کیا ہے۔ سید سلیمان ندوی کا ماننا ہے کہ اس طرح کے موازنے عربی ادب میں عام طور پر پائے جاتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شبلی کو وہیں سے اس کا خیال آیا ہوگا۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ اس میں تقابلی تنقید کے لوازمات کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ انیسؔ کو دبیرؔ پر فوقیت دینے کے لیے صرف چند مثالوں سے کام لیا گیا ہے۔ اکثر تنقید نگار یہی نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔ اس سب کے باوجود موازنہ میں اس سے ہمیں اطمینان حاصل نہیں ہوتا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا ہے کہ اردو میں تقابلی تنقید کی یہ پہلی مثال ہے۔

مولانا شبلی تحقیقی اور تاریخی ذوق رکھتے تھے۔ حالانکہ ان کی تحقیق، استنباط نتائج اور طریق کار کی مخالفت بھی ہوئی۔ اس نظریے سے ہم اگر موازنہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں موازنہ کا مقام کمتر نظر آتا ہے۔ علامہ نے نہ تو میر انیس کے حالات زندگی کو جمع کرنے کے لیے زیادہ محنت کی ہے اور نہ ہی مرثیہ کی تاریخ کو ترتیب دینے میں۔ علامہ کو عربی اور فارسی مرثیہ نگاری کا ضمنی حیثیت سے ذکر کرنا تھا، اس لیے انھوں نے اس کو مختصراً پیش کیا ہے۔ اردو مرثیہ کی تاریخ کو بھی مختصر اور سرسری طور پر پیش کیا ہے۔ اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ دکن کی مرثیہ گوئی کے متعلق معلومات اس وقت تک بہت کم تھیں۔ لیکن شمالی ہند کی تاریخ بھی تسلی بخش نہیں ہے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ علامہ نے پہلی دفعہ ''موازنۂ انیس و دبیر'' میں مرثیہ کی تاریخ کو مختصر طور پر

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ مرثیہ نگاری کے متعلق جتنی معلومات اس زمانے میں جمع ہوگئی ہیں اس کے مدنظر اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ میر انیس کی سوانح حیات کو دیکھنے سے بھی الجھن کا احساس ہوتا ہے۔ علامہ نے انیس کے انتقال کے بعد موازنہ تصنیف کیا۔ علامہ اگر لکھنؤ سے اپنے روابط کا فائدہ اٹھاتے تو انیس کے حالات زندگی کو جمع کرنے میں زیادہ پریشانی نہیں ہوتی۔ آزاد نے ''آب حیات'' میں اپنی ناکامی کا ذکر کیا ہے اور انیسؔ کے بیٹے نفیسؔ کی شکایت کی ہے کہ انھوں نے اپنے والد کے حالات کو جمع کرنے میں ان کی مدد نہیں کی۔ ایسا لگتا ہے کہ علامہ شبلی کو بھی ان ہی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ اس حقیقت سے بھی چشم پوشی نہیں کی جاسکتی ہے کہ موازنہ انیس کی سیرت، شخصیت اور شاعرانہ زندگی کی تصویر کھینچنے سے قاصر ہے۔ کیونکہ موازنہ کی تمہید میں انھوں نے محض ''کلام پر تقریظ وتنقید'' کی خواہش ظاہر کی ہے ان سب کے باوجود سوانحی حصہ کی کمی کی وجہ سے اس کی حیثیت اور اہمیت متاثر ہوئی ہے۔

انیس کو ایک مکمل شاعر کے طور پر پیش کرنا، علامہ کا مقصد اصلی ہے۔ اس کے لیے یہ بھی بتانا ضروری ہے کہ شاعری کسے کہتے ہیں؟ کن عناصر سے اچھی شاعری وجود میں آتی ہے، تخیل اور جذبات کسے کہتے ہیں شاعری میں صنائع وبدائع کی کیا حیثیت ہے؟ اور ان سے کچھ نتائج اخذ کرنے کے بعد ایک معیار بنایا جائے اور اس معیار پر انیس کے کلام کو پرکھا جائے۔ یہ بحث زیادہ وضاحت کے ساتھ اگرچہ شعرالعجم کی چوتھی جلد میں آچکی ہے لیکن علامہ نے موازنہ میں بھی اس کے کچھ پہلوؤں کو پیش کیا ہے۔ ارسطوؔ نے ان کے تنقیدی خیالات کے لیے بنیاد فراہم کرنے کا کام کیا۔ مصوری، واقعہ نگاری اور محاکات کے تصورات علامہ نے وہیں سے لیکر ان میں کچھ نئے اور پرانے خیالات داخل کئے۔ یہ بحثیں علامہ کے عہد سے مکمل ہم آہنگی رکھتی ہیں۔ اپنے مقرر کردہ معیاری شاعری پر شبلی اتنا بھروسہ کرتے تھے کہ کسی اور معیار پر انیس کی شاعری کو نہیں پرکھنا چاہتے تھے۔ علامہ نے موازنہ کی تمہید میں ایک جملہ لکھا ہے جو بحث طلب ہے۔

> ''جس شخص کو یہ معیار تسلیم نہ ہو اس کے سامنے میر انیس کی نسبت کمال شاعری کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا''[1]

تنقیدی نقطۂ نظر سے اگر اس کو دیکھا جائے تو یہ معیار بڑا جذباتی نظر آتا ہے۔ اور یہیں ہمیں شبلی کے تنقیدی اسلوب کو پرکھنے کا موقع ملتا ہے۔

---

[1] ادیب شبلی نمبر ستمبر ۱۹۶۰ء صفحہ ۱۰۵

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

میر انیس کے محاسن شاعری کے سلسلے میں فصاحت، مضامین کی نوعیت کے لحاظ سے الفاظ کے استعمال، بحر وردیف وقافیہ کی موزونی کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے گویا فصاحت کلام کو اسلوب کی بنیادی خصوصیت قرار دے کر شبلی نے انیس کے یہاں اس کی فراوانی دکھائی ہے۔ مضامین کی نوعیت کے لحاظ سے الفاظ کے استعمال کی بحث بھی بڑے لطیف پیرائے میں کی ہے اور کئی مقامات پر کی ہے۔

اس کے باوجود بھی کلیم الدین احمد کو شکایت ہے کہ

''وہ یہ نہیں جانتے کہ بظاہر نامانوس، ثقیل اور غیر فصیح الفاظ اگر موقع محل سے کام میں لائے جائیں تو نامانوس، ثقیل اور غیر فصیح باقی نہیں رہیں گے''[1]

موازنے میں شاعری کے لفظی پہلوؤں اور بلاغت دونوں کا ذکر ہے۔ شبلی نے بلاغت کے باریک پہلوؤں مثلاً واقعیت، مناظر فطرت کی مرقع کشی، روزمرّہ، جذبات نگاری اور واقعہ نگاری سبھی کا تذکرہ کیا ہے۔ اور بہت ہی واضح مثالوں کی مدد سے ان کو پیش کیا ہے۔ علامہ نے اس میں کوئی فلسفیانہ موشگافی نہیں دکھائی ہے۔ عقیدہ اور یقین، اصلیت اور واقعیت کے اثر کے تحت مبالغہ کو اصلیت بتانا، واقعات کے مثالی پہلوؤں کو اصلیت کا جز قرار دینا ان مسائل سے بڑی الجھن پیدا ہوتی ہے۔ علامہ نے خصوصیت کے ساتھ اس طرف توجہ نہیں فرمائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے نقادوں کو جن میں کلیم الدین احمد اور احسن فاروقی کے نام نمایاں ہیں شبلی کی تنقیدی بصیرت میں عیب نظر آتا ہے۔ ان نقادوں کا اپنا ایک مخصوص موقف ہے جس کی وجہ سے وہ کہتے ہیں کہ نہ تو شبلی یہ جانتے ہیں کہ واقعیت اور اصلیت کسے کہتے ہیں، نہ جذبات اور جذباتیت میں تفریق کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، نہ نفسیات تک ان کی رسائی تھی اور نہ ہی بلاغت کے اصل معنی سے آگاہ ہیں۔ احسن فاروقی تو یہاں تک کہتے ہیں کہ:-

''انھوں نے انیس کے یہاں سے مثالیں ٹھیک دی ہیں لیکن تنقید غلط کی ہے اور نتائج غلط نکالے ہیں''[2]

نقادوں کے ذہن میں جو یہ الجھنیں پیدا ہوتی ہیں وہ بے جا نہیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شبلی نے مرثیہ نگاری کے فن کے سلسلے میں خیال افروز تنقیحات قائم نہیں کی ہیں۔ اور نہ ہی کوئی معیار اور منطقی سانچہ

---

[1] ادیب شبلی نمبر ستمبر ۱۹۶۰ء صفحہ ۱۰۵

[2] ادیب شبلی نمبر ستمبر ۱۹۶۰ء صفحہ ۱۰۶

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

ہمارے سامنے پیش کیا ہے جس کی وجہ سے قاری ان کے خیالات سے اتفاق کرتا۔ ان کے نقطہ نظر کی غمازی ان کے شاعرانہ حقیقت کے تصور سے ہوتی ہے۔ ایک جگہ رقم طراز ہیں:-

''فرض کرو کہ شاہنامہ کے تمام واقعات غلط ثابت ہو جائیں تو اس سے فردوسی کے کمالِ شاعری میں کیا فرق آئے گا''[1]

مراد یہ ہے کہ اگر انیس نے ان واقعات کو اپنے وجدان اور عقیدت کی کسوٹی پر پرکھا اور جذباتی صداقت کو ملحوظ رکھتے ہوئے شاعری کے سبھی زیورات سے سجا کر ہمارے سامنے پیش کر دیا تو یہ بحث کہاں تک مفید ہو سکتی ہے کہ تاریخ اور جغرافیہ کی پابندی ان کے نزدیک پورے طور سے ہو رہی تھی یا نہیں۔ شبلی کے جمالیاتی تصور کو اسی میں آسودگی حاصل ہو جاتی ہے۔ شاعری تاریخ اور جغرافیہ کی حدود میں ان کی نظر میں کوئی بندش نہیں ہے۔ بلکہ ان کے نزدیک شاعر اس فضا کی تصویر کھینچتا ہے، جسے شاعر محسوس کرتا ہے۔ انیس کی شاعری شبلی کے تنقیدی زاویہ نظر سے پوری طرح مطابقت رکھتی ہے۔ ان ہی وجوہات کی بنا پر موازنہ انیس و دبیر کو اس کی کمیوں کے باوجود سخن سنجی اور سخن فہمی کا نادر نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

شعر و سخن میں شبلی لفظوں پر بہت زور دیتے تھے۔ وہ ان خیالات اور تصورات کو جن میں سرور اور محظوظ کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ دل کش انداز میں پیش کرنے کو علامہ شاعری کہتے ہیں۔ موضوع کے مختلف پہلوؤں، اس کی ہم آہنگی اور اہمیت کو علامہ دوسرے درجہ پر رکھتے ہیں۔ انکار زور جذبات کی شدت اور صداقت پر ہوتا ہے وہ احساسات کی مصوری میں تخیل کے عمل دخل کو پسند کرتے ہیں اور اس سے جدت اور ندرت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اور یہی ان کے نزدیک نشاط حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ اس حیثیت سے انھوں نے انیس کو ایک مکمل شاعر ثابت کر دیا ہے۔ اور اسی حیثیت سے جب ان کی نظر دبیرؔ پر پڑتی ہے تو دبیر کا مرتبہ انیس کے سامنے کم نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ مولانا یہ بتاتے ہیں کہ دبیر کو الفاظ، تشبیہ، استعارہ، صنائع بدائع کو استعمال کرنے میں وہ مہارت حاصل نہیں ہے جو انیسؔ کو حاصل ہے۔ حالیؔ کی نظر میں مرثیہ کو شاعری میں اعلیٰ اخلاقی حیثیت حاصل ہے۔ شبلی مرثیہ کے اس اخلاقی پہلو کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے ہیں۔ حالانکہ اگر موازنہ کی تمہید کو دیکھا جائے تو مرثیہ کا یہ پہلو ان کی نگاہ میں تھا۔ اس سے حالیؔ اور شبلی کے تنقیدی رجحانات میں جو فرق ہے، وہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ اور اس حقیقت کا بھی احساس ہو جاتا ہے کہ اگر حالیؔ اور شبلی کے عہد کو

---

[1] فکر و نظر (شبلی نمبر) جون ۱۹۹۶ء صفحہ ۲۲

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

ادبی اقدار کی تلاش کا عہد کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ہر نقاد اس کوشش میں تھا کہ اپنے شعور و ذوق کی روشنی میں اس کا تعین کیا جائے۔ موازنہ کو اسی تلاش کی ایک کوشش قرار دیا گیا ہے۔ اور اس کے مطالعہ کے وقت ہمارے سامنے یہی اخلاقی نظریہ رہنا چاہئے۔ ارسطو کے تصورات کی روشنی میں علامہ نے انیس کے کلام کو پرکھا لیکن اسے المیہ (epic) نہیں بنایا ہاں اتنا ضرور بتا دیا کہ مرثیہ صرف بین کرنے کے لیے نہیں ہوتا ہے اور انیس کے مراثی میں محض رونا رلانا نہیں ہے۔ انیس کے کلام میں وہ ساری خصوصیات موجود ہیں جو ایک ممتاز شاعر میں ہونی چاہئیں۔ مرثیہ کا مطالعہ کرنے والوں کو موازنہ نے نئی نئی راہیں دکھائی ہیں اس دور کے مبصر اور نقاد ان راہوں پر چل کر صحیح رائے قائم کرنے میں مدد حاصل کر سکتے ہیں۔

۱۹۰۸ء میں موازنہ اشاعت کے بعد منشی نوبت رائے نظر نے لکھا ہے کہ

''انیس کی قادر الکلامی گزشتہ نصف صدی سے آج تک ہر شخص کو دل نشین تھی، لیکن مولوی شبلی صاحب نے جس تفصیل کے ساتھ اس کی تشریح کی ہے، وہ انھیں کا حصہ ہے''[1]

''موازنہ انیس و دبیر'' کو جہاں ایک طرف داد و تحسین حاصل ہوئی وہیں دوسری طرف اس پر اعتراضات بھی بہت ہوئے۔ اس کے نقادوں میں ایک جانب تو وہ لوگ تھے جو دبریے تھے۔ ان کی نظر میں مرزا دبیر کو انیس پر فضیلت اور فوقیت حاصل تھی۔ لہٰذا اس طرف سے ''موازنہ'' کی رد میں بہت سی کتابیں، مضامین اور رسائل لکھے گئے۔ مثال کے طور پر ''المیزان''، ''تنقیدِ موازنہ'' اور ''ردالموازنہ'' وغیرہ۔ دوسری جانب وہ لوگ تھے جن کی نظر میں دبیر کو انیس پر فوقیت اور فضیلت حاصل نہیں تھی۔ لیکن ان حضرات کو اس میں بہت سی کمیاں نظر آئیں۔ مثلاً اس میں جانبداری سے کام لیا گیا ہے۔ اور موازنہ کا حق ادا نہیں کیا گیا ہے۔ مرثیہ گوئی کی تاریخ بھی مختصر بیان کی گئی ہے۔ طویل مثالوں سے کتاب کی ضخامت بڑھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ بجائے اس کے کہ تفصیلی مباحث سے موضوعات کو واضح کیا جاتا۔

اس کتاب کو لکھنے میں اگر ذرا اور غور و فکر سے کام لیا جاتا، بہ حیثیت فن کے مرثیہ نگاری کا جائزہ لیا جاتا، تنقیدی تجزیے کی خصوصیات کو واضح کرنے کے لیے مثالوں پر ترجیح دی جاتی، انیس اور دبیر کا تقابلی مطالعہ اور زیادہ غور سے کیا جاتا، ابواب کی تنظیم اور ترتیب میں اور زیادہ محنت کی گئی ہوتی، اصول شاعری سے جڑے ہوئے جو مباحث ہیں ان پر ذرا اور غور کیا جاتا، تو موازنہ انیس و دبیر کا مقام اردو ادب میں اور زیادہ بلند ہوتا حالانکہ اس صورت میں بھی ''موازنہ انیس و دبیر'' اردو تنقید کے ارتقاء میں ایک بلند اور اعلیٰ مقام رکھتا ہے۔

---

[1] شبلی (اردو ادب کے معمار) ظفر احمد صدیقی صفحہ ۶۲

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

د - خطبات اور مقالات میں ادبی تنقید کا جائزہ

الخطبہ (ع) مادہ خ ط ب، جمع خطباء وخطب، بمعنی وعظ ونصیحت، خطیب کی تقریر، خطبہ کا اسم فاعل خاطب اوخطیب ہے اور خطبہ کا صرف خاطب۔ قرآن میں اس کے کچھ دوسرے مشتقات بھی دے ہوئے ہیں۔

لسان کے مطابق اس لفظ میں مجمع عام کو خطاب کرنے اور لوگوں کو (خصوصاً احتجاج یا خروج ومظاہرہ کے لیے) برانگیختہ کرنے کا مفہوم شامل ہے۔ عام معنوں کے علاوہ اس لفظ کے یہ معنی ہیں:

(۱) وہ خطاب یا تقریر جو دینی عبادتوں کے ساتھ وابستہ ہیں، مثلاً خطبۂ نمازِ جمعہ، خطبۂ نمازِ عیدین وغیرہ۔ (۲) وہ تقریریں جو سامعین میں ہیجان پیدا کرنے کے لیے کی جاتی ہیں اور ان میں خطابت کے جوہر دکھائے جاتے ہیں۔ (۳) مناسب طول کی کوئی تحریر۔ (۴) مناسب طول کی کوئی تحریر (۵) عام وعظ۔ [۱]

دورِ جاہلیت میں عربوں میں خطابت، طلاقت لسانی اور شعر گوئی اعلیٰ درجہ کی تھی۔ خطابت کا درجہ ان کے نزدیک شعر گوئی کا تھا۔ وہ اس سے قبائل میں جوش پیدا کر دیا کرتے تھے اور بلاغت کے زور سے مخاطبوں کو بڑے بڑے کام کرنے کے لیے تیار کر لیا کرتے تھے۔

قبائل میں خطیبوں کو حکماء اور قائدین کا مقام دیا جاتا تھا۔ ان کے خطبوں کو ادبی اور تاریخی حیثیت حاصل ہے۔

ان کے خطبوں میں خوش نما الفاظ، چھوٹے چھوٹے ہم وزن جملے، دل نشیں، سحر بیاں، سلیس محاورے اور ضرب الامثال کی کثرت ہوتی تھی۔ ہر قبیلہ اپنا ایک خطیب رکھتا تھا۔ دورِ جاہلیت کے خطیبوں میں مُس بن ساعدہ (م ۶۰۰ء) سحبان وائل الباہلی (۵۴ھ) عمرو بن معدیکرب (۶۴۳ء) کے نام خصوصیت کے ساتھ لیے جاسکتے ہیں۔

---

[۱] شعبہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور، صفحہ ۹۵۴

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

اسلام میں خطبوں کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ یہاں تک کہ انھیں بعض عبادتوں کا جز وقرار دیا جا سکتا ہے۔ جرجی زیدان صدر اسلام پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ

''اسلام میں آکر خطابت میں بلاغت اور حکمت دونوں کا اضافہ ہوگیا۔ اسلوب قرآن نے شاعری کو بھی بہت متاثر کیا، لیکن خطابت میں اس کے اثرات بہت نمایاں ہیں۔''[1]

اسلام کی آمد سے خطابت کی تاثیر وطاقت میں اضافہ ہوا۔ دورِ حاضر میں خطابت کا ایک نیا رنگ سامنے آیا ہے۔ مساجد کے علاوہ سیاسی پلیٹ فارموں سے بھی اس کے آہنگ کی آوازیں آنے لگی ہیں۔ اس دور کے عربی خطیبوں میں سید عبداللہ ندیم (م۱۸۹۶ء)، جمال الدین افغانی (م۱۸۹۸ء) مفتی محمد عبدہ (م۱۹۰۵ء)، سعد زغلول پاشا (م۱۹۲۷ء) اور طہٰ حسین کے نام سرِ فہرست ہیں۔

عربی، فارسی، ترکی ادب میں خطبے کا لفظ وعظ وخطابت کے عام معنوں کے علاوہ دیباچۂ کتاب کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ انشاء کی کتابوں میں اس لفظ کا استعمال ایسی ادبی تحریر کے لیے ہوتا ہے جس کی حیثیت تمہید کی ہو یا دیباچہ کہ ہو یا ایسا مضمون جو ایک مستقل حیثیت رکھتا ہو یا ایسا ادب پارہ جس کی طول مناسب ہو۔ اور وہ ایک مستقل اور باقاعدہ وباضابطہ ابتداء، وسط اور اختتام رکھتا ہو۔

اکثر یہی دیکھا گیا ہے کہ انشائی خطبوں کی زبان شاعرانہ، مسجع اور مرصع ہوتی ہے۔ اردو میں اس لفظ کا استعمال دینی خطبات کے علاوہ عام لیکچر (لکھی ہوئی تقریر) کے معنوں میں بھی ہوتا ہے۔ خواہ ان کی حیثیت ادبی ہو یا تعلیمی ہو یا حکیمانہ یا سیاسی ہو۔ مثال کے طور پر اقبال کے خطبات مدراس۔

THE RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM

(لاہور ۱۹۳۰ء)

جن کا ترجمہ بعد میں تشکیل جدید الٰہیات کے نام سے شائع ہوا یہ فلسفیانہ موضوعات پر ہیں۔

مقالہ ایسے مختصر مضمون کو کہتے ہیں جو کسی رسالے یا مجموعۂ مضامین یا یادگاری ارمغاں کے لیے لکھا جائے۔ کوئی کوئی مقالہ سو صفحات تک کا ہوتا ہے اور کچھ طویل مقالے کئی سو صفحات تک کے ہو سکتے ہیں۔ اے۔ جے۔ راتھ نے مقالے کی مختصر تعریف ان الفاظ میں بیان کی ہے:-

''ایک موضوع پر آپ کی دریافتوں کا مجموعہ (Synthesis) اور آپ کا ان دریافتوں کو آنکنا (Evaluation)۔

---

[1] اردو دائرۂ معارف اسلامیہ، زیر اہتمام دانشگاہ پنجاب لاہور، صفحہ ۹۵۵

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

A.J. Roth the Research paper, form and content (BALMONT, CALIFORNIA PRINTING/Aug.69) P.7 [1]

نتیجتاً مقالہ، اس تحریر کو کہتے ہیں جس میں موضوع سے متعلق تمام مواد کو پیش کیا جاتا ہے، پرکھا جاتا ہے اور اس کے بعد ہی ہم صحیح نتائج اخذ کر پاتے ہیں۔

عام طور پر چھوٹے مقالے کو ہم مضمون، اوسط مقالے کو رسالہ یا کتابچہ اور طویل مقالے کو کتاب کہتے ہیں۔ اوسط حجم کے غیر سندی مقالوں کے لیے کچھ نام اس طرح ہیں:

۱- ڈاکٹر عبداللہ، شعرائے اردو کے تذکرے

۲- مولوی عبدالحق، اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام

۳- ڈاکٹر حفیظ قتیل، معراج العاشقین کا مصنف

۴- عابد پیشاوری، نقطے اور شوشے (انتخاب حاتم: مرتبۂ ڈاکٹر عبدالحق پر تبصرہ)

ان تینوں قسموں میں مختصر افسانے، ناولٹ اور ناول جیسا تعلق معلوم ہوتا ہے۔ مختصر افسانے میں ایک واقعہ کو جزوی طور پر بیان کیا جاتا ہے۔ ناول اور ناولٹ میں کسی واقعہ کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ ناول اور ناولٹ کے درمیان صرف حجم کا فرق ہوتا ہے۔ متوسط مقالے یا رسالے میں بھی اسی طرح کی تحقیق پائی جاتی ہے۔ جس طرح کی کتابی رسالے میں پاتی جاتی ہے۔ لیکن دونوں میں ایک خاص فرق ہوتا ہے۔ اول الذکر میں ابواب کی اس طرح باقاعدہ تقسیم نہیں ہوتی جس طرح کتابی مقالوں میں متوسط مقالوں میں تمہید اور پس منظر کے بغیر ایک دم سے نفسِ موضوع کی بات کا آغاز ہو جاتا ہے۔

جو مواد ہم نے اخذ کیا ہے۔ اس کا مطالعہ، اس مواد کو پرکھنا اور ترتیب دینا یہ مقالہ لکھنے کے وسائل ہیں۔ یہی ہمارے مقالہ کا مقصود ہے۔ اس آخری عمل کی دو منزلیں ہیں۔ ۱- تسوید یعنی مقالے کا پہلا مسودہ تیار کرنا، ۲- تبئیض یعنی پہلے مسودہ کی ضروری ترمیم و اصلاح کے ساتھ صاف نقل۔ یہ نقل مبیضہ کہلاتی ہے۔

ہر ادبی تحریر، ہیئت و مواد دونوں میں، اپنے خالق کی شخصیت کی عکاسی کرتی ہے۔ محض تخلیقی تحریروں میں ہی تصنیف نگار کی جھلک نہیں ہوتی ہے بلکہ تحقیق اور تنقید میں بھی مصنف کا عکس نظر آتا ہے۔

مولانا شبلی کو قدرت نے تحریر کے ساتھ تقریر کا سلیقہ و ملکہ بھی عطا کیا تھا۔ اپنے زمانے میں ان کا شمار

---

[1] بحوالہ تحقیق کا فن- گیان چند جین صفحہ ۵۶

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

ملک کے بہترین اور نامور خطیبوں میں ہوتا تھا۔ ان کے خطبوں کا انداز عالمانہ اور پیرایۂ بیان استدلالی ہوا کرتا تھا۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس اور ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسوں میں انھیں خطبے کے مواقع اکثر پیش آتے رہتے تھے۔ ان کے خطبات اکثر برجستہ ہوا کرتے تھے۔ اس لیے اکثر محفوظ نہیں رہے۔ جو محفوظ رہ گئے وہ ''خطباتِ شبلی'' اور ''باقیاتِ شبلی'' میں جمع کر دیے گئے۔ یہاں مثال کے طور پر ایک خطبے کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

''حضرات بہت دن نہیں ہوئے کہ ہم پر یہ زمانہ گذرا ہے کہ ہم مطلقاً اس تفریق سے، اپنے لٹریچر میں، اپنے خیالات میں، اپنی معاشرت میں اور اپنی روزانہ زندگی کے کاروبار میں واقف نہ تھے۔ بچپن سے ہمارے بچے کتاب ''دستور الصبیان'' پڑھتے تھے، جو لالہ نوندھ رائے کی تصنیف ہے، اور دہلی کی مشہور ''مثنوی میر حسن'' جب اس کا جواب لکھنؤ کے لوگ پیش کرتے تھے جو لوگ فارسی زبان کے ماہر اور کامہ ہونا چاہتے تھے۔ وہ ''بہارِ عجم'' جو ٹیک چند بہارؔ کی تصنیف ہے اور مصلحات الشعراء کی طرف رجوع کرتے تھے، جو ایک ہندو کی تصنیف ہے، اور کبھی لوگوں نے نہیں کہا کہ یہ ہندو کی تصنیف ہے یا دوسری قوم کے لوگ ہیں۔ اس قسم کا اتحاد لٹریچر میں تھا، معاشرت میں تھا اور تمام باتوں میں تھا۔ اگر کسی وجہ سے نفاق پیدا ہو بھی گیا ہو، تو دوسرے امور میں ہم متحد ہو کر کیوں نہ کام کریں؟ اس لیے مجھ کو جو چیز دیباچۂ فتح معلوم ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ اس کام میں دونوں گروہ شریک ہیں اور نہایت ہمدردی سے اس کام کو کر رہے ہیں۔ حقیقت میں اگر سچ پوچھیے اور ہمارے احباب برا نہ مانیں تو میں کہوں گا کہ اس فیاضی کا کریڈٹ ہندو دوستوں کو دینا چاہیے، اس لیے کہ مجھے شبہ ہے کہ اگر وہ اس قسم کی کانفرنس قائم کرتے، تو ہم ایسی فیاضی سے شریک ہوتے یا نہ ہوتے۔''[1]

شبلی کے خطبات کو بھی ادب میں ایک معتبر درجہ حاصل ہے۔ ان میں ادبیت اور دلچسپی دونوں عناصر موجود ہیں۔ شبلی کے خطبات، خطبات کے لیے جو معیار قائم کیا گیا ہے، اس معیار پر پورے اترتے ہیں۔ وہ شبلی ہمارے چند معتبر اور صاحبِ طرز خطیبوں میں شامل کیے جانے کے لائق ہیں۔ ان کے خطبوں سے

---

[1] طبی کانفرنس منعقدہ لکھنؤ: خطباتِ شبلی، ص ۹۰

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

مختلف زمانوں کے رجحانات وکیفیات کے بارے میں گرانقدر معلومات فراہم ہوتی ہیں۔

ان کے خطبوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ خطابت میں بھی ان کا کوئی خاص انداز نہ تھا۔ بلکہ مخاطب کے معیار و مذاق کے لحاظ سے ان کے طرزِ ادا کا انداز بدلتا رہتا تھا۔ کبھی مفصل تقریر فرماتے کبھی دو چار جملوں میں بات کو ختم کر دیتے۔ جس طرح عام زندگی میں وہ اپنے آپ کو لیے دیے رکھتے تھے، اسی طرح اپنی تقریروں میں بھی محتاط ہو کر بولتے تھے۔ البتہ جن سے بے تکلف ہوتے۔ ان کے سامنے بے تکلفانہ تقریر کرتے۔

مولانا شبلی نعمانی کا شمار اردو کے صاحبِ طرز اور معتبر و مستند مقالہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ بلکہ ادبی خدمات کے تعلق سے ان کی یہ حیثیت سب سے زیادہ اہم اور مقدم ہے۔ مولانا شبلی کے معاصر نثر نگاروں اور ادیبوں میں سرسید، محمد حسین آزاد، نذیر احمد اور حالی کے نام سرِ فہرست ہیں۔ ان میں ہر ایک اپنی مقالہ نگاری کی حیثیت سے مستحکم و مسلم ہے، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ مولانا شبلی کی طرز ان سب سے جداگانہ اور منفرد ہے۔ سرسید کے یہاں جا بجا ثقیل اور نامانوس الفاظ آجاتے ہیں محمد حسین آزاد تشبیہات اور استعارات مناسباتِ لفظی کے بغیر قدم نہیں بڑھاتے۔ نذیر احمد محاوروں کو ہی سب کچھ سمجھتے ہیں، حالی کی نثر کبھی کبھی روکھی اور خشک معلوم ہوتی ہے۔

ان سب کے برخلاف مولانا شبلی کی نثر میں ایک اعتدال و توازن اور دوسری طرف ایک خاص طرح کا احساسِ جمال پایا جاتا ہے۔ اس کا ایک خاص سبب تو یہ ہے کہ وہ لفظوں کے پارکھ ہیں۔ ہر لفظ کو مناسب موقع و محل کے اعتبار سے استعمال کرتے ہیں۔ شبلی نہ صرف معنوی بلکہ صوتی مناسبتوں کا بھی لحاظ رکھتے ہیں۔ رعایت لفظی کو بہت زیادہ پسند نہیں کرتے ہیں۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ ان کے اسلوب میں علمیت و ادبیت کا بہت خوبصورت امتزاج ہے۔ شبلی کے یہاں ادبیت اور علمیت عناں در عناں پہلو بہ پہلو نظر آتی ہے۔

علامہ شبلی کی تحریروں کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ اس میں کسی قسم کا جھول نہیں پایا جاتا ہے۔ ہر فقرہ اور ہر جملہ سانچے میں ڈھلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کچھ کہنے یا لکھنے سے پہلے ذہن میں مناسب ترتیب قائم کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد خیال کو الفاظ کا جامہ پہناتے ہیں۔

علامہ نے اپنا سب سے پہلا مضمون ''مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم'' لکھا تھا۔ اس کے بعد تصانیف کے ساتھ چھوٹے بڑے مقالات بھی مختلف رسالوں میں لکھتے رہے۔ پھر ندوۃ العلماء کی طرف سے ماہوار رسالہ

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

''الندوہ'' جاری کیا۔اس میں کثرت سے ہر قسم کے مضامین لکھے۔طویل مضامین ''رسائل شبلی'' کہلاتے ہیں اوراسی نام سے شائع ہوئے تھے۔اب دارالمصنفین نے مقالاتِ شبلی آٹھ جلدوں میں اس ترتیب سے شائع کردیے ہیں:

(۱) جلد اول: مذہبی مضامین (۲) جلد دوم: ادبی مضامین

(۳) جلد سوم: تعلیمی مضامین (۴) جلد چہارم: تنقیدی مضامین

(۵) جلد پنجم: سوانحی مضامین (۶) جلد ششم: تاریخی مضامین

(۷) جلد ہفتم: فلسفیانہ مضامین (۸) جلد ہشتم: قومی مضامین

یہ تمام مضامین شبلی کے زورِ قلم، قوتِ استدلال، وسعتِ تحقیق اور دقتِ نظر کے شاہد ہیں۔بعض جگہ ان کی رائے ونظریہ سے اختلاف ہوسکتا ہے، کہیں تحقیق میں جانبداری بھی پائی جاتی ہے۔لیکن یہ جزئی باتیں ہیں، اس لیے لائقِ اعتنا نہیں۔

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

چوتھا باب

علم کلام

۱۶۹-۱۸۵

ا- علم کلام کی اہمیت اور ضرورت شبلی کی نظر میں

ب- تاریخی پس منظر

ج- شبلی کے علم کلام کے امتیازات

Maulana Azad Library, Aligrh Muslim University

۱۔علمِ کلام کی اہمیت اور ضرورت شبلی کی نظر میں

علمِ کلام اس علم کو کہتے ہیں، جس میں عقلی دلائل کی مدد سے، مذہبی عقائد کو ثابت کیا جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ مذہبی عقائد کو ثابت کرنے کے لیے عقلی پیرایہ بیان کو ذریعہ بنایا جاتا ہے۔ مولانا شبلی نعمانی نے علم کلام کے میدان میں جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ ان سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ شبلی انیسویں صدی عیسوی کے نصف ثانی میں پیدا ہوئے۔ یورپ کی سیاسی وتہذیبی بالادستی کی وجہ سے مسلمانوں کا ایک طبقہ اس زمانے میں مذہبی عقائد کے سلسلے میں شکوک وشبہات میں گرفتار تھا۔ خاص طور سے مابعد الطبیعاتی عقائد مثال کے طور پر توحید، رسالت، جنّت دوزخ اور قیامت وغیرہ پر ان کا ایمان بہت ضعیف ہوگیا تھا۔

عہد عباسیہ میں جو خطرہ اسلام کو پیش آیا تھا، اس سے بھی بڑا خطرہ آج ہمارے سامنے ہے۔ مغربی علوم نے ہر گھر میں اپنی جگہ بنالی ہے۔ اور اس قدر آزادی حاصل ہوگئی ہے کہ حق کے مقابلے میں ناحق کو بولنا زیادہ آسان ہوگیا ہے۔ مذہبی خیالات میں عام طور پر ایک طوفان سا برپا ہے۔ نئے تعلیم یافتہ پوری طرح متاثر نظر آتے ہیں۔ علماء جب کبھی اس طرف نظر کرتے ہیں تو چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے۔

تاریخ کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ انیسویں صدی عیسوی عالم اسلام کے لیے عام طور پر اور ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے خاص طور پر بہت ہی عبرتناک صدی ثابت ہوئی تھی۔ اس کی وجہ محض یہ نہیں تھی کہ حکومت پر سے ہمارا قبضہ کمزور ہو رہا تھا بلکہ اس لیے کہ

> ''ہاشمی ناموسِ دین مصطفیٰ'' کے بیچنے میں مصروف اور ''شیخِ حرم'' کلیم بوذر و چادر زہرا'' کے سودے میں مشغول تھا''[۱]

فرنگی دانشور بہت عرصے سے اس موقع کی تلاش میں تھے۔ انھوں نے اس وقت کو غنیمت سمجھا اور

---

[۱] علم الکلام صفحہ ۲۸

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

اسلامی مذہب اور اخلاق، شریعت اور قانون، تاریخ وتمدن، تہذیب ومعاشرت پر ہر سمت سے اعتراضات کے حملے شروع کر دئے۔ ظاہری طور پر تو یہ محققانہ معلوم ہوتے تھے لیکن اصلاً یہ معاندانہ تھے۔ یہ بات تو تسلیم شدہ ہے کہ یہ لوگ فاتح تھے اور مسلمان کسمپرسی، افراتفری اور بدحواسی کی حالت میں تھے۔ اس لیے کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ اپنے ماضی پر نظر ڈالے اور صورت حال کا صحیح طور پر اندازہ کر پائے۔ نتیجتاً مسلمان فکری انقلاب اور ذہنی ارتداد میں گھرتے چلے گئے۔ اور عام طور پر مسلمان اپنے ماضی سے مطمئن نظر نہیں آتے تھے۔

شبلی تاریخ نویسی اور سیرت نگاری کو بھی علم کلام کی ایک شاخ قرار دیتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ایک شرط بھی لگاتے ہیں وہ یہ کہ اس میں غیر مسلم سیرت نگاروں کے شکوک وشبہات اور غیر مسلم مورخین کے اسلام پر اعتراضات کے جوابات بھی درج ہوں۔ اس سے متعلق شبلی کی ''سیرۃ النبیؐ'' کے مقدمے کا درج ذیل اقتباس توجہ طلب ہے۔ ''علم کلام کی حیثیت سے سیرت کی ضرورت'' کے ذیلی عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

> ''اگلے زمانے میں سیرت کی ضرورت صرف تاریخ اور واقعہ نگاری کی حیثیت سے تھی۔ علم کلام سے اس کو واسطہ نہ تھا لیکن معترضین حال کہتے ہیں کہ اگر مذہب صرف خدا کے اعتراف کا نام ہے تو بحث یہیں تک رہ جاتی ہے، لیکن جب اقرارِ نبوت بھی جزو مذہب ہے تو یہ بحث پیش آتی ہے کہ جو شخص حامل وحی اور سفیر الٰہی تھا، اس کے حالات، اخلاق اور عادات کیا تھے؟
>
> یورپ کے مورخین آنحضرت ﷺ کی جو اخلاقی تصویر کھینچتے ہیں وہ (نعوذ باللہ) ہر قسم کے معائب کا مرقع ہوتی ہے۔ آج کل مسلمانوں کو جدید ضرورتوں نے عربی علوم سے بالکل محروم کر دیا ہے۔ اس لیے اس گروہ کو اگر کبھی پیغمبرِ اسلامؐ کے حالات اور سوانح کے دریافت کرنے کا شوق ہوتا ہے، تو انھیں یورپ کی تصنیفات کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح یہ زہر آلود معلومات آہستہ آہستہ اثر کرتی جاتی ہیں اور لوگوں کو خبر تک نہیں ہوتی ہے یہاں تک کہ ملک میں ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا ہے جو پیغمبر کو محض ایک مصلح سمجھتا ہے جس نے اگر مجمع انسانی میں کوئی اصلاح کر دی تو اس کا فرض ادا ہو گیا۔ اس بات سے اس کے منصبِ نبوت میں فرق نہیں آتا کہ اس کے دامن اخلاق پر معصیت کے دھبے بھی ہیں۔

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

یہ واقعات تھے جنھوں نے مجھ کو بالآخر مجبور کیا، اور میں نے سیرت نبویؐ پر ایک مبسوط کتاب لکھنے کا ارادہ کرلیا''۔[1]

جیسا کہ ہم جانتے ہیں یورپین حکومتوں سے پہلے ہندوستان، مراقش، الجزائر، مصر، تونسی وغیرہ اسلامی ممالک میں مسلمانوں کی حکومتیں تھیں۔ اس لیے مسلم حکومتوں کے تاریک پہلوؤں کو نمایاں کئے بغیر ان کے کارناموں کی کوئی وقعت نہ ہوتی اسی وجہ سے ان کے مصنفوں کے لیے یہ حربے استعمال کرنا مجبوری تھی۔

ہندوستان میں اس کی شروعات ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے ہوئی۔ ان اعتراضات کرنے والوں میں سب سے آگے ڈاکٹر اسپرنگر تھے۔ ڈاکٹر اسپرنگر اس وقت دلی کالج اور بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے سربراہ کار بھی تھے۔ ان کے ساتھ ساتھ ولیم میور، ڈاکٹر جے۔ اے۔ مولر، ڈاکٹر ویل۔ وان۔ کریمر، برتھال سینٹ، ہیلر نولڈیگی، ولہاوسن، گولڈزیہر، رینان کے نام خصوصیت کے ساتھ لئے جاسکتے ہیں۔ اور ان سب میں سب سے آگے الہلال، مصر کا ایڈیٹر جرجی زیدان تھا۔

یہ لوگ نہ تو مناظرہ پیشہ عیسائی واعظ تھے اور نہ مشنری ہی تھے۔ بلکہ یہ یورپ کے ادبا اور فضلا تھے۔ یہ مسلمانوں کی کتابوں سے خود ہی ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنے کام کی باتیں نکالیتے تھے، اور اپنے فاسد اغراض پر بہت ہی مہارت سے علمی تحقیقات کا خول چڑھا دیا کرتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کے لیے ان کو بہت محنت کرنی پڑتی تھی۔

ایسے ہوش مند حریفوں کا جواب دینا آسان نہ تھا۔ اس کے لئے اسی معیار کے علماء اور فضلاء کی ضرورت تھی، جو ان کے ہتھیار سے ہی ان کا مقابلہ کریں۔ ان میں سرفہرست علامہ شبلی نعمانی کا ہی نام آتا ہے۔

ایسے میں علم کلام کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ جس کی مدد سے ان اعتراضات کا جواب دیا جاسکے۔ اس کی ضرورت کو سب نے تسلیم بھی کرلیا۔ لیکن اس کے اصول کیا ہونے چاہئیں، اس کے متعلق اختلاف تھا۔ جو لوگ جدید تعلیم یافتہ ہیں ان کا ماننا ہے کہ بالکل نئے اصولوں پر نئے علمِ کلام کو مرتب کرنا ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے زمانے میں اسلام پر جو اعتراضات کئے گئے تھے، آج کے اعتراضات سے ان کی نوعیت بالکل مختلف ہے۔ پچھلے زمانے میں جو مقابلہ تھا وہ یونانی فلسفے سے تھا، جس کی بنیاد محض مظنونات اور قیاسات پر تھی۔ اس وقت جو مقابلہ ہے وہ صرف احتمال آفرینیوں اور عقلی قیاسات سے نہیں ہے۔

---

[1] فکر ونظر شبلی نمبر، جون ۱۹۹۶، ظفر احمد صدیقی، صفحہ ۲۴۲

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

لیکن ہم اس خیال کو پوری طرح صحیح نہیں سمجھتے ہیں۔ قدیم علم کلام کا جو حصہ پہلے ناکافی تھا، آج بھی ناکافی ہے اور جو حصہ اس وقت کارآمد تھا آج بھی ہے اور آگے بھی رہے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی کسی شے کی واقعیت اور صحت پر زمانہ کے انقلاب وامتداد سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ اسی بنا پر اس وقت اس بات کی ضرورت تھی کہ علم کلام کو قدیم اصولوں اور موجودہ مزاق کے اعتبار سے ترتیب دیا جائے۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ علم کلام کی تاریخ ہمارے سامنے ہو۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔

(۱) جس علم کلام کو ترتیب دینی ہے، اس کا اسلوب بیان ہم کچھ بھی رکھیں لیکن یہ بات ذہن نشین رہے کہ بزرگان سلف نے جو اصول وضع کئے تھے ان کا سررشتہ ہمارے ہاتھ سے نہ چھوٹ جائے۔ اس کے لئے اس بات کی بھی وضاحت ضروری ہے کہ ہر عہد میں ائمہ اسلام نے کون کون سے اصول اپنائے تھے۔ اور ان میں جو تبدیلیاں ہوئیں وہ کس نوعیت کی تھیں۔ ایک فائدہ اس سے یہ بھی ہوگا کہ مسلمانوں کی فراخ حوصلگی، آزادروی، روشن ضمیری اور دلیری کے بہت سے کارناموں سے ہمیں واقفیت ہو جائے گی، جن کو الگ سے نہیں بیان کیا جا سکتا تھا اور کوئی نیا پیرایہ بیان نہیں اختیار کیا جا سکتا تھا۔

(۲) مغرب والوں نے تاریخ کے فن میں جو تغیرات پیدا کئے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اقوام اور اشخاص کی تاریخ کے بعد علوم وفنون کی تاریخ بھی لکھتے ہیں مثلاً فلاں علم کب پیدا ہوا؟ اس کے پیدا ہونے کے کیا اسباب تھے؟ عہد بہ عہد کس طرح اس نے ترقی کی؟ یہ ترقیاں اور تبدیلیاں کیا کیا تھیں اور ان کی وجوہ کیا تھیں؟ اس طرح کی کوئی تصنیف نہ تو عربی میں تھی، نہ فارسی میں اور نہ ہی اردو میں۔

علامہ شبلی نے شروع زمانے سے ہی تاریخ کو اپنی تصنیفات کے موضوع کے طور پر چنا تھا۔ لہٰذا اب تک جتنی بھی تصانیف ان کے قلم سے وجود میں آئیں اور شائع ہوئیں، ان کا تعلق تاریخ ہی سے تھا۔ اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ علم کلام کو ان کے دائرے میں شمار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ علم کلام کی تاریخ لکھنے سے ایک بڑا فائدہ تو یہ ہوا کہ اسلامی لٹریچر میں جو کمی تھی اس کی تلافی ہوگئی اور دوسری طرف یہ تصنیف جو حقیقتاً علم کلام کی تصنیف ہے، تاریخ کے دائرے میں شامل ہو جاتی ہے۔ اور شبلی حد سے تجاوز کرنے کے گنہگار ثابت نہیں ہوتے ہیں۔

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

ب-تاریخی پس منظر

ارسطالیس (ARISTOTLE) جوکہ دورِ قدیم ایک یونانی مفکر گزرا ہے، اس نے ایک خاص نقطۂ نظر کے تحت مختلف موضوعات پر تین کتابیں تصنیف کی ہیں۔

(۱) طوبیقا (TOPICS) یعنی بحث یا جدل۔ اس کا شمار اس کی منطق کی آٹھ کتابوں میں ہوتا ہے۔ سریانی میں اس کا ترجمہ اسحاق بن حنین (م ۲۹۸ھ) نے کیا۔ اس کے بعد یحییٰ بن عدی نے سریانی سے عربی میں اس کا ترجمہ کیا، اس کو فارابی (م ۳۳۹ھ) کا شاگرد بتایا جاتا ہے۔

(۲) اثولوجیا (THEOLOGY) ربوبیت اس کا موضوع ہے۔ ابن ندیم نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اس کی شرح یعقوب بن اسحاق کندی (۱۷۰ھ-۲۶۰ھ) نے لکھی تھی۔ اس کی تصحیح کا اہتمام فریدرخ دیتریسی (FR.DIETERICL) نے کیا تھا اس کتاب کے شروع میں لکھا ہوا ہے کہ اس کی شرح فرفوریوس صوری نے کی تھی۔ عبدالمسیح بن عبداللہ بن ناعمہ حمصی نے اس کا ترجمہ عربی میں کیا۔ اس عربی ترجمہ کو کندی نے احمد بن معتصم باللہ کے لیے صحیح کیا۔ یورپ کے مصنفین اس کو جعلی بتاتے ہیں۔

(۳) مطاطافوسیقا (METAPHYSICS) یہ کتاب مابعد الطبیعۃ پر ہے۔ ابن ندیم ارسطالیس (ARISTOTLE) کی تصانیف میں ''کتاب الحروف'' نام کی ایک کتاب کا ذکر کرتے ہیں جس کو ''الہیات'' کے نام سے شہرت تھی زوزی (۴۱، ۴۵ طبع یورپ) تصریح کرتے ہیں کہ ''مابعد اطیعۃ'' یہی کتاب ہے اس میں مقالوں کی تعداد تیرہ ہے۔ ابن ندیم کے مطابق یہ کتاب یونانی حروف تہجی پر ترتیب دی گئی ہے۔ اس لیے اس کا نام کتاب الحروف رکھا گیا ہے۔ یحییٰ بن عدی نے اس کا ترجمہ عربی میں کیا۔ کتاب الحروف کا ذکر ''مابعد الطبیعۃ'' کے نام سے ابن ابی اصیبعہ کی طبقات الاطباء میں بھی ملتا ہے۔

ان تینوں تصنیفات کا عربی میں ترجمہ ہونے سے مسلمان علماء کو یہ قدرت حاصل ہوگئی کہ وہ کسی مسئلہ کو منطقی ترتیب کیساتھ فلسفیانہ انداز میں بیان کر سکتے تھے۔ بلکہ ان میں یہ بھی ذوق پیدا ہوا کہ مذہبی مسائل کو

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

بیان کرنے کا انداز بھی بدلا جائے۔ آگے چل کر اسی نے ''علمِ کلام'' کی شکل اختیار کر لی۔

دنیا میں تقریباً ہر قوم مذہب کو ہر چیز سے زیادہ عزیز رکھتی ہے۔ لیکن مسلمان مذہب کو کچھ زیادہ ہی عزیز رکھتے ہیں۔ اور اس کی وجہ بھی ہے۔ مسلمان کسی خاندان، کسی ملک، کسی نسل، کسی آبادی یا شہر کے افراد کا نام نہیں ہے۔ مسلمانوں کا مایہ خمیر یا ان کی قومیت کا عنصر محض مذہب ہے۔ اگر مذہب کو مسلمانوں سے الگ کر دیا جائے تو مسلمانوں کا وجود ہی ختم ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی بھی اسلام پر کوئی آنچ آئی یا کوئی خطرہ پیدا ہوا تو اس سے اسلام کو بچانے کے لیے مسلمان ہر طرح سے تیار رہے۔ یونان اور فارس کے علمی خزانے جب عربی زبان میں منتقل ہوئے اور سبھی قوموں کو مناظرات اور مذہبی مباحثات کی پوری چھوٹ دی گئی تو اسلام کے لیے ایک بڑا خطرہ پیدا ہو گیا۔ یہودی، عیسائی، پارسی چاروں طرف سے اسلام کی مخالفت میں کھڑے ہو گئے۔ اور اسلام کی فتوحات کے زمانے میں ان کو جو نقصان پہنچا تھا، اس کا بدلہ انھوں نے قلم کے ذریعہ لینا چاہا۔ بہت ہی آزادی اور بے خوفی کے ساتھ اسلامی عقائد اور مسائل پر ایسے اعتراضات کئے کہ کمزور عقیدہ مسلمانوں کو اپنا ایمان بچانا مشکل ہو گیا۔

حالانکہ تلوار کے زور پر بہ آسانی ان کی زبانیں بند کی جا سکتی تھیں۔ لیکن یہ اسلامی وقار و عظمت کے خلاف تھا۔ اور حکومت کے زور سے ان کو روکنا نامناسب خیال کیا گیا۔ علماء نے بہت ہی محنت اور ذوق کے ساتھ فلسفہ کو پڑھا اور سیکھا اور قلم کی تلوار سے ہی مخالفین کے واروں کو روکا ان ہی معرکوں نے آگے چل کر ''علم کلام'' کی شکل اختیار کی۔

علم کلام، حالانکہ ایک عرصے سے مخلوط مجموعۂ مسائل تصور کیا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی جو الگ الگ قسمیں ہیں اس کی ایک شاخ تو وہ ہے جو مخصوص اسلامی گروہوں کے آپسی انتشار کی وجہ سے وجود میں آئی اور کافی عرصے تک یہ ترقی کرتی گئی اور اس کی وجہ سے بڑے بڑے ہنگامے اور معرکہ آرائیاں وجود میں آئیں ہیں۔ اس میں قلم کے ساتھ تلوار کا بھی استعمال کیا گیا اور اسلام کو اس سے بہت نقصان پہنچا۔

اس کی دوسری شاخ وہ ہے جو فلسفہ سے مقابلہ کے لیے وجود میں آئی۔ امام غزالی کے عہد تک یہ دونوں جداگانہ شاخیں تصور کی جاتی تھیں۔ امام غزالی نے ان کو ملانے کی بنیاد رکھی اور امام رازی نے اس کو آگے بڑھایا اور متاخرین نے اس کو اس قدر گھلا ملا دیا کہ یہ اصول عقائد فلسفہ، کلام کلام سب ایک جگہ مل گئے اور ایک کھچڑی سی بن گئی۔

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

مسلمانوں کی موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت علم کلام کی پہلی شاخ کا تذکرہ کرنا کچھ سودمند نہ ہوگا۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی دیکھنا ہے کہ ہمیں دوسری قسم کے علم کلام کی تاریخ لکھی ہے اور، جس کی بنیاد پر نیا علم کلام مرتب ہوا ہے۔ علم کلام کی دوسری شاخ کی تاریخ لکھنے سے پہلے علم کلام کی پہلی شاخ کے بارے میں جاننا ضروری ہے کیونکہ اس کے متعلق بہت سی معلومات پہلے ہی قسم کی علم کلام کی تاریخ جاننے پر منحصر ہیں۔ اس لیے اس کا ایک ہلکا سا خاکہ ہمارے سامنے رہنا ضروری ہے۔ اسلام جب تک عرب سے باہر نہیں نکلا تھا عقائد کے متعلق کسی بھی قسم کی پیچیدگیاں یا پریشانیاں نہیں پیدا ہوئی تھیں کیونکہ عربوں کا مذاق تخیلی نہیں عملی تھا اسی بنا پر ارکانِ اسلام یعنی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے بارے میں شروع سے ہی ترقیات اور تحقیقات کا آغاز ہوگیا تھا صحابہ کرامؓ کے زمانے میں ہی فقہ کا ایک مجموعہ وجود میں آچکا تھا۔ لیکن کچھ باتیں ایسی بھی تھیں جو ایمان اور اعتقاد سے متعلق تھیں ان کے بارے میں زیادہ کدوکاوش، چھان بین اور بحث ونزاع نہیں شروع ہوئی تھی، صرف اجمالی عقیدہ کو ہی کافی سمجھا گیا تھا۔

لیکن وقت کے ساتھ ساتھ جوں جوں اسلام کو وسعت ہوتی گئی اور یونانی، ایرانی اور قبطی وغیرہ اقوام اسلام میں داخل ہوئیں تو عقائد سے متعلق نکتہ آفرینیوں کا آغاز ہوا۔ اس کا بڑا سبب تو یہ تھا کہ عجمی قوموں میں نکتہ چینیاں کرنے کی عادت زیادہ ہوتی تھی۔ اور بات کو بلاوجہ بڑھاتے تھے۔

دوسرا بڑا سبب یہ تھا کہ جو قومیں اسلام میں داخل ہوئیں ان کے مذہب میں عقائد اور مسائل اسلام سے بالکل الگ تھے۔ مثلاً صفات خدا، جزا وسزا، قضا وقدر، شرک، بت پرستی، تعداد آلہہ وغیرہ عقائد سے متعلق تو ان کا ذہن بالکل صاف ہوگیا تھا۔ لیکن جہاں کہیں اسلامی عقائد کے بہت سے پہلو سامنے آتے تھی ان میں سے کچھ ان کے قدیم عقائد سے ملتے تھے۔ وہاں یہ اس پہلو کو قبول کر لیتے تھے۔ کیونکہ الگ الگ مذاہب کے لوگ اسلام میں آئے تھے اور ان کے قدیم عقائد میں سے اکثر باہم بالکل مختلف تھے اس بنا پر ان مختلف عقائد کا جو اثر ہونا تھا ان کا مختلف ہونا بھی لازمی تھا۔

علم کلام کی دوسری شاخ وہ ہے جو فلسفہ سے مقابلے کے لئے وجود میں آئی۔ حقیقتاً اسی علم کلام کی تاریخ لکھنی ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ عقائد میں بحث ونظر کا آغاز کس طرح ہوا۔ عہد بنوامیہ تک یہ مناظرے اور مباحثے مسلمانوں تک ہی محدود تھے۔ لیکن عہد عباسی میں یہ دائرہ وسیع ہوگیا اور اس عہد میں تعلیم کو بہت وسعت حاصل ہوئی۔ عیسائیوں، یہودیوں اور مجوسیوں کو اسلامی درسگاہوں میں عربی علوم حاصل کر

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

نے کی اجازت تھی۔ اس بنا پر ان کو مسلمانوں کے مذہبی اعتقادات اور خیالات کو جاننے کا موقع ملتا تھا۔ اس کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کرنے کی انھیں کھلے طور پر اجازت تھی۔ اسی وجہ سے دوسری قوموں کو اسلامی عقائد پر ردوقدح کرنے کا موقع ملا۔

خلیفۂ منصور نے ان سب سے آگے بڑھ کر دنیا کی تقریباً سبھی زبانوں کی مذہبی اور علمی تصانیف کا ترجمہ عربی میں کروایا جن کو پڑھنے کے بعد ضعیف العقیدہ مسلمانوں کے اعتقاد متزلزل ہو گئے۔

یہ اسباب اس بات کے مقتضی تھے کہ جس طرح اسی قسم کی ضرورتوں کے پیش نظر علمائے اسلام نے تفسیر، بلاغت، نحو اور دوسرے فنون کو وجود بخشا تھا، اسی طرح علم کلام کو بھی اپنی خواہش سے وجود بخشتے لیکن کلام کے لئے یہ بہت اچھا ہوا کہ حکومت نے بھی اس بات کی تحریک دی خلیفہ مہدی جو ہارون الرشید کے والد تھے اور ۱۵۸ھ میں تخت نشین ہوئے انھوں نے اسلامی علماء کے نام یہ حکم جاری کیا کہ اسلام پر جو الزامات لگائے جاتے ہیں ان کے جوابات لکھے جائیں۔

حالانکہ اس کو اس وقت تک علم کلام کے نام سے موسوم نہیں کیا تھا۔ معتزلہ نے مامون الرشید کے عہد میں فلسفہ پر مہارت حاصل کی اور اس فن کی تدوین فلسفیانہ مذاق پر کی تو انھوں نے اس کا نام علم کلام رکھا۔

اس امر میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے کہ کلام کو علم کلام کیوں کہا گیا۔ مورخ ابن خلکان نے محمد ابو الحسین معتزلی کے تذکرہ میں سمعانی سے نقل کیا ہے کہ ''چونکہ سب سے پہلا اختلاف جو عقائد کے متعلق پیدا ہو وہ کلام الٰہی کی نسبت پیدا ہوا، اس مناسبت سے علم عقائد کا نام کلام پڑ گیا۔

لیکن یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ نہ تو پہلا اختلاف کلام الٰہی کے متعلق تھا اور نہ ہی عہد بنو امیہ تک اس کو کلام کہا جاتا تھا۔

علامہ شہرستانی نے ملل ونحل میں لکھا ہے کہ

> ''اس کی وجہ یا تو یہ تھی کہ مسائل عقائد میں جس مسئلہ پر بڑے معرکے رہے، وہ کلام الٰہی کا مسئلہ تھا، یا اس وجہ سے کہ چونکہ یہ علم فلسفہ کے مقابلہ میں ایجاد ہوا تھا، اس لئے فلسفہ کی ایک شاخ (یعنی منطق) کا جو نام تھا اس فن کا بھی وہی نام رکھا گیا، کیونکہ منطق اور کلام مرادف اور ہم معنی الفاظ ہیں۔'' (یہی وجہ تسمیہ صحیح ہے۔) [1]

---

[1] ادیب شبلی نمبر۔ ستمبر ۱۹۶۰ء صفحہ ۵۵

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

تحقیقات سے یہ معلوم ہوا ہے کہ علم کلام پر سب سے پہلی کتاب ابوالہذیل نے لکھی۔ ابوالہیذیل کا پورا نام محمد بن ابوالہذیل بن عبداللہ بن کحول ہے اس کی پیدائش ۱۳۱ھ ہوئی اور وفات ۲۳۵ھ میں ہوئی۔

ابوالہذیل نے چھوٹی بڑی کم وبیش علم کلام پر ساٹھ تصانیف چھوڑی ہیں جن میں اس نے بہت ہی دقیق مسائل پر اپنی آرا پیش کی ہیں کافی عرصے سے ان تصانیف کا کچھ پتا نہیں ہے۔ لیکن اس نے ملحدوں اور مجوسیوں سے جو مناظرات کئے تھے اور تقریریں کی تھیں وہ کچھ کچھ ابن خلکان، درر دغرر اور شرح ملل ونحل میں ملتی ہیں آج کل کی طرح ابوالہذیل کے مناظرات میں محض لسانی اور زبان آوری نہیں پائی جاتی تھی بلکہ انکا یہ اثر ہوتا تھا کہ اکثر مخالفین مذہب اور ملاحدہ اپنے عقائد کو چھوڑ دیتے تھے اور اسلام مین داخل ہو جاتے تھے۔

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

ج۔شبلی کے علم کلام کے امتیازات

شبلی نے تاریخ، تنقید، سوانح، علم کلام اور شعروادب میں بیش بہا اور بے مثل خدمات انجام دی ہیں۔ عام طور پر یہ مانا جاتا ہے کہ وہ تاریخ کے مرد میدان ہیں۔اس رائے سے کافی حد تک اتفاق بھی کیا جاسکتا ہے لیکن ان کا اصل میدان علم کلام ہے۔ان کی مورخانہ شخصیت ان کی متکلمانہ شخصیت پر ترجیح رکھتی ہے۔ان کی زیادہ تر تصانیف تاریخ سے ہی تعلق رکھتی ہیں۔لیکن بغور دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے تاریخ کا استعمال علم کلام تک رسائل کے لئے کیا ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اپنی تصنیف ''پرانے چراغ'' حصہ دوم میں لکھتے ہیں:

''ادبیات کی تاریخ کا یہ ایک عجیب واقعہ ہے کہ ایک ادیب ادب کے ایک خاص شعبے میں بڑا نام پیدا کرلیتا ہے اور وہ خود اس کو اپنی متاع حیات سمجھتا ہے، اور لوگ بھی اس کو اسی شعبے کا امام مان لیتے ہیں، لیکن دراصل اس کو دوسرے شعبے میں امتیاز حاصل ہوتا ہے۔''[1]

کچھ ارباب فکر ونظر کے نزدیک ان کا میدان عمل ادب وانشاء ہے۔ادب اور انشاء کو بھی انھوں نے علم کلام کے وسیلے کے طور پر برتا ہے۔نتیجتاً ان کا مطمح نظر علم کلام ہی ہے۔

شبلی سیرت نگاری اور تاریخ نویسی کو بھی علم کلام کا حصہ تصور کرتے ہیں۔لیکن ساتھ میں یہ بھی کہتے ہیں کہ اس میں غیر مسلم سیرت نگاروں کے شکوک وشبہات اور غیر مسلم مورخین کے اسلام پر اعتراضات کے جوابات بھی ہوں۔''علم کام کی حیثیت سے سیرت کی ضرورت'' کے ذیلی عنوان کے تحت لکھتے ہیں:-

''اگلے زمانے میں سیرت کی ضرورت صرف تاریخ اور واقعہ نگار کی حیثیت سے تھی۔علم کلام سے اس کو واسطہ نہ تھا لیکن معترضین کہتے ہیں کہ اگر مذہب صرف خدا کے اعتراف کا نام ہے تو بحث یہیں تک رہ جاتی ہے، لیکن جب اقرار نبوت بھی جزو مذہب ہے تو یہ بحث

---

[1] پرانے چراغ۔مولانا سید ابوالحسن علی ندوی حصہ دوم، ص ۱۷۰

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

پیش آتی ہے کہ جو شخص حاملِ وحی اور سفیر الٰہی تھا، اس کے حالات، اخلاق اور عادات کیا تھے؟

یورپ کے مورخین آں حضرتؐ کی جو اخلاقی تصویر کھینچتے ہیں وہ (نعوذ باللہ) ہر قسم کے معائب کا مرقع ہوتی ہے۔ آج کل مسلمانوں کو جدید ضرورتوں نے عربی علوم سے بالکل محروم کر دیا ہے۔ اس لیے انھیں کبھی پیغمبر اسلام کے حالات اور سوانح کے دریافت کا شوق ہوتا ہے، تو انھیں یورپ کی تصنیفات کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح زہر آلود معلومات آہستہ آہستہ اثر کرتی جاتی ہے۔ اور لوگوں کو خبر تک نہیں ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ ملک میں ایسا گروہ پیدا ہو گیا ہے جو پیغمبر کو محض ایک مصلح سمجھتا ہے جس نے اگر مجمع انسانی میں کوئی اصلاح کر دی تو اس کا فرض ادا ہو گیا۔ اس بات سے اس کے منصب نبوت میں فرق نہیں آتا کہ اس کے دامن اخلاق پر معصیت کے دھبے بھی ہیں۔

یہ واقعات تھے جنھوں نے مجھ کو بالآخر مجبور کیا، اور میں نے سیرت نبویؐ پر ایک مبسوط کتاب لکھنے کا ارادہ کر لیا۔''[1]

علامہ شبلی نعمانی نے بھی ہندوستان کے دوسرے مصنفین کی طرح علم کلام کے موضوع پر طبع آزمائی کی۔ اور دو مستقل تصانیف ''علم الکلام'' اور ''الکلام'' یادگار چھوڑی ہیں۔ اس کے علاوہ ایک مضمون ''الاعتزال والمعتزلہ'' کے نام سے علم کلام پر اور ہے۔ ''الغزالی'' ''سوانح مولانا روم'' مین بھی علم کلام پر ضمناً تذکرہ کیا گیا ہے۔ شبلی کی تصانیف کا بغور جائزہ لینے پر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی بیشتر تصانیف میں علم کلام کا رنگ پایا جاتا ہے۔

لیکن علامہ شبلی نعمانی اور دوسرے ہندوستانی مصنفین کے درمیان ایک واضح فرق ہے۔ دوسرے مصنفین نے علم کلام کی تاریخ، مختلف فرقوں کے عقائد میں جو اختلافات تھے، ان کا مستقل طور پر جائزہ نہیں لیا ہے اور نہ ہی کلامی نظریات کو ترتیب کے ساتھ پیش کیا ہے اس سے جو نتیجہ ہمارے سامنے آیا وہ یہ تھا کہ یہ مصنفین متون و شرح اور حواشی کے تنگ دائرے میں پھنس کر رہ گئے۔ اور انھیں مسائل و مباحث میں الجھے رہے۔ جن کو زمانے نے ترک کر دیا تھا۔ اس لیے ان اہل قلم اور مصنفین کو متکلمین یا علم کلام کے ماہرین کا خطاب نہیں دے سکتے ہیں۔ ان کو ہم محض اس فن کا ماتن، شارح اور محشی پکار سکتے ہیں، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

---

[1] فکر و نظر شبلی نمبر، جون ۱۹۹۶ء - ظفر احمد صدیقی، صفحہ ۲۴۳

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

دوسری طرف دیکھا جائے تو علامہ شبلی نے ان مصنفین کے برخلاف علم کلام کی تاریخ کا بہت باریک بینی سے مطالعہ کیا۔ معتزلہ، اشاعرہ، ماتریدیہ اور محدثین کے افکار و نظریات اور ان کے منشاء اختلاف کا بغور جائزہ لیا۔ پھر ان سب کی روشنی میں اپنے کلامی نظریات ترتیب دیے پہلی بار کسی مصنف نے قدیم علم کلام سے استفادہ کرتے ہوئے، ''جدید علم کلام'' کے تخیل کو سب کے سامنے پیش کیا۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ شبلی دوسرے ہندوستانی مصنفین کے بیچ ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا ان کو متکلم کی حیثیت سے سمجھنے کے لئے ان کے ''نظریۂ علم کلام'' کو سمجھنا ضروری ہے۔

شبلی شرعی احکام اور مذہبی عقائد کی تشریح اور تعبیر کرنے میں ایک حد تک عقل کے استعمال کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ شبلی کا ماننا ہے کہ توضیح و تفسیر کرنے کے لیے ایسا راستہ اختیار کرنا چاہیے جس سے دوسروں کو اشکالات اور اعتراضات کا کم سے کم موقع ملے۔ اس نقطۂ نظر سے جب ہم شبلی کے نظریات پر روشنی ڈالتے ہیں تو انداز ہوتا ہے کہ در پردہ شبلی کی حمایت اور ہمدردیاں معتزلہ کے ساتھ ہیں۔ اس کا اندازہ ہم امورِ ذیل سے کر سکتے ہیں:

(۱) ''شبلی محدثین کو اربابِ ظاہرہ اور معتزلہ کو اہل نظر کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔

(۲) محدثین کے معتزلہ سے اختلاف کو خود انھیں کی غلط فہمی کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔

(۳) معتزلہ کو اسلام او مسلمانوں کے خادم کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔

(۴) معتزلہ کے نظریات کی ایسی توجیہ کرتے ہیں جس سے ان کا برحق ہونا ظاہر ہو۔

(۵) اس پر بار بار زور دیتے ہیں کہ فقہا و محدثین کی جماعت میں بھی بعض معتزلی گزرے ہیں۔

محدثین کی طرح اشاعرہ کے ساتھ بھی غیر ہمدردانہ رویہ رکھتے ہیں۔ اس زمن میں امورِ ذیل غور طلب ہیں:

۱۔ ''موصوف معتزلہ کے برعکس اشاعرہ کے مسلک کو خلافِ عقل تصور کرتے ہیں۔

۲۔ ان کے مجموعۂ عقائد کو اس انداز سے پیش کرتے ہیں جس سے اس کی رکاکت اور سفاہت ظاہر ہو۔

۳۔ اشاعرہ کے عقائد کی تردید میں جابجا دوسروں کے اقوال نقل کرتے ہیں۔

۴۔ اس پہلو پر زور دیتے ہیں کہ خود اشاعرہ میں بعض نامور متکلمین اپنے مسلک سے پوری طرح مطمئن نہیں تھے۔''[۱]

---

[۱] فکر و نظر شبلی نمبر جو ۱۹۹۶ء ظفر احمد صدیقی، ص ۱۴۰

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

شبلی کے علم کلام کے نظریے کے سلسلے میں اس حقیقت کو واضح کرنا ضروری ہے کہ شبلی نے علم کالم کے کتابی سرمایہ کا مطالعہ کرنے کے بعد اپنی یہ رائے پیش کی تھی کہ قدیم علم کلام مین عام طور پر اور اشاعرہ کے علم کلام میں خاص طور سے غیر ضروری عناصر بہت زیادہ ہیں اور ضروری عناصر کا ذکر بہت کم ہے۔ شبلی کی رائے کے مطابق متکلمین نے توحید رسالت، آخرت اور مقصد پر توجہ صرف کرنے کی بجائے، ان عقائد پر زیادہ زور دیا ہے جن کا قرآن اور حدیث میں کہیں تذکرہ نہیں ملتا ہے۔ ''علم الکلام'' جلد اول میں رقم طراز ہیں:

''علم کلام حقیقت میں جس چیز کا نام ہے، وہ عقائد کا اثبات ہے اور علم کلام کی تاریخ میں یہی چیز جانِ سخن ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ اس کے متعلق قدماء کی تصنیفات ناپید ہیں اور متاخرین کا اگرچہ دفتر بے پایاں موجود ہے۔ لیکن وہ بالکل اس مصرعے کا مصداق ہے۔ ع

شد پریشاں خوابِ من از کثرتِ تعبیر ہا

سب سے بڑی غلطی متاخرین سے یہ ہوئی کہ سیکڑوں وہ باتیں جن کو نفیاً یا اثباتاً مذہب اسلام سے چنداں تعلق نہ تھا۔ عقائد اسلام میں شامل کر لی گئیں اور علم کلام کا بڑا حصہ ان کے اثبات اور استدلال میں صرف ہو گیا۔''[1]

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''بہت سے عقائد میں شارع نے جس قدر تصریح کی تھی اس پر اضافہ کیا گیا اور ان اضافوں کو جزو عقیدہ قرار دیا گیا۔ اور چوں کہ یہ ایجادات اکثر دور از کار تھیں۔ اس لیے ان کے ثابت کرنے میں ہر قسم کی سینہ زوری صرف کی گئی مثلاً روایات اور نصوص میں صر اس قدر وارد تھا کہ قیامت میں مردے اٹھیں گے یہ کچھ تصریح نہ تھی کہ وہی پہلا جسم ہوگا یا کوئی دوسرا جسم۔ اشاعرہ متاخرین نے اس قدر اپنی طرف سے اضافہ کیا ہے کہ وہی پہلا جسم ہوگا۔ اس صورت میں چونکہ ''اعادۂ معدوم'' لازم آتا تھا، اس لیے اس کو علم کلام کا ایک مسئلہ قرار دیا اور اس کے جواب میں جواز پر دلیلیں قائم کیں۔ اسی طرح اور بہت سے غیر ضروری مسائل عقائد میں شامل ہو گئے''۔[2]

---

[1] علم الکلام: علامہ شبلی نعمانی، جلد اول، ص ۶۲

[2] علم الکلام: علامہ شبلی نعمانی، حصہ اول، ص ۸۶

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

شبلی، علم کلام کے بعض ضروری مباحث کے سلسلے میں متکلمین نے جو دلائل پیش کیے تھے، ان سے مطمئن نہ تھے۔ وہ مباحث یہ ہیں اللہ جل شانہ کے وجود کا اقرار، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نبی حق ماننا اور آپ کے معجزات کی حقیقت کو تسلیم کرنا۔

شبلی کا ماننا ہے کہ یہ دلائل ایسے باوزن اور مضبوط نہیں ہیں کہ ان پر بحث نہ کی جا سکے۔ شبلی عقیدے کے درجے میں ان پر ایمان نہیں رکھتے ہیں اور ان کے اثبات پر نئے دلائل پیش کرنے کی ضرورت کا احساس ہے۔ لحاظۃ الکلام لکھنے کا مقصد اس ضرورت کو پورا کرنا تھا اور اس کمی کی تلافی تھی۔ ''علم الکلام'' کے حصہ اول میں لکھتے ہیں:

> ''اب وہ مسائل رہ گئے جو درحقیقت اسلام کے اصلی مسائل ہیں، ان کی صحت میں کیا کلام ہے؟ لیکن متاخرین ان کے اثبات کا جو طریقہ اختیار کرتے ہیں وہ ایسا ہوتا ہے کہ اعتراضات پیدا ہوتے جاتے ہیں اور یہ سلسلہ برابر قائم رہتا ہے۔''[1]

سید سلیمان ندوی نے ''اثبات باری'' کے سلسلے میں شبلی کے موقف کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:

> ''مصنف نے ''الکلام'' میں خود یہ ثابت کیا ہے کہ عالم خدا کی مخلوق ہے، اور اس کے ارادہ اور اختیار سے بنا ہے، چنانچہ وجود باری کے عنوان سے پہلے متکلمین اور فلاسفہ کے وہ دلائل نقل کیے ہیں جن سے انھوں نے خدا کے وجود کو ثابت کیا ہے۔ پھر ان دلائل کی کمزوریاں دکھائی ہیں۔''[2]

شبلی کا علم کلام سے متعلق ایک اہم نقطۂ نظر یہ بھی ہے کہ چونکہ قدیم علم کلام کی بنیاد فلسفہ اور منطق ہیں اور ان میں محض غیر ضروری احتمال آفرینیاں ہیں۔ ان کی بنیاد پر ہم ہرگز قطعیت کی عمارت نہیں کھڑی کر سکتے ہیں۔ اس وجہ سے قرآن کیا نداز استدلال کی تقلید کرنی چاہیے نہ کہ علم کلام کو فلسفہ و منطق پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ مثال کے طور پر ''خدا کے ثبوت کے ذیلی عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

> ''خدا کے ثبوت کے متعلق خود قرآن مجید میں خطابی اور برہانی دونوں قسم کے دلائل موجود تھے۔ لیکن کتب کلامیہ میں ان کا ذکر تک نہیں۔ کتب کلامیہ میں جو استدلال قائم

---

[1] علم الکلام: حصہ اول، ص ۷۳

[2] حیات شبلی: سید سلیمان ندوی حصہ دوم، ص ۳۰۵

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

کیے ہیں ..... یہ چاروں دلائل نقص سے خالی نہیں۔''[1]

شبلی، علم کلام کے متعلق محض اپنے افکار ونظریات کے اظہار و بیان پر ہی تکیہ کر کے نہیں بیٹھ جاتے ہیں بلکہ ''الکلام'' کے نام سے عملی طور پر ایسے علم کلام کو ترتیب دیا ہے، جس کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ان کے نظریہ کلام سے مکمل مطابقت رکھتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ علم کلام کی تجدید کے متعلق اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے میں شبلی پوری طرح سے کامیاب رہے ہیں۔ علامہ شبلی نعمانی نے جو جدید علم کلام مرتب کیا تھا اس کے مندرجہ ذیل خصائص ہیں:

(۱) مولانا نے صرف انھیں عقائد کے اثبات کی کوششیں کی ہیں جو نصوص وروایات سے براہ راست ثابت ہیں اور جن پر ایمان واسلام کا بلا واسطہ دارومدار ہے۔ چنانچہ ''الکلام'' میں انھوں نے اصالتاً صرف اثبات باری تعالیٰ، توحید اور نبوت ہی سے بحث کی ہے، بقیہ مباحث ضمناً اور تبعاً آئے ہیں۔

(۲) مولانا نے جن عقائد کو موضوع بحث بنایا ہے، ان سے متعلق قدیم علم کلام کے دلائل سے وہ متفق نہیں تھے اس لیے ان پر اعتراضات وارد کرتے ہوئے اپنی طرف سے نئے دلائل پیش کئے ہیں۔

(۳) شبلی کے پیش کردہ دلائل نئے ضرور ہیں، لیکن انھیں بے بنیاد نہیں کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ متقدمین کی کتابوں میں اس کی کوئی نہ کوئی اصل ضرور مل جاتی ہے، ورنہ کم از کم قرآن واحادیث کے دوسرے بیانات سے وہ کھلے طور پر متصادم نہیں۔

(۴) دلائل کے علاوہ مولانا نے قدیم متکلمین کے پیش کردہ بہت سے عقائد کا ابطال بھی کیا ہے، یا ان کی کمزوری ظاہر کی ہے، لیکن یہ عقائد تمام تر ایسے ہی ہیں، جو نصوص وروایات میں صراحتاً مذکور نہیں، بلکہ متکلمین نے ان پر کسی دوسرے اسلامی عقیدے کے اثبات کو مبنی قرار دیتے ہوئے انھیں زمرۂ عقائد میں شامل کر لیا ہے۔

(۵) قدیم علم کلام فلاسفہ، ملاحدہ، معتزلہ اور دوسرے گمراہ فرقوں کو پیش نظر رکھ کر مرتب کیا گیا تھا۔ مولانا نے یہ محسوس کیا کہ دور جدید میں گمراہ فرقے ہیں، نہ ان کے عقائد زیر بحث آئے ہیں اس لیے اب بھی انھیں قدیم مباحث میں الجھے رہنا گویا وقت ضائع کرنا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے مرتب کردہ علم کلام سے ان غیر ضروری عناصر کو نکال دیا اور اس کے بجائے یورپ کے جدید افکار ونظریات اور مزعومات ومعتقدات کو

---

[1] حیاتِ شبلی: سید سلیمان ندوی حصہ دوم، ص ۲۱۸

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

پیش نظر رکھ کر مذہب کے بارے میں پیدا شدہ نئے شکوک وشبہات کا جواب دیا۔

(۶) سائنس کی ایجادات وانکشافات اور مغرب سے مرعوبیت کی بنا پر مسلمانوں کی اکثریت کی اس فریب میں مبتلا ہوگئی تھی کہ سائنس اور مذہب میں تطبیق کی کوئی صورت موجود نہیں اور یہ کہ سائنس نے مذہب کو شکست فاش دے دی ہے۔ اس لیے شبلی نے اپنے علم کلام میں مذہب کے بنیادی عقائد کو ایسے انداز سے پیش کیا کہ سائنس اور مذہب کا مزعومہ تعارض رفع ہوگیا اور مسلمانوں کی اکثریت شکوک وشبہات کی فضا سے باہر نکل آئی۔

مہدی حسن افادی نے بہت خوبصورت پیرائے بیان میں علامہ شبلی کے علم کلام کے اس پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے ایک اقتباس کا یہاں ذکر کرنا کارآمد معلوم ہوتا ہے وہ لکھتے ہیں:-

''اگر موجودہ نسل کے لئے دفاعی اور عقلی ترقی کے ساتھ اخلاقی تکمیل کی بھی ضرورت ہے تو میں خیال کرتا ہوں کہ شبلی نے تاریخی سلسلے میں جس قدر مذہبی لٹریچر پیدا کر دیا ہے، وہ ہمارے لئے کافی سے زیادہ ہے۔ خاص کر اس جدت کے لحاظ سے کہ فاضل شبلی نے ایک طرف تو ''بڑے میاں'' یعنی مذہب کی پگڑی نہیں اتاری اور ساتھ ہی یورپ کے نو خیز چلتے پرزوں یعنی فلسفہ وسائنس کے سامنے تیرہ سو برس کے بوڑھے سے ہاتھ نہیں جڑوائے، بلکہ دونوں میں مصافحہ کرا دیا۔ یہ معتدل روش جو اس ادبی نزاع میں اختیار کی گئی، لائق رشک شبلی ہی کا حصہ ہے جو ہمارے متفق علیہ پیشوائے علمی ہیں۔ ان کی ثقاہت نے جہاں مذہب کی حق تلفی نہیں ہونے دی، سائنس وفلسفے کی مغائرت بھی دور کر دی اور ان کو مذہب کا دست وبازو بنا دیا ہے۔ آئندہ زمانے میں جب ہماری عقلی ترقیات کا شباب ہوگا، شبلی کو اپنی مساعی جمیلہ کی پوری داد ملے گی۔ تاہم آج کل کا تعلیم یافتہ طبقہ جو عموماً مذہب سے بے پرواہ ہے مذہب فطری یعنی حکیمانہ اسلام سے دست بردار نہ ہو سکے گا۔ معقول ومنقول میں تطبیق کی غایت اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے؟ جو شبلی کی دردسری کے بجائے خود ایک قیمتی صلہ ہے۔''[1]

---

[1] بیگم مہدی افادی، مرتبہ افادات مہدی، صفحہ ۱۹۴

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ شبلی سے پہلے کے ہندوستان کے تصنیف نگار علم کلام کے سلسلے میں اشعریت کے محدود دائرے میں پھنسے ہوئے تھے یا پھر یہ تھا کہ فروعی مسائل میں پھنس کر ایک دوسرے پر نکتہ چینی کرتے رہتے تھے۔ انھوں نے نہ تو علم کلام کی مکمل تاریخ پر نظر ڈالنے کی سعی کی اور نہ ہی صالح اور غیر صالح عناصر میں تفریق کی اور نہ ہی اس طرف دھیان دیا کہ علم کلام کی کس طرح جدید تقاضوں کے ساتھ مطابقت قائم کی جائے۔ چنانچہ علم کلام کی تاریخ کی ترتیب علم کلام کی اصلاح وتجدید میں انفرادیت واولیت پیدا کرنے کا سہرا شبلی ہی کے سر ہے۔

Maulana Azad Library, Aligrh Muslim University

پانچواں باب

مقالات اور مضامین ۱۸۷-۱۹۴

ا- مقالات کی ادبی اور تاریخی حیثیت

ب- موضوعات اور اسلوب بیان

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

۱- مقالات کی ادبی اور تاریخی حیثیت

جس طرح ہر سماج کی ایک مخصوص تاریخ، اس کے مادی ارتقاء کی مختلف ترقی اور اس کے تشکیلی عناصر اور تعمیری بنیادوں کے عروج و زوال کی ایک خاص داستان ہوتی ہے، اسی طرح تحریکوں کے پیدا ہونے، ان کے بڑھنے اور پھلنے پھولنے ان کے ختم ہونے کی بھی ایک داستان ہوتی ہے۔ ہر تحریک ایک مخصوص سیاسی اور معاشی پس منظر کی پیداوار ہوتی ہے۔ جس کو ہیئت اجتماعی کے تقاضے اور اس کی ضرورتیں ابھارتی، پھیلاتی اور اس میں عصری رنگ بھرتی ہیں اور تحریک اس وقت تک پنپ سکتی ہے جب تک کہ وہ اپنے مقاصد اور نصب العین کی طرف اسی رفتار سے حرکت کرتی ہے جو سماجی زندگی کے ارتقاء کی رفتار ہے اور اگر وہ تمدن کے نئے میلانات اور اس کے جدید عوامل سے پوری طرح ہم آہنگی پیدا نہ کر سکے تو پھر اس تحریک پر زوال اور انحطاط طاری ہونے لگتا ہے اور وہ یا تو ختم ہو جاتی ہے اور دوسری تحریکیں اس کی جگہ لے لیتی ہیں یا اس کی صحت مند اور متحرک قدروں سے ایک نئی تحریک جنم لیتی ہے۔ چنانچہ علی گڈھ تحریک کے ساتھ بھی یہی ہوا ۱۸۵۷ء کی جد و جہد نے ہندوستانی زندگی کو جن زاویوں سے متاثر کیا اور ہماری ثقافت، تعلیم و تربیت اور سیاست کو جو نئے انداز بخشے تھے ان سے مطابقت اور مفاہمت پیدا کرنے کا اگر کوئی ذریعہ تھا تو سرسید کے سماجی مسلک ہی میں مضمر تھا۔ اس تحریک کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے، اس نے ہندوستانیوں میں ایک نیا حوصلہ پیدا کیا، ہماری تہذیب پر بہت گہرے نقش چھوڑے، ہمارے ادب کو زندگی دی اور ہماری ذہنی دنیا میں تلاطم برپا کیا۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد جب ہندوستانی زندگی کا کارواں سیاست اور معشیت کی پر پیچ راہوں سے گذرنے لگا تو یہ تحریک اس کے قدم بہ قدم نہ چل سکی اور اس طرح رفتہ رفتہ اس کی سماجی افادیت میں انحطاط پیدا ہونے لگا۔ یہاں تک کہ ۱۸۹۳ء میں ندوۃ العلماء نے مذہبی، سیاسی، تاریخی اور ثقافتی قدروں کے ایک ملے جلے لائحہ عمل کا اعلان کیا یہ تحریک اپنی بعض رجعت پسندیوں اور قدامت پرستیوں کے باوجود چند نئے سیاسی امکانات کی حامل تھی۔

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

شبلی نعمانی کا نام اس سلسلے میں اس لیے خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ دوسرے علماء کی بہ نسبت ان کے پاس سیاسی اور سماجی زندگی کا ایک واضح اور روشن تصور موجود تھا۔ شبلی کو اس بات کا احساس ہو چکا تھا کہ اب ''خم کے'' سر سے ''خشت کلیہ'' ہٹا دینے کا وقت آ گیا ہے۔ شبلی نیابتی اصول سلطنت کی حمایت کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے مضامین میں سرسید کی انگریز دوستی پر جو آخری زمانے میں انگریز پرستی میں تبدیل ہوتی ہوئی نظر آ رہی تھی، بیباکانہ تنقید کی تھی۔ سرسید انگریز افسر بیک (Beck) کے مشوروں پر غیر ضروری حد تک اعتماد کرنے لگے تھے اور سرسید نے انڈین نیشنل کانگرس سے جو مخالفانہ رجحان ظاہر کیا تھا۔ اسے بھی بعض لوگ انگریزوں کے ایماء کا نتیجہ سمجھنے لگے تھے۔ شبلی نے سرسید کے سیاسی مسلک پر ایک جگہ بڑا لطیف طنز کیا تھا

کوئی پوچھے تو میں کہہ دوں گا ہزاروں میں یہ بات
روش سید مرحوم کی خوشامد تو نہ تھی
ہاں مگر یہ ہے کہ تحریک سیاسی کے خلاف
ان کی جو بات تھی آورد تھی آمد تو نہ تھی

شبلی کے مقالات ان کے سیاسی آدرش اور تمدنی عقائد کی بھرپور ترجمانی کرتے ہیں۔ اس زمانے میں مسلمانوں میں یہ خیال عام ہو گیا تھا کہ اگر وہ نیشنل کانگریس میں شریک ہو جائیں گے تو ان کی جو ایک علیحدہ قومی حیثیت ہے وہ ختم ہو جائے گی۔ وقار الملک نے تنسیخ بنگال پر ایک معرکۃ الارا مضمون لکھا تھا جس میں انھوں نے کانگرس کی سخت مخالفت کی تھی اور مسلمانوں کو اس سے دور رہنے کا مشورہ دیا تھا۔ اس مضمون پر تبصرہ کرتے ہوئے شبلی اپنے مضمون ''مسلمانوں کی پولیٹکل کروٹ'' میں لکھتے ہیں:-

''وقار الملک کا سنجیدہ لیکن بہادرانہ مضمون سچے دلیر مسلمانوں کی آواز ہو سکتا تھا اگر اس میں یہ غلط منطق شامل نہ ہوتی کہ ہم نیشنل کانگرس میں شریک ہو جائیں گے تو ہماری ہستی اس طرح برباد ہو جائے گی جس طرح معمولی دریا سمندر میں مل جاتے ہیں۔ اگر پارسیوں کی قوم ایک لاکھ جماعت کے ساتھ ہندوؤں کے انیس کروڑ اور مسلمانوں کے پانچ کروڑ افراد کے مقابلے میں اپنی ہستی قائم رکھ سکتی ہے۔ اگر گوکھلے تنہا ریفارم اسکیم کی عظیم الشان تحریک کی بنیاد ڈال سکتا ہے تو پانچ کروڑ مسلمانوں کو اپنی ہستی کے مٹ جانے کا اندیشہ نہیں کرنا چاہیے''[1]

---

[1] مسلمانوں کی پولیٹکل کروٹ = علامہ شبلی نعمانی صفحہ ۲۱

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں میں مختلف نظریات اور تصورات کا چرچا تھا۔ بعض کانگرس میں شرکت کے حامی تھے۔ بعض ارباب فکر کے نزدیک کانگریس میں شریک ہونا اس لیے بہتر تھا کہ ترکی اور ایران وغیرہ کے سیاسی حالات بہت بہتر نہ تھے۔ اور اس طرح مسلمانوں کی بین الاقوامی حیثیت معرض خطر میں پڑ گئی تھی۔ چنانچہ ''پانیئر'' کے نامہ نگار نے ان ہی خیالات کا اظہار کیا تھا جو شبلی کو بہت ناگوار گزرے تھے اور انھوں نے اپنے مضمون میں ان خیالات کی تردید کی تھی اور اس کا جواب بھی دیا تھا۔ شبلی ہندوستان میں جمہوریت کا خواب دیکھ رہے تھے اور کانگرس کے وجود میں انھیں اس خواب کی تعبیر نظر آتی تھی۔

حیات شبلی میں سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ ۱۸۹۲ء میں علی گڈھ کالج کی یونین کے ایک جلسے میں جمہوریت اور شخصی بادشاہی کے عنوان پر طالب علموں کا ''مناظارانہ مکالمہ'' ہوا تھا۔ سرسید اور دوسرے اساتذہ بھی اس میں شریک تھے شبلی نے اس میں جمہوریت کی تائید میں ایک زبردست تقریر کی تھی۔ شبلی کی نظم ''شہر آشوب اسلام'' میں اگرچہ ''زوال دولت عثمان'' کا ماتم کیا گیا ہے اور اسے شرع اور ملت کے مترادف قرار دیا گیا ہے اور اس نظم میں بعض رجعت پسند رجحانات کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں لیکن اس کی تہہ میں برطانوی سامراج سے نفرت ان کی سیاسی روزش سے بیزاری اور انسان دوستی کے جذبات کا فرماں نظر آتے ہیں۔ جہاں تک سیاست کی گہرائیوں کو ناپنے اور ہندوستان کے سیاسی اور سماجی مستقبل کا اندازہ لگانے کا تعلق ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شبلی، سرسید سے آگے دیکھ رہے تھے۔ علی گڈھ تحریک نے اردو ادب میں تغیر پسندی اور جدت پرستی کی ابتداء کی اور شبلی کی مساعی نے ہمارے ادب کو انقلاب اور آزادی کے خوابوں سے سجایا۔ سرسید نے ہماری تہذیب میں صالح روایتیں داخل کیں۔ اور ایک نئے سماجی آدرش کی رہنمائی کی۔ شبلی نے ہندوستان کے سیاسی شعور کو بیدار کیا۔ انگریز دوستی جس کی آگے چل کر حدیں دشمنی تک پہنچ گئی تھیں، ایک بھرپور وار کیا اور ہمارے ذہنوں میں ایک نئے سیاسی افق کا تصور پیدا کیا۔

شبلی کو اپنے گردوپیش کے حالات اور عصری مسائل کی الجھنوں کا پورا پورا اندازہ تھا ۱۹۱۲ء میں تقسیم بنگال کی تنسیخ ہوئی اور پھر طرابلس اور بلقان کی جنگ کا واقعہ پیش آیا۔ اسی زمانے میں مسئلہ آرمینیا نے عالمی سیاست میں ایک ہل چل سی مچادی۔ یہ تمام مسائل وواقعات شبلی کے سامنے تھے۔ ان حالات کا تجزیہ کرنے اور ان مسائل کی بنیادوں تک رسائی کی ایک پرخلوص کوشش ان کے مقالات میں متحرک دکھائی دیتی ہے۔ شبلی نے مسلمانوں کے سیاسی شعور میں بین الاقوامی احساس کا اضافہ کیا۔

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

شبلی نے اپنے مقالات میں نہ صرف سیاسی مسائل اور سیاسی قدروں کو اہمیت دی ہے بلکہ تاریخی آثار اور تمدنی رجحانات کو بھی اپنے مقالات میں جگہ دی ہے۔ مہدی افادی نے شبلی کو ''تاریخ کا معلم اول'' کہا تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ شبلی نعمانی نے اردو ادب کے علمی سرمائے میں بڑے شاندار کارناموں کا اضافہ کیا۔ شبلی نے ہمیں ذہنی بیداری عطا کی اور تاریخ کا استعمال سکھایا۔ اپنے مقالات میں شبلی نے تاریخ کو ایک خواب آور فضا کے طور پر استعمال نہیں کیا بلکہ تاریخی واقعات اور حالات کے نتائج کے انبساط سے ان کا مقصد ہندوستان کے ایک ایسے طبقے کو جگانا تھا جس کے دماغ پر ابھی اتک حکومت کا نشا چڑھا ہوا تھا۔ اپنے مقالات میں تاریخی اور مذہبی مباحث چھیڑنے سے شبلی کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی تصورات کے بعض پہلوؤں پر مغرب کے مورخین اور مصنفین نے جو اعتراضات کئے ہیں ان کا جواب دیا جائے۔ اس قسم کے مقالات مثلاً ''اسلامی حکومتیں اور شفاخانے''، ''اسلامی کتب خانے''، ''تراجم''، ''الجزیہ''، ''اسلامی مدارس''، ''حقوق الزمین''، ''میکنکس اور مسلمان'' یہ ان کے پہلے مجموعے کے مقالات میں ان کے دوسرے مجموعہ ''مقالات شبلی'' میں یہ مقالات ہیں۔ ''ہندوستان میں اسلامی تمدن کا اثر''، ''مسلمانوں کی علمی بے تعصبی'' اور المعتز الہ والاعتزال وغیرہ۔

ان مقالات میں شبلی نے منطقی دلائل اور تاریخی شہادتوں سے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ یورپین مورخین کے اعتراضات بالکل بے بنیاد ہیں۔ ان مقالات کے مطالعہ سے شبلی کے رچے اور منجھے ہوئے تاریخی شعور کا اندازہ ہوتا ہے اور اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے سنی سنائی باتوں اور سطحی معلومات پر اکتفا نہیں کیا ہے۔ شبلی کا مذہبی اور سیاسی مطالعہ بے حد وسیع تھا۔ سرسید کے کتب خانہ میں انھیں مشرق اور مغرب کی بہت سی نایاب کتابیں ملی تھیں ان کے مطالعہ نے شبلی کے تمدنی اور تاریخی مطمح نظر میں ایک خاص ہمہ گیری اور وسعت پیدا کر دی تھی۔ حافظ محمود شیرانی اور عابد حسین وغیرہ کے بیانات کے مطابق شبلی نے واقعات کی چھان بین اور تاریخی انسداد کے تقابلی مطالعہ اور صحت بیان پر زیادہ دھیان نہیں دیا ہے۔ اس کے باوجود بھی ہم کہ سکتے ہیں کہ شبلی نے اردو داں طبقہ میں تاریخی ذوق پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے اور اپنے اسلاف کے کارناموں پر ہمیں فخر کرنا سیکھایا ہے یہ بات مسلمہ ہے کہ تاریخ نگاری میں طرز ادا کا بانکپن، صحت بیان کی کوتاہی کی تلافی نہیں کرسکتا ہے۔ پھر بھی شبلی کے مضامین کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں اس کا احساس ضرور ہوتا کہ شبلی نے تاریخ کو جس انداز سے برتا ہے۔ تاریخی واقعات سے ان کا عطر جس طرح کھینچنے کی کوشش کی ہے اور تمدنی زندگی کے جو مرقعے پیش کئے ہیں وہ ادب میں ایک خوشگوار اور پرلطف اضافہ ہے۔

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

ب-مضامین-موضوعات اور اسلوب بیان

مولانا شبلی جیسی جلیل القدر اور تاریخ ساز شخصیتیں مدتوں میں پیدا ہوتی ہیں۔شبلی اپنے معاملات اور مذاق طبیعت میں اپنے زمانے سے بہت آگے تھے۔اس لئے انھوں نے افکار وخیالات میں علم وفن، درس و تعلیم، ادب وانشاء تصنیف وتالیف میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔مسلمانوں میں سرسید کے بعد ان کی جیسی جامع شخصیت دوسری نہیں پیدا ہوئی بلکہ بعض اوصاف اور خصوصیات میں سرسید سے بھی ممتاز تھے۔

وہ مذہبی علوم کے عالم بھی تھے اور جدید علوم سے آشنا بھی اور نئے رجحانات کے واقف کار بھی۔ پرانے علماء کی بھی صحبت اٹھائی تھی اور جدید تعلیم کے ارکان کے ہم نشین بھی رہے تھے۔علمی میدان میں محقق وناقد بھی تھے اور شاعر وادیب بھی، مورخ بھی تھے اور سیاسی بھی اسی وجہ سے ان کا ذوق بڑا متنوع ہے اور ان کے کارنامے بڑے گوناگوں ہیں۔ان سب کا عکس ان کے مضامین میں نظر آتا ہے جس سے ان کی پوری سیرت مرتب کی جاسکتی ہے شبلی اس زمانے میں پیدا ہوئے جب پرانی بساط الٹ رہی تھی اور نئی بساط بچھ رہی تھی۔جدید تعلیم نے حالات میں انقلاب پیدا کر دیا تھا۔مغربی تہذیب اور مغربی علوم کے سامنے پرانی تہذیب اور پرانے علوم کا ٹھہرانا مشکل نظر آرہا تھا۔

مولانا شبلی اگر چہ علماء کے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی تعلیم پرانے طرز پر ہوئی تھی لیکن وہ فطرتاً بڑے ذہین اور زمانہ شناس تھے اور ان کی نگاہ بڑی دور رس تھی گو وہ مغربی تعلیم وتہذیب سے مرعوب نہ تھے بلکہ اس کے ناقد تھے مگر ان کو اس کا پورا اندازہ ہو گیا تھا کہ اگر نئے حالات کا نئے اسلحہ سے مقابلہ نہ کیا گیا تو مغربی تہذیب کا سیلاب ہماری ساری قیمتی میراث کو بہالے جائے گا۔اس لیے شبلی نے درس وتعلیم، تحریر وتقریر تصنیف وتالیف، تحقیق وتنقید، ادب وانشاء عقائد وافکار کی تعمیر میں ایک انقلاب پید کر دیا۔اور پرانی بنیادوں پر ایک نئی عمارت کھڑی کی۔اس لحاظ ان کی ذات قدیم وجدید کا سنگم تھی جس میں دونوں کے دھارے آکر ملتے ہیں۔ان کے سارے کاموں میں یہی روح کارفرما نظر آتی ہے۔

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

مولانا کا سب سے نمایاں وصف تصنیف وتالیف اور تحقیق وتنقید ہے وہ اردو زبان کے ان اساطین میں ہیں جنھوں نے علمی اور ادبی دونوں فنون سے تصنیف وتالیف کا ایک نیا معیاری نمونہ قائم کیا۔ جس کی بعد کے تمام سنجیدہ مصنفین نے تقلید کی۔ ان کے مضامین سے تصنیف وتالیف کے بارہ میں ان کے نقطۂ نظر پر روشنی پڑتی ہے۔

شبلی کا تاریخی اور مذہبی مباحث کو برتنے کا انداز سرسید، چراغ علی، محسن الملک وغیرہ سے بالکل جدا تھا۔ سرسید اور ان کے رفقاء نے ثقافت اور مذہب کو جدید سائنس اور عقلیت سے قریب لانے کی کوشش کی۔ شبلی اسلاف کے کارناموں کو سراہ سکتے تھے، مذہب کی مقدر روایتوں سے زندگی میں اچھے کام کرنے کا عزم حاصل کر سکتے تھے۔ لیکن وہ مذہب کو عقلیت اور افادیت کی ترازوں میں تولنے کے قائل نہ تھے۔ شبلی کے دل میں اپنے مذہبی ورثے کا اتنا پیار اور احترام تھا کہ وہ انھیں کسی کسوٹی پر پرکھنا بھی گوارا نہیں کر سکتے تھے۔

حالؔی اور سرسیؔد مذہبی انداز کی قدیم طرز تعلیم کو وقت کے مطالبات اور نئی ضروریات کے اعتبار سے ناقص اور قابل ترمیم سمجھتے تھے۔ انھوں نے اپنے مضامین میں درس نظامیہ پر کڑی تنقیدیں کی تھیں۔ شبلی نے اس کے برخلاف قدیم طرز تعلیم کی حمایت میں اپنا مشہور مضمون ''مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم'' لکھا تھا۔ وہ غیر قومی بنیادوں پر قوم کی ذہنی تربیت اور تشکیل کے حامی نہ تھے۔ شبلی یورپ کے علمی کارناموں کا احترام کرتے تھے، وہ مغرب والوں کی تحقیق وتدقیق کے بھی قائل تھے۔ یورپین لوگوں کی جواں ہمتی اور ان کے حوصلہ سے نئے زندگی کی تڑپ اور اعلیٰ مقاصد تک پہنچنے کا عزم حاصل کرنا چاہتے تھے۔ لیکن وہ اپنے بعض ہم عصروں کی طرح یورپ سے مرعوب نہ تھے۔ شبلی ان لوگوں میں سے نہ تھے جنھیں مغرب کے مقابلہ میں اپنی قدیم تہذیب اور شائستگی، تعلیم وتربیت، اپنا علم وادب، پست وبے وقعت نظر آتے تھے اور جو یورپ کی ہر چیز کو بے عیب سمجھتے تھے۔ اس وقت ہندوستان میں ایک ایسا طبقہ وجود میں آرہا تھا۔ جو سستی مغربیت کا شکار ہو چکا تھا۔ اور جس کی عقل اکبر کے الفاظ میں بالکل ''سرکاری'' تھی۔ اس نوجوان نسل پر انھوں نے اپنی نظموں میں سخت تنقید کی تھی اور ان کے مصنوعی اور سطحی تہذیب کا مزاق اڑایا تھا۔ شبلی نوجوانوں کو اس مغربی زدگی سے بچانا چاہتے تھے۔ انھوں نے ایک ایسی طرز تعلیم کی حمایت میں مضامین لکھے جس میں مشرقی علوم فنون بھی شامل ہوں اور مغرب کی صحت مند تعلیمی قدریں بھی سما سکیں۔

درس وتدریس کے اس قومی فرض کو انجام دینے کے لیے شبلی نے علماء کا انتخاب بھی کیا ان کا خیال تھا

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

کہ ذہنی قیادت کی باگ انگریز پرستوں کے بجائے وطن دوست علماء کے ہاتھ میں دی جانی چاہیے۔ لیکن شبلی کا یہ خواب سرمندہ تعبیر نہ ہوسکا۔ ان کے سارے کارناموں کی بنیاد اسی جدید نما قدیم پر رکھی گئی تھی ''مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم'' کے علاوہ شبلی نے قدیم طرز تعلیم کی تائید میں بہت سے مضامین لکھے ہیں جن میں ''مدرسے اور دارالعلوم''، ''قدیم تعلیم''، ''مدارس نظامیہ'' اور ''تعلیم قدیم وجدید'' میں انگریزی تعلیم کو ناکافی بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:-

> ''اگر مذہب کی ضرورت ہے تو مذہبی تعلیم کے بغیر کیونکر ممکن ہے شاید یہ کہا جائے کہ اگر انگریزی کے ساتھ مذہبی تعلیم بقدر ضرورت ممکن ہے اور اسی قدر کافی ہے لیکن کیا صرف اس قدر تعلیم سے قرآن وحدیث کی حفاظت ہوسکتی ہے کیا اس درجہ کے تعلیم یافتہ اسلامی مشکل مسائل کی تشریح کرسکتے ہیں۔ کیا غیر مذہب والے مذہب اسلام اور تاریخ اسلام پر جو اعتراضات کرتے ہیں ان کے مقابلہ کے لیے اتنی تعلیم کافی ہے لیکن اس قدر تعلیم پائے ہوئے لوگ مذہبی جذبات مثلاً وعظ، امامت، فتویٰ وغیرہ انجام دے سکتے ہیں کیا عوام پر لوگوں کا کوئی مذہبی اثر قائم ہوسکتا ہے''[1]

شبلی کا اسلوب بیان

جب ہم شبلی کے ادبی شعور کا تجزیہ کرتے ہیں تو ہم مولانا فاروق چریا کوٹی کے اثر کو نظر انداز نہیں کرسکتے۔ ان میں شعر وادب کا صحیح مزاق پیدا کرنے اور ان کے علمی ذوق اور ادبی جوہروں کو نکھارنے کی پہلی کوشش فاروق چریا کوٹی کے مکتب سے شروع ہوتی ہے۔ فاروق چریا کوٹی کی صحبت سے شبلی نے جو فیض اٹھایا تھا اور ان کے ذہن نے جو ارتسامات قبول کئے تھے ان کا انھوں نے اپنے ایک مضمون ''ایک اور آفتاب علم غروب ہوگیا'' میں کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔

شبلی کی شاعری اور ان کے مضامین اور ان کے اسلوب بیان میں بھی وہی رس اور رنگینی موجود ہے جو استاد کی متنوع طبیعت کا جوہر تھی۔ شبلی کی انشاء پردازی کی یہ حیثیت ان کی دوسری حیثیتوں پر غالب رہی ہے۔

شبلی کا طرز تحریر رنگین، پرکیف اور شگفتہ ضرور ہے لیکن جو لوگ بے مہار تخیل کی کارفرمائیوں، تشبیہات کی بھول بھلیوں اور لفظی صنعت گری میں رنگینی اور انشاء پردازی کا معیار ڈھونڈتے ہیں، انھیں یقیناً شبلی کے مضامین سے ناامیدی ہوگی۔ شبلی کا انداز پختہ کارانہ اور عالمانہ ہونے کے باوجود دلکش اور سادہ ہے۔ ان کے

---

[1] مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم صفحہ ۲۱

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

پاس الفاظ اور خیال دونوں سادہ ہوتے ہوئے بھی پر اثر اور معنی آفریں ہوتے ہیں اور یہی سادگی و پرکاری شبلی کے مضامین کی ایک اہم خصوصیت نظر آتی ہے۔ سلیس جملوں کی ترتیب سے عبارت میں ترنم پیدا کرنے کے فن سے وہ پوری طرح واقف معلوم ہوتے ہیں۔ الفاظ کی جھنکار اور ان کے صوتی تاثر پر بھی شبلی کی نظر رہتی ہے۔ شبلی کی تحریر بظاہر سادہ معلوم ہوتی ہے لیکن اس میں ایک خاص قسم کی لے اور نکھار ہوتا ہے اور ایک مخصوص طرح کا لطف ہوتا ہے۔

مذہبی اور تاریخی مضامین میں شبلی کا انداز تحریر اس سے مختلف ہوتا ہے۔ جن مضامین میں انھوں نے یورپین مورخین کے اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ ان کے اسلوب میں اپنے موضوع کی مناسبت سے زور، گرمی اور جوش ہوتا ہے۔ شبلی کو اسلام کے قدیم تمدن اور اپنے اسلاف سے بہت زیادہ محبت تھی۔ مخالفین کی غیر اہم اور معمولی تنقیدیں بھی ان کے جذبات کو مشتعل کر دینے اور ان کی مناظرے کی صلاحیتوں کو روبہ کار لانے کے لیے کافی ہوتی تھیں۔ اس کیوجہ یہ ہے کہ وہ بڑے حساس تھے اور بعض اوقات ذرا سی بات بھی ان کے جذبات اور خیالات میں ہلچل پیدا کر دیتی اور ان کے احساس میں تموج پیدا ہو جاتا۔ حبیب الرحمٰن خاں شیروانی نے شبلی کی زود حسی کا ایک واقعہ اس طرح بیان کیا ہے:-

> ''احساس بہت شدید تھا اس لیے رنج والم سے بہت زیادہ متاثر ہوتے تھے۔ ۱۹۰۲ء میں کانفرنس کے اجلاس کے زمانے میں وہ اور میں ایک مکان میں مقیم تھے۔ ایک روز ایک نیم مردہ بھڑ نے ان کے پاؤں پر ڈنک مار دیا۔ اس قدر بیتاب ہوئے کہ مجھے حیرت ہوگئی..... یہ احساس شاعری کا لوازمہ تھا''[1]

شبلی کے تاریخی مضامین میں جو عام طور پر مناظرے کے رنگ میں ہیں، اسی ''شدت احساس'' کا پتا چلتا ہے۔

شبلی کا طرز تحریر اپنی شگفتگی کے باوجود ایک خاص رکھ رکھاؤ کا حاصل ہے۔ ان کی نثر سے بڑی سنجیدگی اور وقار جھلکتا ہے۔ شبلی کے مضامین کا بغور مطالعہ کریں تو بار بار اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ انھیں اپنی عظمت اور علمیت کا شدید احساس ہے۔ تاثرات کو قاری کے ذہن تک پہنچانے کا انداز، شبلی کا لب ولہجہ اور اپنی معلومات پر حد سے زیادہ اعتماد اس بات کا بین ثبوت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شبلی کا مطالعہ ان کے ہم عصر نوجوانوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ وسیع اور گہرا تھا یہ احساس بھی شبلی کے پیرایہ بیان کی تشکیل میں ایک بنیادی عنصر کی حیثیت سے رونما ہوتا ہے۔

---

[1] اردو ادب کے معمار (شبلی) = ظفر احمد صدیقی صفحہ ۳۵

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

چھٹا باب

متفرقات ۱۹۶-۲۱۶

ا- سفرنامہ-تحقیقی اور تنقیدی جائزہ

ب- رسائل اور خطبات

ج- دیگر نثری تحریریں

Maulana Azad Library, Aligrh Muslim University

۱-سفرنامہ-تحقیقی اور تنقیدی جائزہ

مولانا شبلی نعمانی نے ۱۸۹۲ء میں روم ومصر وشام کا سفر کیا اور ''سفرنامہ روم ومصر وشام'' کے نام سے ۱۸۹۴ء میں اس کو شائع کیا۔ ان کا یہ سفرنامہ ان کی تحقیقی تصانیف میں شمار نہیں ہوتا ہے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ مختلف معاشرتی اور سیاسی مسائل وامور کے بارے شبلی کا نقطہ نظر کیا ہے اس کو سمجھنے میں مدد حاصل ہوتی ہے۔ مثلاً اسلامی ممالک کے اتحاد کی خواہش، ترکوں سے مولانا کی عقیدت اور محبت، قدیم وجدید کی آمیزش اور آویزش، عورتوں کی معاشرت اور تعلیم وغیرہ سے متعلق ان کے نظریات وخیالات کی تفصیل سفرنامہ سے مل جاتی ہے۔

علامہ شبلی کی زندگی بڑی متحرک رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے حال ومستقبل اور تاریخ پر یکساں نظر رکھتے ہیں۔ علامہ شبلی ان علماء میں سے نہیں ہیں جو ماضی کے تاریخی اوراق سے مسلمانوں کی تاریخ مرتب کر کے اس پر اکتفا کرتے ہیں اور اپنی کاوشوں پر ملنے والی داد وتحسین سے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ علامہ شبلی کا عقیدہ تھا کہ ماضی اور حال کو جدا کر دیا جائے تو ''پدرم سلطان بود'' کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ اسی طرح حال کی تعمیر میں ماضی کی مدد نہ لی جائے تو یہ ایک ناپائیدار اور غیر مربوط کوشش رہے گی۔ شبلی کا نقطۂ نظر یہی تھا اور اسی نقطۂ نظر سے وہ مسلمانوں کے موجودہ مسائل پر نظر رکھتے تھے، ۱۸۹۲ء میں شبلی نے ترکی، شام، فلسطین اور مصر کا سفر کیا۔ کیونکہ ہندوستان اور ان علاقوں کے بیچ میں بڑا سمندر پڑتا تھا اور اس وقت ہندوستان پر پوری طرح سے انگریزوں کی حکومت قائم تھی۔ اس وجہ سے عالم اسلام کی خبریں صحیح طور پر مسلمانوں تک نہیں پہنچ پاتی تھیں اور یہاں کے لوگوں کی ان ممالک کے بارے میں جو رائے ہوتی تھی وہ بہت زیادہ وزن نہیں رکھتی تھی۔ دوسری طرف صورت حال کچھ اس طرح تھی کہ ہندوستان کے علماء وفضلاء اسلامی موضوعات پر جو تحقیق کر رہے تھے۔ اس کے زیادہ مآخذ اور مراجع عربی زبان میں تھے اور اسلامی وعربی علوم کی بیشتر نایاب ونادر تصانیف عرب ممالک کے کتب خانوں میں محفوظ تھیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

ہندوستان کے ہر اسکالر کا دھیان انھیں ملکوں میں لگا رہتا تھا۔ اور ان ممالک سے تعلق کی یہ حد تھی کہ وہ ان ممالک کی ہر چیز کو بہت ہی عقیدت اور محبت سے دیکھتے تھے۔ اور اگر غیروں کے منھ سے کوئی ایسی بات سن لیتے تو بیچین ہو اٹھتے تھے۔

علامہ شبلی نے جب ان ممالک میں جا کر دیکھا اور بغور مطالعہ کیا تو انھیں احساس ہوا کہ یورپ جو سماجی اور سیاسی اعتبار سے دنیا کی راہنمائی کا دعویٰ کر رہا ہے۔ اس کے علماء اس دور میں بھی مسلمانوں کے ماضی کی تاریخ مسخ کرنے کے ساتھ ساتھ، وہاں کے موجودہ حالات کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے جانبداری سے کام لیتے ہیں۔ ان کی تحریروں کو دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں اسلامی ممالک کی کوئی خوبی گوارا نہیں ہے۔ اس لیے وہ وہاں کے حالات اس انداز میں بیان کرتے ہیں کہ ان ممالک کی طرف سے لوگوں کی نظریں پھر جائیں۔ ان کے دلوں میں ان کی محبت اور عزت باقی نہ رہے۔ علامہ نے سفرنامہ کے مقدمہ میں لکھا ہے:-

> ''یورپ نے کسی زمانے میں مسلمانوں کے خلاف جو خیالات قائم کر لیے تھے، ایک مدت تک وہ علانیہ اس طریقہ سے ظاہر کیے جاتے تھے کہ مذہبی تعصب کا رنگ غالب نظر آتا تھا اور اس وقت قبول عام کا یہی بڑا عمدہ ذریعہ تھا، لیکن جب یورپ میں مذہب کا زور گھٹ گیا اور مذہبی ترانے بالکل بے اثر ہو گئے تو اس پالیسی نے دوسرا پہلو بدلا۔ اب یہ طریقہ چنداں محفوظ نہیں سمجھا جاتا تھا کہ مسلمانوں کی نسبت صاف صاف متعصبانہ الفاظ لکھے جائیں بلکہ ان کا یہ طریقہ دانشمندانہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ اسلامی حکومتوں، اسلامی قوموں اور اسلامی معاشرے کے عیوب تاریخی پیرائے میں ظاہر کیے جاتے ہیں اور عام تصنیفات، قصوں، ناولوں، ضرب المثلوں کے ذریعہ سے وہ لٹریچر میں اس طرح جذب ہو جاتے ہیں کہ تحلیل کیمیاوی سے بھی جدا نہیں ہو سکتے۔''[1]

علامہ شبلی نعمانی نے قدیم تاریخ کی روشنی میں بھی ان ممالک کا مطالعہ کیا اور جدید دور کے تصنیف نگاروں، خصوصاً یورپ کے مصنفین جو کچھ لکھ رہے تھے ان پر ان کی گہری نظر تھی۔ شبلی نے جب ان ممالک کا سفر کیا تو بغور ان کا معاینہ اور مشاہدہ کیا تو بہت سی چیزیں دیکھنے کے بعد ان کے اندر خود اعتمادی اور خوشی کا

---

[1] سفرنامہ روم و مصر و شام، مولانا شبلی نعمانی صفحہ ۳ مکتبہ المعارف اعظم گڑھ ۱۹۴۰ء

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

جذبہ پیدا ہوا اور کچھ چیزیں ان کی طبیعت، ماحول یا احوال فطرت کے مخالف ہونے کی بنا پر ان پر ناامیدی بھی طاری ہوئی اور ان کی آنکھیں بھی اشکبار ہوئیں۔ علامہ شبلی کے ذہن میں دولت عباسیہ کی جو تصویر تھی وہ یہ تھی کہ دولتِ عثمانیہ ایک مضبوط سلطنت ہے، اس کا رقبہ بہت زیادہ پھیلا ہوا ہے اور اس سرزمین سے علم وعرفان کے اعتبار سے سب نے فائدہ اٹھایا ہے اور اپنی اعلیٰ علمی اور سیاسی تاریخ کی بھی بنیاد بنایا۔ اپنی کاوش ومحنت سے انیسویں صدی کے اختتام تک عرفان وعلم کی اعلیٰ منازل طے کیں اور ان علم وعرفان کی شعائیں ساری دنیا میں پھیل گئیں۔ دنیا کا ہر علاقہ اس سے متاثر ہو رہا تھا اور فائدہ اٹھا رہا تھا، اس حقیقت سے منہ موڑنا حقیقت کو جھٹلانے کے مترادف تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اپنی قوم وملک کے لیے ترقی کی راہیں تلاش کی جائیں اور جو اصول مرتب کیے جائیں۔ ان سے پوری طرح فائدہ اٹھایا جائے۔ یورپ کی ترقی کو اگر ہم دیکھیں تو ان کے جاننے کے بعد ہی دنیا کی ہر قوم میں زندگی کا احساس پیدا ہوا، اپنے ملک اور قوم کی بدحالیاں اور خامیاں نظر آنے لگیں۔

ترکوں سے علامہ شبلی نعمانی کو غیر معمولی عقیدت اور محبت تھی۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ وہ ترکی زبان سیکھیں، جس سے کہ وہ ترکوں کی علمی کاوشوں اور تاریخ سے بلا واسطہ استفادہ کر سکیں، لیکن ہندوستان میں انھیں یہ موقع نہیں مل پایا، لیکن ترکی سیکھنے کی خواہش ان کے دل میں باقی رہی۔ شبلی جب قسطنطنیہ پہنچے تو ان کے جذبے نے پھر زور پکڑا۔ قسطنطنیہ کو دیکھنے کے بعد انھیں بہت زیادہ خوشی اور مسرت کا احساس ہوا۔ اس طرح کے جذبات اور خیالات کو الفاظ میں نہیں ادا کیا جا سکتا ہے۔ بھلے ہی زبان پر کتنی ہی قدرت ہو۔ اس شہر کو دیکھنے کے بعد شبلی کے ذہن میں ترکوں کا شاندار ماضی جو ان کی شاندار فتوحات سے عبارت تھا، سامنے آ گیا۔ قسطنطنیہ کے لفظ کے ساتھ دنیا کے مسلمان کے ذہن میں اس شہر کی عظمت اور ہیبت نگاہوں کے سامنے آ گئی۔ قدیم زمانے سے لے کر آج تک اس میں کون سے آثارِ قدیمہ ہیں اور کس طرح کی معاشرت ہے۔ سفرنامہ کے مطالعہ سے یہ سب تفصیلات واضح طور پر ہمارے سامنے آ جاتی ہیں۔

یہ تو شبلی کا اس کے ماضی کے بارے میں اظہارِ خیال ہے لیکن اس وقت کے ترکوں کی تصویر شبلی نے ان الفاظ میں کھینچی ہے:-

''ترکی کے سفر سے جو اثر میرے دل پر ہوا اس کا یہاں ظاہر کرنا چنداں ضروری نہیں۔

اس سفرنامہ کو پڑھنے سے خود اس کا پتہ لگ سکتا ہے، البتہ اس قدر کہنا ضرور ہے کہ سلطنت

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

کی حیثیت سے اگر قطع نظر کیا جائے تو مسلمانوں کی حالت وہاں بھی کچھ زیادہ مسرت اور اطمینان کے قابل نہیں ہے، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ بہت سی باتوں میں ہندوستان کے مسلمانوں سے قریب قریب ہے، صنعت سے ان کو کچھ واسطہ نہیں، تجارت میں ان کا حصہ بہت کم ہے، معمولی دوکاندار تک یہودی اور عیسائی ہیں، پرانی تعلیم نہایت ابتر ہے اور ہوتی جاتی ہے۔ نئی تعلیم کے متعلق جو شکایت یہاں ہے وہاں بھی ہے۔ پرانی تہذیب اور نئی تہذیب میں ابھی تک رقابت ہے اور دونوں سے مل کر کوئی مرکب مزاج پیدا نہیں ہوا ہے۔ پرانے خیال والے ابھی تک زمانہ کی رفتار سے بے خبر ہیں۔ نئے مذاق کے لوگ جس قدر کہتے ہیں کرتے نہیں ہیں۔ ہمت، غیرت، جوش، عزم اور استقلال کے بجائے کل قوم پر (من حیث الاغلب) افسردگی چھائی ہوئی ہے، جو شخص جس حال میں ہے اس پر قانع ہے۔ موجودہ حالت تو یہ ہے۔ ولعل اللہ یحدث بعد ذلک اُمراً۔

یہ شہر دو حصّوں میں بٹا ہوتھا۔ ایک استانبول کے نام سے مشہور ہے اور دوسرا غلطہ کے نام سے۔ استانبول میں تمام قدیم یادگاریں ہیں، لیکن وہاں کے نظم میں غیر معمولی ابتری ہے۔ سڑکوں پر نجاست اور گندگی کا انبار ہر جگہ نظر آتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں دوسری طرف جو شہر ہے وہ غلطہ کہلاتا ہے۔ اس کی ہر چیز استنبول سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں کے بازار صاف ستھرے، سڑکیں وسیع، دکانیں خوبصورت اور آراستہ۔ سڑکوں پر کہیں گندگی اور نجاست کا نام ونشان نہیں۔''[1]

علاّمہ شبلی نے ترکی کی تعلیمی صورت حال کا بھی جائزہ لیا ہے۔ ترکی میں دو طریقۂ تعلیم رائج تھے۔ ایک جدید دوسرا قدیم۔ جدید طریقۂ تعلیم، مغربی ملکوں کے طریقۂ تعلیم سے متاثر تھا۔ تعلیم کے تین مراحل تھے۔ ابتدائیہ، ثانویہ اور عالیہ۔ تینوں مراحل میں تعلیم کا وہی طریقہ تھا جو دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں میں رائج ہے۔ طریقۂ تعلیم کے ظاہری ڈھانچے گرچہ یکساں ہوتے ہیں لیکن حکومتوں کی توجہ اور عدم توجہ سے معیار مختلف ہوجاتے ہیں۔ علاّمہ شبلی نے جدید تعلیمی اداروں کا جائزہ لیا۔ ان اداروں کی سرپرستی زیادہ تر حکومتیں کیا کرتی تھیں۔ وہاں شبلی نے بورڈنگ کا جو نظام دیکھا اس سے وہ کسی حد تک مطمئن تھے۔ سوشل سائنس، ٹکنالوجی اور

---

[1] سفرنامہ روم ومصر وشام۔ مولانا شبلی، مکتبہ المعارف، اعظم گڑھ ۱۹۴۰ء، صفحہ ۸

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

ڈیفنس کے جدید کالجوں کا بھی انھوں نے مشاہدہ کیا اور ان پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ لیکن ظاہر ہے ان اداروں کی صحیح صورت حال اور ان کا معیارِ تعلیم اسی وقت واضح ہوسکتا تھا جب ان کا مقابلہ وموازنہ ان ملکوں سے کیا جاتا جہاں تک یہ کالجز صدیوں سے جاری ہیں۔ بہر حال شبلی کی تحریروں سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ترکی حکومت اور وہاں کی عوام نے جدید طریقۂ تعلیم کو خوشی خوشی تسلیم کرالیا تھا اور اس کے خلاف مزاحمت یا مخالفت کی کوئی آواز موجود نہیں تھی۔ شبلی نے حکومت اور عوام کے اس طرزِ عمل کو سراہا ہے۔ لیکن انھوں نے ایک خاص پہلو کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اس سے ترکی قوم کے تعلیم کے تعلق سے نقطۂ نظر اور ذہنیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ علاّمہ کا خیال ہے کہ تعلیم خواہ جدید ہو یا قدیم جب تک اس کی اہمیت عوام کے رگ وپے میں رواں دواں نہ ہو جائے قومی سطح پر کوئی بہت بڑی تبدیلی رونما نہیں ہوسکتی ہے۔ تعلیم کے ذریعہ قومی شعور واحساس کا بیدار ہونا بہت ضروری ہے۔

جدید تعلیمی اداروں کا تذکرہ کرنے کے بعد علاّمہ شبلی نے قدیم تعلیمی اداروں کا بھی تذکرہ کیا ہے، لیکن جہاں شبلی نے قدیم اداروں کا ذکر کیا ہے، ان پر مایوسی کی کیفیت چھا جاتی ہے اور شبلی یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ یہ ادارے جو صدیوں عوام اور حکومت کے لیے باعثِ فخر وزینت تھے جہاں ہزاروں ادباء، سیاستداں، منتظمین اور ماہر قانون پیدا ہوئے، آج وہ بے جان اور بے مقصد ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:-

''موجودہ تعلیمی پستی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ اس کے مقابلہ میں ہمارے ہندوستان کی تعلیم غنیمت ہے۔ اس سفر میں جس چیز کا تصور میری مسرتوں اور خوشیوں کو برباد کر دیتا تھا وہ اسی قدیم تعلیم کی ابتری تھی۔ یہ مسئلہ آج کل ہندوستان میں بھی چھڑا ہوا ہے اور قدیم تعلیم کی ابتری پر عموماً رنج وافسوس کیا جاتا ہے۔ لیکن میرا افسوس دوسری قسم کا تھا۔ ہمارے ملک کے نئے تعلیم یافتہ پرانی تعلیم پر جو رنج وافسوس ظاہر کرتے ہیں وہ درحقیقت رنج نہیں بلکہ اشتہزاء اور شماتت ہے۔ میں گرچہ نئی تعلیم کو پسند کرتا ہوں اور دل سے پسند کرتا ہوں تاہم پرانی تعلیم کا سخت حامی ہوں اور میرا خیال ہے کہ مسلمانوں کی قومیت قائم رہنے کے لیے پرانی تعلیم ضروری اور سخت ضروری ہے۔ اس کے ساتھ جب یہ دیکھتا ہوں کہ تعلیم جس طریقہ سے جاری ہے وہ بالکل بے سود اور بے معنٰی ہے تو خواہ مخواہ نہایت رنج ہوتا ہے۔ ہندوستان میں تو اس خیال سے صبر آجاتا ہے کہ جو چیز گورنمنٹ کے سایۂ

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

عاطفت میں نہ ہو اس کی بے سروسامانی قدرتی ہے، لیکن قسطنطنیہ، شام، مصر میں یہ حالت دیکھ کر سخت رنج ہوتا ہے''۔

ظاہر ہے جن مدرسوں کی یہ حالت ہو تو ان میں تعلیم پانے والے بچوں کی کیا حالت ہوگی۔ ان کے ذہن کی کیا تربیت ہو پائیگی اور زندگی کی امنگ اور حوصلے کہاں سے پیدا ہوں گے۔ جن کے سہارے وہ ملک وقوم کی خدمت کر سکیں۔ یہاں ایک اور بات قابل غور ہے کہ آزاد مسلم ممالک میں ایک زمانے تک جو نصاب تعلیم رائج تھا وہ عوام اور حکومت کی ضرورتوں کو پورا کرتا تھا، لیکن آج ایسا نہیں ہے۔ وقت کی ضرورت اور زمانے کی رفتار کے مطابق انسانی ضروریات بھی بدلتی رہتی ہیں اور اسی لحاظ سے زندگی کے ہر شعبہ میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے اور یہی تبدیلی درحقیقت قوموں کی روح ہوتی ہے۔

شبلی تقریباً تین مہینے ترکی میں رہے اور وہاں انھوں نے ایک مربوط پروگرام کے تحت حالات کا جائزہ لیا اور جو بھی چیزیں دیکھ سکتے تھے ان کو دیکھا اور جن لوگوں سے مل سکتے تھے وہ ملے۔ انھوں نے سفر نامہ میں جا بجا اس کا ذکر کیا ہے، ترکوں کے اندر انھوں نے جو خامیاں خرابیاں دیکھیں ان کی طرف بار بار اشارے کیے ہیں، لیکن جو چیزیں انھیں پسند آئیں ان کی طرف بھی اشارے کیے ہیں اور دل کھول کر داد دی ہے۔ قسطنطنیہ کے دوران قیام وہاں مختلف طرح کے لوگوں سے ملے۔ ان کے اخلاق وعادات اور طرزِ معاشرت سے متاثر ہوئے۔

علامہ شبلی نعمانی ان علماء میں تھے جو مردوں کی تعلیم وتدریس کے ساتھ ساتھ عورتوں کی تعلیم کے بھی خواہاں تھے، کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ دنیا میں کوئی صالح سماج اس وقت تک وجود میں نہیں آسکتا جب تک سماج کا ہر فرد علم ومعرفت کے زیور سے آراستہ نہ ہو۔ تعلیم سے جہاں انسان کی ظاہری شکلیں بدلتی ہیں، اس کا اثر اس کی معنوی زندگی پر بھی پڑتا ہے اور جس کی وجہ سے اچھے اخلاق وکردار ہمارے سامنے آتے ہیں اور سماج کا ہر فرد ایک دوسرے کو محبت وعزت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ ترکی میں بچوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ بچیوں کی تعلیم کا بھی اچھا انتظام ہے۔ چنانچہ جب انھوں نے بچیوں کے تعلیمی اداروں کو دیکھا، ان کے رہن سہن کو دیکھا اور ان کی وضع قطع پر نظر ڈالی تو اس سے شبلی کو بہت خوشی ہوئی۔ ترکی عورتوں کے وضع قطع سے علامہ شبلی پوری طرح مطمئن تھے۔ شبلی لکھتے ہیں:-

---

''ایک دفعہ میں عاشر آفندی کے کتب خانے میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک ترک صاحب بھی

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

تشریف رکھتے تھے، جن سے میری جان پہچان ہوگئی تھی۔ اتفاق سے وہیں ان کی دونو جوان لڑکیاں جن میں سے ایک کی شادی ہوچکی تھی، ان سے ملنے کے لیے آئیں۔ انھوں نے مجھ سے دونوں کو انٹروڈوس کرایا، جس احترام اور متانت وشرم سے وہ معصوم خاتونیں میرے سامنے کھڑی تھیں۔ مجھ کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ عورتیں نہیں بلکہ عفت وعصمت کی دیبیاں ہیں''[1]

قسطنطنیہ سے شبلی بیروت گئے۔ بیروت لبنان کی کیپٹل ہے جہاں مسلمانوں، عیسائیوں اور دروز کی مشترکہ آبادی ہے۔ لبنان فرانسیسی استعمار سے پہلے شام کا ایک حصہ تھا اور ۱۵۱۷ء میں ترکی کے حکمراں سلطان سلیم نے اس کو فتح کیا تھا۔ اس کے بعد بیسویں صدی کی دوسری دہائی تک یہ علاقہ دولت عثمانیہ کے ماتحت تھا ترکوں سے جب یہ علاقہ آزاد ہوا تو فرانس کے قبضہ میں آیا۔ اس علاقہ کی تقسیم مذہب کی بنیاد پر ہوئی، کیونکہ اس علاقہ میں مسلمانوں، عیسائی اور دروز آباد تھے۔ دروز کو عیسائیوں کے ساتھ شامل کر کے مسلمانوں کی اقلیت ثابت کی گئی اور ایک الگ ریاست وجود میں آئی۔ یہ تو سیاسی صورتِ حال تھی، لیکن جہاں تک عوام کا تعلق ہے وہ انتہائی میل محبت سے رہتے تھے اور عربی زبان وادب کی خدمت میں سب ہی نے بقدر استطاعت حصہ لیا۔ اسے یقیناً دور حاضر کا سنہرا باب کہیں گے۔ لبنان شام کا ایک ساحلی علاقہ تھا۔ یوروپ صدیوں سے اس علاقہ پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ لہٰذا اٹھارہویں صدی سے یورپ کی سرپرستی میں یہاں شہروں اور قصبات میں اسکول قائم ہونا شروع ہوگئے اور اس کے بعد بیروت شہر میں اعلیٰ درجے کے کالج اور یونیورسٹیاں قائم ہوئیں، جس کا نظم ونسق زیادہ تر یورپین ممالک کے علماء کی نگرانی میں قائم تھا، چونکہ ان اداروں کے قیام کے ذریعہ مغربی قوموں کا مقصد متعلقہ علاقوں پر اپنا اثر ورسوخ جمانا تھا۔ اس لیے انھوں نے تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنے مذہب، ثقافت اور تہذیب کو بھی اشاعت اور ترویج کی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کی کوششوں سے یہ پورا علاقہ جدید تعلیم وثقافت کا مرکز بن گیا۔ اس کے مقابلہ میں وہ علاقہ جو ترکوں کے ماتحت تھے اور جن کی تعلیم وثقافت کا انحصار مسلم عوام اور ترک حکومت کی توجہات پر تھا وہاں کی صورتحال بہت زیادہ لائقِ اطمینان نہیں تھی، چنانچہ علامہ شبلی جب قسطنطنیہ سے یہاں پہنچے تو اس علاقہ کی علمی برتری نمایاں طور پر ان کے سامنے آئی۔

---

[1] سفرنامہ روم ومصر وشام، مولانا شبلی نعمانی صفحہ ۳ مکتبہ المعارف اعظم گڑھ ۱۹۴۰ء، صفحہ ۱۳۲

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

اس علاقہ میں پیدا ہونے والے حالات وکوائف اور یہاں کے لوگوں کے انجام کا شبلی نے بخوبی اندازہ لگایا تھا، لیکن کسی مصلحت کے تحت وضاحت کے ساتھ اس کا اظہار نہیں کیا۔ علامہ شبلی نے فلسطین میں بیت المقدس میں عرصہ تک قیام کیا اور وہاں کی اس وقت کی صورتحال کا مشاہدہ کیا اور جائزہ لیا اور اس کو قلمبند بھی کیا۔ مسجد اقصیٰ اور بیت المقدس کے بارے میں ان کی تحریریں بہت قیمتی اور معلوماتی ہیں۔ شبلی کا زیادہ تر سفر سمندر کا تھا۔ اس کی وجہ چاہے وقت کی قلت رہی ہو یا وسائل کی کمی رہی ہو۔ انھیں شام اور اس کے آس پاس کے علاقوں کو دیکھنے کا موقع نہیں مل پایا۔ خصوصاً حلب اور دمشق۔ قدیم زمانے سے لے کر آج تک ان دونوں شہروں کی تاریخی بہت اہمیت رکھتی ہے۔ خاص طور سے دمشق کی جو خلفاءِ راشدین کے بعد اسلامی مملکت کا دارالخلافہ بنا۔ اس میں بنوامیہ کے عہد کے تعمیر کردہ بہت سے ایسے تاریخی مقامات ہیں جو دیکھنے کے لائق ہیں۔ اس کے ساتھ یہاں جو قدیم علمی مراکز رہے ہیں ان کی بھی تاریخی اہمیت ہے۔ دمشق کا کتب خانہ مکتبہ ظاہریہ اپنے علمی نوادارت کی وجہ سے دنیا کے اہم کتب خانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ شبلی انھیں بھی نہیں دیکھ پائے۔

شام اور فلسطین کے بعد علامہ نے مصر کا رخ کیا، جو دنیائے اسلام کا سب سے بڑا علمی مرکز شمار کیا جاتا ہے۔ وہ یافہ سے اسکندریہ پہنچے۔ اسکندریہ سے وہ قاہرہ کے لیے روانہ ہوئے۔ ان کے دل میں قاہرہ دیکھنے کا شوق بہت پہلے سے تھا۔ یہاں کے ذخیروں سے ان کی زندگی وابستہ تھی اور مستقبل کے لیے انھوں نے جو تصنیفی خاکے بنائے تھے ان کی تکمیل اس شہر کے ذخیروں سے ہوسکتی تھی۔ اس طرح مولانا کے دل میں یہ شوق پیدا ہورہا تھا کہ جلد از جلد اس شہر تک پہنچ جائیں۔ اسکندریہ سے قاہرہ مولانا نے ٹرین کے ذریعہ سفر کیا اور راستہ میں ریلوے لائن کے کنارے جو بستیاں اور کھیت تھے ان پر وہ مسلسل نظر جمائے ہوئے تھے وہ لکھتے ہیں:-

> ''اس سفر میں جس قدر حصہ مصر کا میری نظر سے گزرا عجیب، سرسبز وشاداب تھا۔ جہاں تک نگاہ جاتی تھی نہایت سرسبز کھیتیاں نظر آتی تھیں۔ اسکندریہ سے قاہرہ تک جس قسم کی عمدہ پیداوار نظر آئی میں نے ہندوستان میں پچاس ایکٹر زمین میں بھی ایسی نہیں دیکھی۔ ریل شام کے قریب قاہرہ میں پہنچی اور میں نے جامع ازہر کے قریب ایک لوکاندہ (ہوٹل) میں قیام کیا۔''[1]

---

[1] سفرنامہ روم ومصر وشام، مولانا شبلی نعمانی صفحہ ۳ مکتبہ المعارف اعظم گڑھ ۱۹۴۰ء، صفحہ ۱۷۹

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

اس کے بعد شبلی نے قاہرہ کے تاریخی پس منظر اور زمانہ کے اس شہر پر پڑنے والے اثرات کا ذکر کیا ہے، لیکن مولانا نے جس چیز پر سب سے زیادہ توجہ دی ہے وہ یہاں کی تعلیمی حالت ہے۔ وہاں کے سب سے اہم کالج ''دارالعلوم'' جو جدید وقدیم کا سنگم ہے، اس کا تذکرہ کیا ہے۔

دارالعلوم مصر کا ہی نہیں بلکہ تمام بلاد عربیہ کا سب سے بڑا ادبی اور دینی تعلیم کا مرکز رہا ہے۔ اس میں وہ علوم بھی شامل نصاب تھے جو دینی اور ادبی علوم کی تکمیل کے لیے معاون اور مددگار تھے۔ ان میں انسانی علوم (سوشل سائنسز) کی اہمیت سب سے زیادہ تھی، چنانچہ ان علوم کی طرف بھی کالج نے توجہ دی۔ سوشل سائنسز کو داخل نصاب کرنے کے پیچھے یہ فکر ہمیشہ کارفرما رہی ہے کہ جب تک کسی ادیب، معلم یا مبلغ کی نظر جدید انسانی علوم پر نہ ہو، وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ تاہم یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ جدید زمانہ میں کسی انسان کی ترقی صرف آرٹس اور سوشل سائنسز کی تعلیم سے ممکن نہیں ہے۔ یقیناً ان علوم کے ذریعہ نوجوانوں کی ذہن سازی کا کام ہوسکتا ہے، لیکن حقیقی خوشیوں کا حصول اس وقت تک ممکن نہیں جب تک سائنس، میڈیسین، ٹکنالوجی اور غیرہ ملکی زبانوں کی تعلیم کا اچھا انتظام نہ ہو۔

اتفاق سے جس زمانے میں شبلی مصر پہنچے اس وقت وہاں قانون SCHOOL OF LAW دنیا کی تمام زبانوں کو پڑھانے کا ادارہ SCHOOL OF LANGUAGES مدرسۃ الطب SCHOOL OF MEDICINE مدرسۃ الصنائع SCHOOL OF TECHNOLOGIES یہ سب ادارے قائم ہو چکے تھے۔ مولانا شبلی نے جب ان اداروں اور ان کے نہج تعلیم کو دیکھا تو اس سے بہت متاثر اور مطمئن ہوئے۔ یہ جدید علوم کے ادارے خالصۃً مغربی طریقہ سے قائم ہوئے تھے اور ان میں پڑھانے کا وہی انداز وطریقہ تھا جو یورپ میں تھا۔ اس لیے سائنس وٹکنالوجی وطب کی تعلیم کے فروغ کے لیے غیر ملکی اساتذہ سے مدد لی جارہی تھی۔ خاص طور سے مدرسۃ الطب MEDICAL COLLEGE میں بیشتر اساتذہ انگریز یا فرانسیسی تھے۔ علامہ شبلی نے جب میڈیکل کالج میں جدید طرزِ تعلیم کو دیکھا تو ہندوستان میں مروّجہ قدیم یونانی طبی درسگاہوں کے طریقۂ تدریس سے سخت مایوسی ہوئی، کیونکہ شبلی یہ سوچتے تھے کہ علم چاہے جیسا بھی ہو، اسے حالات کے مطابق آگے بڑھنا چاہیے۔ ورنہ وہ بے سود اور بے جان ہو جائیگا۔ ان اداروں پر اظہارِ خیال کے بعد شبلی نے تفصیل سے جامع ازہر پر تبصرہ کیا ہے۔ جامع ازہر دنیا کی قدیم ترین یونیورسٹیوں میں سے ایک ہے۔ اس کی ایک لمبی تاریخ ہے۔ ایک بڑی مسجد ہے جس میں دنیا کے مختلف علاقوں کے طلبہ تعلیم پاتے

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

ہیں۔شبلی نے لکھا ہے:-

''اوّل اوّل جب میں اس مسجد کی زیارت کے لیے گیا تو دور سے گونج کی آواز آئی۔ اندر داخل ہوا تو ہر طرف طالب علم ہی طالب علم نظر آتے تھے۔ جا بجا مدرسین درس دے رہے تھے اور ایک ایک کے گرد تیس تیس چالیس چالیس کا مجمع تھا یہ حلقے تیس چالیس سے کم نہ تھے اور چونکہ پاس پاس تھے اس لیے اس قدر شور وغل تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ مجھ کو خیال ہوا کہ اس ہنگامہ میں جمعیت خاطر ایک طرف مدرسین کی آواز بھی طالب علم کے کان تک پہنچتی ہے یا نہیں؟

اس سے زیادہ افسوس تعلیم کی ابتری کا ہے۔ یہاں مستقل اور اصلی طور پر صرف فقہ ونحو کی تعلیم ہوتی ہے اور دونوں کے لئے آٹھ آٹھ برس مقرر ہیں منطق، فلسفہ، ریاضی اور دیگر علوم عقلیہ تو گویا درس میں داخل ہی نہیں اصول فقہ، تفسیر، حدیث، ادب، معانی، بیان کی تعلیم ہے لیکن اس قدر کم ہے کہ اتنے بڑے دارالعلم کے کسی طرح شایان شان نہیں۔ نحو وفقہ پر ایک عمر صرف کی جاتی ہے۔ان کی تعلیم بھی محققانہ اور مجتہدانہ نہیں ہوتی''۔[1]

علامہ شبلی نے جامع ازہر کی تعلیم و تدریس اور ترتیب و معاشرت کی جو تصویر کھینچی ہے، یہ تصویر تقریباً دنیا کے ان تمام تعلیمی اداروں کی ہے جہاں مسلمان بچے تعلیم پاتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ صدیوں سے مسلمانوں پر جمود وتعطل طاری ہے جس کی وجہ سے ان کی پوری سوسائٹی غربت وجہالت کی شکار ہے اور جو سوسائٹی غربت اور افلاس مین مبتلا ہو وہاں فکر وفن کے تمام سوتے خشک ہو جاتے ہیں۔اجتہاد کیا؟ اجتہاد کے نام ہی سے انھیں پریشانی ہوتی ہے اس طرح کی سوسائٹی میں دو طبقوں کو فائدہ ہوتا ہے۔ایک طبقہ علماء اور دوسرا حکمراں۔حکومت کو اس طرح کی پسماندہ اور بے جان سوسائٹی سے کبھی کوئی خطرہ نہیں ہوتا ہے وہ جو چاہتی ہے من مانی کرتی ہے۔اور سارے عوام کی نگاہیں ان کی طرف رہتی ہیں اور ان کے اشارے پر نقل وحرکت کرتے ہیں۔گویا غلامی کی ایسی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں جنھیں بظاہر ہم دیکھ نہیں سکتے ہیں، لیکن وہ زنجیریں ان کی جسم کی رگ وپے میں پڑی ہوتی ہیں جس کی وجہ سے ان کے سوچنے اور غور کرنے کی صلاحیت مفلوج ہو جاتی ہے اور وہ حکومت کے خلاف آواز اٹھانے کو گناہِ کبیرہ سمجھتے ہیں۔طبقۂ علماء کو اس طرح سوسائٹی

---

[1] سفرنامہ روم ومصر وشام-مولانا شبلی نعمانی، مکتبہ المعارف، اعظم گڑھ ۱۹۴۰ء صفحہ ۲۰۳-۲۰۴

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ وہ عوام کی فکری صلاحیتوں کے پامال ہونے کی وجہ سے اپنے اثر ورسوخ کو اس طرح بڑھاتے ہیں کہ لوگوں کے اندر یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ وہ علماء کی اطاعت اور فرمانبرداری میں ان کی دنیا وآخرت کا راز مضمر ہے۔ اس لیے پیشہ ور علماء بھی دل سے یہ نہیں چاہتے کہ تعلیمی درسگاہوں میں کوئی ایسی تبدیلی لائی جائے جس سے جمود وتعطل ختم ہو اور لوگوں کے اندر سوچنے اور غور کرنے کا مادہ پیدا ہو۔ اس لیے قدیم اداروں کی اصلاح کی جب بھی کوئی کوشش کسی زاویہ سے کی گئی تو اس کی شدت سے مخالفت کی گئی اور اسے ناکام کر دیا گیا۔ اس لیے قدیم تعلیمی درسگاہوں کی اصلاح ممکن نہیں ہو سکی، لیکن جب ان ملکوں میں سیاسی بیداری شروع ہوئی اور نئے طریقۂ تعلیم وجود میں آئے تو تعلیم وتربیت کے رہنماؤں نے قدیم درسگاہوں کو نظر انداز کر دیا اور جدید طرز کے ادارے قائم کئے۔ یہی صورت حال مصر میں ہوئی، چنانچہ مصر میں انیسویں صدی کے آخر تک نئے نئے تعلیمی ادارے قائم ہوئے اور بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں ترقی پسند علماء ومفکرین کی رہنمائی میں قاہرہ یونیورسٹی وجود میں آئی، جس میں جدید علوم کے تمام شعبے قائم ہوئے اور وہ دنیائے عرب بلکہ دنیائے اسلام کی سب سے بڑی پہلی یونیورسٹی وجود میں آئی اور اس کے طفیل میں بعد میں دوسرے عرب ملکوں میں اس نہج پر یونیورسٹیاں قائم ہوئیں۔

علامہ شبلی کا یہ سفر بہت دوررس نتائج کا حامل ثابت ہوا، چنانچہ اس سیاحت کے دوران انھوں نے یہ رائے قائم کی کہ مسلمانوں کو ایک ایسے نصابِ تعلیم کی ضرورت ہے جو علوم قدیمہ اور علوم جدیدہ دونوں پر مشتمل ہو، اس لیے کہ محض قدیم، زمانہ کی ضروریات کا ساتھ نہیں دے سکتا اور محض جدید طرزِ تعلیم، دین ومذہب سے بے گانہ بناتا ہے۔

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

ب-رسائل وخطبات

مولانا شبلی کی شخصیت اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ پرکشش اور دل آویز ہے۔اس کا سبب یہ ہے کہ وہ یک رخے اور یک فنے نہیں ہیں، بلکہ پہلودار اور ہمہ جہت ہیں۔ یہ وصف ان میں ابتداء ہی سے موجود تھا، اسی لئے انھوں نے استاد بھی ہر طرح کے منتخب کیے۔لہٰذا ان کے استادوں میں ایک طرف مولانا فاروق چریا کوٹی جیسے معقولی عالم ہیں، تو دوسری جانب مولانا ارشاد حسین رامپوری جیسے فقیہ ہیں اور تیسری سمت مولانا فیض الحسن سہارنپوری جیسے ادیب وشاعر ہیں ان علمائے کرام کے علاوہ انھوں نے پروفیسر آرنلڈ سے بھی اکتساب فیض کیا۔مشرقی زبانوں میں وہ عربی، فارسی اور اردو تینوں سے نہ صرف واقف تھے بلکہ تینوں میں صاحب ذوق وصاحب تصانیف تھے۔اس کے علاوہ مغربی زبانوں میں کسی قدر فرنچ سے واقف تھے۔

تنوع، رنگارنگی اور پہلوداری کی یہی کیفیت ان کے علمی وادبی کارناموں میں بھی پائی جاتی ہے۔ چنانچہ وہ ادیب وانشاء پرداز بھی ہیں اور شاعر وناقد بھی، متکلم ومعقولی بھے ہیں اور مورخ وسوانح نگار بھی۔ شاہان عجم کے مدح خواں بھی ہیں اور عظیم المرتبت سیرت نگار بھی، صاحب کتب وتصانیف بھی ہیں اور بلند پایہ مقالہ نگار بھی۔

ان کی شخصیت کا عکس نمایاں طور پر ان کے رسائل اور خطبات میں نظر آتا ہے جب ہم ان کے کارناموں کا الگ الگ جائزہ لیتے ہیں تو ہر جگہ ایک سے زیادہ ہی پہلو نظر آتے ہیں۔مثلاً ان کی انشاء پردازی نہ حالؔی کی طرح سادہ، سپاٹ اور خشک ہے، نہ محمد حسین آزاد کی طرح مرصع، رنگین اور پراز تشبیہات واستعارات، بلکہ دونوں کی ملی جلی کیفیت لیے ہوئے ہے۔اسی طرح بحیثیت شاعر وہ نظم گو بھی ہیں اور غزل گو بھی۔انھوں نے قصیدے بھی لکھے ہیں اور مثنویاں بھی، رباعیاں کہی ہیں اور مرثیے بھی، پھر سنجیدہ شاعری بھی کی ہے اور طنزیہ بھی۔فارسی میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور اردو میں بھی۔یہی حال ان کی تنقید نگاری کا بھی ہے ایک طرف انھوں نے حافظؔ، سعدؔی اور خسرو جیسے شاعروں کے کلام کو تنقید، تبصرے اور محاکے کا موضوع بنایا

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

ہے، تو دوسری طرف شاعروں میں انیس و دبیر کے کلام کا موازنہ و مقابلہ بھی کیا ہے۔

زندگی اور اس کے حقائق و مسائل کے بارے میں بھی وہ محض ایک رخ یا ایک زاویے پر سوچنے کے قائل نہ تھے بلکہ وہ مسئلے کے ہر پہلو کو سامنے رکھتے تھے۔ مثال کے طور پر ان کا خیال تھا کہ کوئی قوم محض ماضی پر تکیہ کر کے اور قدامت پسندی کے دائروں میں محصور ہو کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ ساتھ ہی وہ اس بات کے بھی قائل تھے کہ محض تجدد پسندی پر انحصار اور اپنی روایات سے یکسر انقطاع بھی باخبر اور بیدار مغز قوموں کا شیوہ شعار نہیں۔ اسی لیے وہ اپنی تحریر و تقریر میں ہر جگہ جدت و قدامت، روایت و بغاوت اور ماضی و حال کو آمیز کرنے کی دعوت دیتے نظر آتے ہیں۔

تعلیم کے بارے میں ان کا نظریہ علمائے قدیم اور دانش وران جدید دونوں سے مختلف تھا ان کا خیال تھا کہ علوم قدیمہ زمانے کی ضروریات کا ساتھ نہیں دے سکتے اور محض علوم جدیدہ، دین و مذہب سے بے گانہ بناتے ہیں۔ وہ عربی مدارس کے نصاب میں بھی تجدید اور اصلاح کو ضروری سمجھتے تھے۔ علماء کے لیے انگریزی زبان کی تعلیم کو لازمی اور ہندی و سنسکرت سے واقفیت کو مفید تصور کرتے تھے۔ اسی طرح مذہبی و اخلاقی تعلیمات کے بغیر علوم جدیدہ کے نصاب کو غیر مفید اور نامکمل قرار دیتے تھے۔

عورتوں کے بارے میں ان کے خیالات دلچسپ اور فکر انگیز ہیں ان کا خیال تھا کہ عورتوں کو گھر کی چہار دیواری میں محدود اور مقید کر دینا یا جاہل محض بنائے رکھنا نامناسب ہے وہ چاہتے تھے کہ مردوں کی طرح وہ بھی حالات زمانہ سے باخبر تعلیم یافتہ، مہذب و شائستہ اور تحریر و تقریر کی صلاحیتوں سے بہرور ہوں لہٰذا انھیں شیوۂ آرایش جمال کو ترک کرنا اور فلسفۂ حرکت و عمل پر عامل ہونا چاہیے۔ البتہ وہ پردے کے قائل تھے اور مرد و زن کے آزادانہ اختلاط کو سخت ناپسند کرتے تھے۔

انڈین نیشنل کانگریس ۱۸۸۵ء میں مولانا شبلی کے سامنے ہی قائم ہوئی تھی بعض اسباب و وجوہ کی بنا پر سرسید اور بعض دوسرے سربرآوردہ حضرات اس کے ہم نوا نہ تھے اور مسلمانوں کو خاص طور پر اس سے دور رہنے کا مشورہ دیتے تھے۔ مولانا شبلی کو سرسید کی اس رائے سے اتفاق نہ تھا۔ وہ اس تحریک سے مسلمانوں کی وابستگی کو نہ صرف مفید بلکہ ضروری خیال کرتے تھے۔

ابوالکلام آزاد کی سیاسی تربیت مولانا شبلی ہی کے زیر سایہ ہوئی تھی۔ کانگریس کے برخلاف مسلم لیگ

کی حیثیت ان کی نگاہوں میں مشکوک و مشتبہ تھی۔ ان کا خیال تھا کہ یہ تحریک انگریزوں کی خوشامد چاپلوسی اور

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

موقع پرستی کے لیے وجود میں آئی ہے۔ اس پر انھیں یہ اعتراض تھا کہ اس کے کارکنوں میں مقصدیت، جفاکشی، سخت کوشی اور ایثار وقربانی کی روح مفقود ہے۔ اس طرح کے خیالات کا اظہار انھوں نے اپنی نظموں میں بھی کیا ہے۔

نظریات وافکار اور کارناموں کی طرح مولانا شبلی کی نجی زندگی بھی تنوع اور رنگارنگی کا پہلو لیے ہوئے ہے۔ وہ فکری طور پر راسخ العقیدہ مسلمان اور مذہبی شخص تھے شراب ناب اور دیگر منہیات ومحرمات سے ہمیشہ دور رہتے تھے۔ لیکن موسیقی کی محفلوں اور میلوں ٹھیلوں میں گاہے بہ گاہے شرکت کرلیا کرتے تھے۔

شبلی نے سب سے پہلا مضمون ''مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم'' لکھا تھا۔ اس کے بعد تصانیف کے ساتھ چھوٹے بڑے مقالات اور مضامین بھی رسالوں میں لکھتے رہے۔ پھر ندوۃ العلماء سے ماہوار رسالہ ''الندوۃ'' جاری کیا۔ اس میں کثرت سے ہر قسم کے مضامین لکھے طویل مضامین ''رسائل شبلی'' کہلاتے ہیں اور اسی نام سے شائع ہوئے تھے۔

رسائل شبلی ۱۸۹۸ء میں رحمانی پریس دہلی سے طبع ہوئے۔ اس کے عنوانات درج ذیل ہیں:

۱- دیباچہ از شبلی نعمانی اس میں اسلامی حکومتیں اور شفاخانے، ص ۱-۱۸

۲- اسلامی کتب خانے ص ۱۸-۴۲

۳- حقوق الذمیین ص ۴۲-۷۶

۴- الجزیہ ص ۷۷-۸۷

۵- میکینکس اور مسلمان ص ۸۸-۹۳

۶- خطبہ جو ندوۃ العلماء کے پہلے اجلاس منعقدہ ۱۱/اپریل ۱۸۹۵ء کو پڑھا ص ۹۴-۱۱۱

۷- النظر فی السفر الی المؤتمر ص ۱۱۲-۱۲۳

۸- کتب خانہ اسکندریہ ص ۱۲۴-۱۶۱

۹- تراجم ص ۱۶۲-۲۶۳

۱۰- اسلامی مدارس ص ۲۶۴-۳۰۱

۱۱- قدیم تعلیم ص ۳۰۱-۳۱۳

مولانا شبلی کو قدرت نے تحریر کے ساتھ تقریر کا ملکہ وسلیقہ بھی ودیعت کیا تھا۔ ان کی تقریریں عالمانہ

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

اور استدلالی ہوا کرتی تھیں۔ ان کی تقریریں عموماً برجستہ ہوا کرتی تھیں، اس لیے اکثر محفوظ نہیں رہیں جو محفوظ رہ گئیں وہ ''خطبات شبلی'' اور ''باقیات شبلی'' میں جمع کر دی گئیں ''خطبات شبلی'' کو سید سلیمان ندوی نے مرتب کیا اور دارالمصنفین اعظم گڑھ سے ۱۹۴۱ء میں شائع کروایا۔

خطبات شبلی یعنی مولانا شبلی کی مختلف علمی و مذہبی و قومی تقریروں کا مجموعہ ہے۔ اس کے موضوعات درج ذیل ہیں:

۱- چھوٹے اور کم درجہ اسکولوں کا قیام

۲- اسلامی علوم و فلسفہ کی تاریخی ترتیب

۳- ایجوکیشنل کانفرنس کی سالانہ رپورٹ پر ریمارک

۴- قدیم عربی نصاب کے نقائص

۵- علماء کے فرائض

۶- مجوزہ دارالعلوم

۷- شاہ امانت اللہ صاحب غازی پوری کی وفات

۸- اسکولوں مین مذہبی تعلیم کا انتظام

۹- قدیم و جدید تعلیم

۱۰- تعصب اور اسلام

۱۱- سنگ بنیاد دارالعلوم

۱۲- ندوۃ العلماء کی ضرورت

۱۳- تحفظ اسلام

۱۴- تحفظ مذہب

۱۵- اسلام کی بہترین جمہوریت

شبلی کے خطبات اور رسائل کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ وہ ایک غیر معمولی انسان تھے۔ ان کی شخصیت میں عظمت و کمال کی بہت سی ایسی صفات جمع تھیں جو الگ الگ بھی بہت کم لوگوں کو

میسر آتی ہیں وہ صرف تاریخ نگار ہی نہیں، تاریخ ساز بھی تھے۔ مصنف ہی نہیں، مصنف گر بھی تھے۔ انھوں نے

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

کسب مال اور طلب جاہ کو اپنا مطمح نظر بنانے کے بجائے بے لوث علمی قومی، ملی خدمات میں زندگی بسر کر دی۔ وہ اعلیٰ اخلاقی قدروں کے حامل اور قدیم مشرقی تمدن کا قابل قدر نمونہ تھے ان کی علمی وادبی تصنیف ومقالات، اردو زبان وادب کا بیش قیمت سرمایہ ہیں وہ اپنے ممتاز معاصرین میں سب سے چھوٹے تھے لیکن کارناموں کے تنوع نیز عظمت کے لحاظ سے ان کا درجہ خاصا بلند ہے۔ ان کا نظریہ قدیم وجدید بھی لائق توجہ ہے۔ یہ سرسری اور سطحی نہیں گہرے تدبر اور غور وفکر کا نتیجہ ہے۔ بقول سید سلیمان ندوی:

شبلی زخیل زمزمہ سنجاں حشم گرفت

با این کہ ہیچ گونہ زخیل وحشم نہ داشت

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

ج-دیگر نثری تحریریں

علامہ شبلی نعمانی جہاں ایک مورخ، ایک فاضل اجل اور ماہر تعلیمات تھے وہیں وہ ایک باکمال ادیب بھی اور خوش گو اور خوش فکر شاعر بھی تھے اردو نثر میں شبلی نے وہ کمالات دکھائے کہ اردو زبان ان کے گوہر پاروں سے مالا مال ہوگئی۔ شبلی پہلے ادیب تھے جو دہلی یا لکھنؤ کے رہنے والے نہ تھے لیکن پھر بھی زمانہ نے ان کی تحریروں کو مستند مانا۔

محمد شبلی ۸ رمئی ۱۸۵۷ء کو اعظم گڑھ کے بندول نامی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۱۴ء میں انتقال ہوا۔ ۱۸۷۶ء میں جب ان کی عمر صرف ۱۹ سال کی تھی حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے انھوں نے اپنے والد کی پیروی میں وکالت کا امتحان بھی پاس کیا اور کچھ روز وکالت بھی کی پھر کچھ عرصہ تک سرکاری ملازمت بھی کی۔ لیکن تھوڑے عرصہ کے بعد استعفیٰ دے دیا اور علمی کاموں میں دن گزارنے لگے۔ ان ہی دنوں شبلی کے ایک چھوٹے بھائی علی گڑھ کالج میں پڑھتے تھے ان سے ملنے کے لئے ۱۸۸۲ء میں شبلی علی گڑھ گئے اور سرسید احمد خان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے شبلی کو فارسی کی پروفیسری کی پیش کش کی جس کو شبلی نے قبول کرلیا۔ علی گڑھ کی فضا شبلی کی علمی نشو ونما کے لئے بہت مفید ثابت ہوئی۔

یوں تو شبلی کے دل میں قومی جوش فطرتاً موجود تھا لیکن شخصیتوں میں سرسید احمد خاں اور تصانیف میں مولانا محمد حسین آزاد کی ''سیلنن الاسلام'' نے اس جوش کو اور زیادہ تیز کر دیا۔ مولانا محمد یحییٰ تنہا صاحب لکھتے ہیں:-

> ''یہ وہ وقت تھا کہ سرسید کے شور و ہنگامہ سے سارا ہندوستان گونج رہا تھا مولوی محمد حسین آزاد کی کتاب ''سینن الاسلام'' نئی نئی شائع ہوئی تھی۔ وہ اکثر زیر مطالعہ رہتی تھی مفاخر اسلام وعرب پڑھ پڑھ کر وجد کرتے تھے۔ اور اب پہلی مرتبہ ان کے دل نے علماء کی غفلت تضیع اوقات، نادانی اور کجروی کا درد محسوس کیا''۔ [1]

---

[1] سیر المصنفین - مولانا محمد یحییٰ تنہا، جلد دوم صفحہ ۱۴-۴۱۳

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

شبلی نے اسلام کی گزشتہ شان وشوکت کو دنیا کے سامنے پہلی مرتبہ نئی آب وتاب سے پیش کر کے مسلمانوں کی رگ ہمیت میں جوش پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مسلمانوں کی نامور ہستیوں کو پیش کر کے اپنی بے حس قوم کو بیدار کرنا چاہا۔ اوران میں سے بعض کتابوں کے مواد اکٹھا کرنے کے لئے ان کو شام وروم ومصر کا سفر بھی کرنا پڑا۔

سرسید احمد خان کے انتقال کے بعد ۱۸۹۸ء میں مولانا شبلی علی گڑھ سے سلسلہ قطع کر کے اعظم گڑھ چلے گئے۔ پھر سید علی بلگرامی کی کوشش سے حیدر آباد دکن میں چار برس تک ناظم محکمہ تعلیم کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور سلسلہ آصفیہ میں کئی کتابیں لکھیں۔

مستقل تصانیف کے علاوہ علامہ شبلی کی کچھ تصانیف ایسی بھی ہیں جن سے تاریخ کی گزرگاہیں روشن ہیں۔ مولانا شبلی نے مسلمانوں کے نظام تعلیم کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اور جس طرح درس نظامی اور قدیم وجدید نظام تعلیم کا مقابلہ کیا ہے وہ ان کی ذہنی کیفیات کا ترجمان ہے۔

علوم قرآن سے متعلق ان کے مقالات ''تاریخ ترتیب قرآن'' ''علوم القرآن'' وغیرہ تحقیق اور ترجمانی کے بہترین نمونے ہیں عربی زبان سے متعلق ان کے مضامین، عربی اور فارسی شاعری کا موازنہ، شعر العرب ان کی تبحر علمی کی نشانیاں ہیں اگر انھیں موقع ملتا تو شعر العجم کی طرح شعر العرب بھی تصنیف کرتے۔

ہندوستان کی تاریخ اور تمدن کے ماخذ سے متعلق ان کے مقالات ''ہمایوں نامہ'' ''مآثر رحیمی'' تزک جہانگیری ''تحفۃ الہند'' ''زیب النساء'' بصیرت افروز ہیں۔

''تعصب اور اسلام'' ان کا ایک رسالہ معلومات سے بھرا ہوا ہے۔ شبلی نے مسلمانوں کے تمدنی کارناموں کو روشنی میں لانے کے لئے ''اسلامی حکومتیں اور شفاخانے'' ''میکنس اور مسلمان'' ''ہندوستان میں اسلامی حکومت کے تمدن کا اثر'' وغیرہ مضامین انھوں نے مختلف اوقات میں لکھے۔ تمدنی اثرات کا جائزہ انھوں نے صرف تیموریوں تک محدود رکھا، جس سے اس رسالہ کی اہمیت پر اثر پڑا۔

اردو ادب سے مولانا شبلی کو جو تعلق تھا اس کا اظہار اس سے ہوتا ہے کہ وہ اشعار کا ایک انتخاب شائع کرنا چاہتے تھے۔ ''موازنۂ انیس ودبیر'' میں اردو شاعری کا ذوق ہاتھ میں مشعل لیے ہوئے نظر آتا ہے۔ ان کے مضامین ''املا وصحت الفاظ'' ''اردو ہندی'' ''بھاشا زبان'' سرسید اور اردو لٹریچر'' اردو زبان وادب سے ان کی گہری دلچسپی کے مظہر ہیں۔

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

سرسید کے متعلق لکھتے ہیں:-

''سرسید کے جس قدر کارنامے ہیں اگرچہ رفارمیشن اور اصلاح کی حیثیت ہر جگہ نظر آتی ہے لیکن جو چیزیں خصوصیت کے ساتھ ان کی اصلاح کی بدولت ذرہ سے آفتاب بن گئیں ان میں ایک اردو لٹریچر بھی ہے .....سرسید کی انشاء پردازی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ہر قسم کے مختلف مضامین پر کچھ نہ کچھ بلکہ بہت کچھ لکھا ہے اور جس مضمون کو لکھا ہے اس درجہ پر پہنچا دیا ہے کہ اس سے بڑھ کر ناممکن ہے''[1]

شبلی نے خود اس چشمۂ فیض سے فائدہ اٹھایا تھا اور ایک مخصوص رنگ دیا تھا۔

مہدی افادی نے صحیح لکھا ہے:-

''شبلی ملک میں پہلے شخص ہیں جنھوں نے تاریخ پر فلسفہ کا رنگ چڑھایا اور حکیمانہ انکشافات ونکتہ آرائیوں سے اسے ایک مستقل فن بنا دیا۔''[2]

شبلی کی تحریر میں صفائی، سادگی اور ووضاحت پائی جاتی ہے ان کی عبارت میں پیچیدگی یا الجھن کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ پیچیدہ مسائل کو نہایت آسانی سے سلجھا دیتے ہیں۔ ان کی زبان اور تحریر میں فصاحت اور بلاغت بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ مضامین کی خشکی رفع کرنے کے لئے دلچسپ تشبیہ اور استعاروں سے بھی جابجا کام لیتے ہیں۔

الفاظ زیادہ تر عام فہم ہوتے ہیں۔ شبلی کا اسلوب بیان ایسا ہے کہ بلند سے بلند مضامین اس میں سلیس اردو کے ساتھ لکھے جاسکتے ہیں۔ عبارت میں ایک خاص وصف یہ ہے کہ جو لطف تقریر سے حاصل ہوسکتا ہے وہ ان کی تحریر میں بھی قائم رہتا ہے۔

تاریخ نویسی میں شبلی کا اسلوب بیان نہایت دلچسپ اور دلکش ہوتا ہے۔ تاریخ جیسے خشک موضوع کو ادب کی چاشنی دے کر ہر شخص کے لیے پرلطف بنا دیتے ہیں۔ طرز استدلال پر اتنا عبور ہے کہ واقعات کی ایک کڑی سے دوسری کڑی اس طرح ملاتے ہیں کہ منطق کا اصول ہر جگہ قائم رہتا ہے۔

فن تنقید کو شبلی نے اردو میں بہت فروغ دیا اور اس کے اصول بھی قائم کر دیئے۔

---

[1] مقالات شبلی، جلد دوم، صفحہ ۶۱

[2] مہدی افادی، صفحہ ۲۱۳

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

شبلی نے اردو زبان میں شاعری اس وقت شروع کی جبکہ ایک طرف ہندوستان کی فضا داغؔ اور میرؔ کی غزل خوانیوں سے گونج رہی تھی۔ اور دوسری طرف مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا حالی کی نیچرل شاعری اور مسدس حالی سے ادبی دنیا میں ایک ادبی انقلاب رونما ہو رہا تھا مگر تاریخی کہانیوں کو کامیابی کے ساتھ نظم کرنے کا سہرا شبلی کے سر ہے۔ اس ضمن میں ان کا ایک شعر بے حد مشہور ہے۔

تمھیں لے دے کے ساری داستاں میں یاد ہے اتنا
کہ عالم گیر ہند وکش تھا، ظالم تھا، ستم گر تھا

علاوہ ازیں شبلی نے نظم میں سیاسی مسائل پر بھی بحث کی اور اس طرح اردو ادب کی تاریخ میں پہلی مرتبہ شبلی ہی نے سیاسی شاعری کی داغ بیل ڈالی۔ اردو کی یہ سیاسی شاعری مسلمانوں کی قومی شاعری کہلا سکتی ہے۔ اور یہ فخر شبلی ہی کو حاصل ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر بے روک ٹوک اظہار خیال کیا۔

نہ صرف یہ بلکہ تاریخی واقعات کو اردو نظم کا جامہ پہنانے کی ابتداء بھی مولانا شبلی ہی نے کی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ بعد ازاں ان کی تقلید کرتے ہوئے علامہ اقبال، مولانا حالی، مولانا محمد حسین آزاد، مصور غم راشد الخیری، مولانا ظفر علی خاں اور دیگر قومی شعراء نے متعدد تاریخی واقعات نظم کیے۔

علم کی محبت مولانا شبلی کی رگ و پے میں رچی بسی ہوئی تھی وہ مطالعے کے شوقین نہیں بلکہ حریص تھے ان کا زیادہ وقت کتابوں کی ورق گردانی میں گزرتا تھا۔ ادبیات، اسلامیات، فلسفہ، تاریخ اور فنون لطیفہ وغیرہ موضوعات سے متعلق اکثر کتابیں ان کی نظر سے گذر چکی تھیں۔ مطبوعات کے علاوہ مخطوطات سے بھی استفادہ کرتے رہتے تھے۔ ان کی کوئی مجلس علمی تذکروں سے خالی نہ تھی۔ مصنفین اور تصانیف کے مرتبے اور حیثیت سے بہ خوبی واقف تھے ان کا شریک گفتگو خواہ کسی سطح یا درجے کا ہو، ان کی گفتگو سے محظوظ ہوتا اور مرعوب بھی۔

شبلی کے پیرایۂ بیان کی دل نشینی اور طرز ادا کی رعنائی میں بھی شبلی کوئی ثانی نہ رکھتے تھے ان کے مخالفین بھی اس بات کے معترف رہا کرتے تھے وہ اپنی گفتگو سے مخاطب کو بہت جلد اپنا ہم نوا بنا لیتے ہیں وہ جہاں بھی موجود ہوتے، گل افشانی گفتار کی وجہ سے میر مجلس بنے رہتے۔ مقدمات کی تمہید، دلائل کی ترتیب اور مطلوب و مدعا کی تعبیر پر انھیں غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔

مولانا شبلی کی تحریروں کا پس منظر اور ماحول اگرچہ عمومی ماحول کے لحاظ سے اسلامی ہے، لیکن ان کا ذہن و مزاج تعصب سے خالی اور روادارانہ ہے۔ اس سلسلے میں ان کے مضمون ''مسلمانوں کی پولیٹکل کروٹ''

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

کی چوتھی قسط خاص طور سے مطالعہ کے قابل ہے۔ اس کے علاوہ اپنے تاریخی مقالات میں بھی انھوں نے جہاں شاہان تیمور کی عدل گستری وخلق پروری کی داستانیں سنائی ہیں، وہیں ہندو راجگان اور مہاراجگان کی تعریف وتوصیف بالخصوص ان کی وفاکیشی کے بیان میں تر زبان بھی رہے ہیں۔

مولانا شبلی کا ایک امتیازی پہلو یہ بھی ہے کہ وہ تصنیف وتالیف کی بے پناہ صلاحیتوں سے بہرہ ور ہونے کے ساتھ ساتھ علمی خطوط پر سوچنے، کام کرانے اور منصوبے تیار کرنے میں بھی ماہر تھے۔ ان کا ذہن علم وادب کی خدمت کی نوع بہ نوع شکلیں تلاش کرتا رہتا تھا، چنانچہ انجمن ترقی اردو کی سکریٹری شپ، ندوۃ العلماء کی معتمدی، ماہ نامہ ''الندوہ'' کی ادارت، علمی نمائشوں کے اہتمام اور اہم مخطوطات کی اشاعت سے متعلق ایک ادارے، نیز دارالمصنفین کے قیام کے تجویز کو اس سلسلے کی مثالوں میں پیش کیا جاسکتا ہے۔

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

حاصل مطالعہ

شبلی کی نثر کا اسٹائل اور ان کی ادبی قدر و قیمت کا تعین

علم کی محبت مولانا شبلی کی رگ رگ میں بسی ہوئی تھی ۔ ادبیات ، اسلامیات ، فلسفہ ، تاریخ اور فنون لطیفہ وغیرہ موضوعات سے متعلق اکثر کتابیں ان کی نظر سے گزر چکی تھیں ۔ مطبوعات کے علاوہ مخطوطات سے بھی استفادہ کرتے رہتے تھے ۔ ان کی کوئی بھی محفل یا مجلس علمی تذکروں سے خالی نہیں ہوتی تھی ۔

شبلی کی شخصیت میں ذوق جمال اور ذوق تحقیق بدرجۂ اتم موجود تھے ۔ ان کو شبلی کی علمی زندگی کے بنیادی محرکات قرار دیا جا سکتا ہے ۔ شبلی کو ان کا تحقیقی ذوق ماخذ کی تلاش میں ہمیشہ ہی سرگرداں رکھتا تھا ۔ وہ عربی ، فارسی ، انگریزی ، جرمن ہر زبان کی علمی کوششوں سے باخبر رہتے تھے ۔ یورپین زبانوں میں لٹریچر سے واقفیت نہ صرف اس لیے ضروری تھی کہ مستشرقین کی پیدا کی ہوئی غلط فہمیوں کو دور کیا جائے بلکہ اس لیے بھی کہ جدید انداز تحقیق سے پوری طرح آگاہی ہو سکے ۔ قسطنطنیہ سے سر سید احمد خاں کو لکھا تھا :-

> ''زبان کی اجنبیت کی وجہ سے حالات معلوم کرنے میں نہایت دقت ہوتی ہے ۔ میں نے ترکی پڑھنی شروع کی ہے ۔ اور انشاء اللہ کچھ نہ کچھ بقدر ضرورت واپسی کے وقت تک سیکھ لوں گا'' ۔

> جو زبان وہ خود نہیں سمجھ پاتے تھے ، اس کے ترجمے کرالیا کرتے تھے ۔ کارلائل (CARLYLE) کی HEROES AND HERO WORSHIP کا جب عربی ترجمہ پڑھا تو اس کی تعریف کی اور کہا ''میرے کام کی چیز ہے'' ۔ [1]

انگریزی کی سب مطلوبہ کتابوں کا اردو میں ترجمہ ہو پانا ممکن نہ تھا ۔ اس لیے جس شخص کو اس کتاب کا ذوق ہوتا اس سے درخواست کرتے کہ

---

[1] مکاتیب شبلی ، جلد اول ، صفحہ ۱

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

''مطالعہ کر کے قابل ترجمہ مقامات پر نشانات کرتے جائیں اور پھر کتاب واپس بھیج دیں''۔[1]

مولانا شبلی نے ماخذ کی تلاش، تحقیق اور تنقید کو تحقیقی کاموں کی بنیاد قرار دیا ہے۔ جب سیرت پر کام شروع کر رہے تھے تو لکھا تھا:-

''سیرت کی ماخذ اصلی صرف تین کتابیں ہیں، ابن ہشام، ابن سعد، طبری۔ ان کے تمام رواۃ کا استفادہ کر کے ان کا اسماء الرجال تہذیب وغیرہ سے قریب کر رہا ہوں۔''[2]

سفرنامہ میں لکھتے ہیں

میں نے قسطنطنیہ کا جو سفر کیا وہ محض ایک طالب علمانہ سفر تھا۔

آگے چل کر لکھتے ہیں:-

''جس زمانہ میں مجھ کو ہیرو آف اسلام کا خیال پیدا ہوا۔ اسی وقت یہ خیال بھی آیا کہ ہمارے ملک میں جس قدر تاریخی سرمایہ موجود ہے وہ اس مقصد کے لیے کسی طرح کافی نہیں ہوسکتا۔ یہی خیال تھا جس نے اوّل اوّل اس سفر کی تحریک دل میں پیدا کی۔''[3]

تحقیق کا جذبہ اگر شبلی کی علمی جدوجہد کا مرکزی نقطہ تھا تو ''ذوقِ جمال'' ان کے رگ و پے میں سما گیا تھا۔ مشاہدۂ جمال سے ان کی نظر میں پھول مہک اٹھتے تھے اور ان کی بہترین صلاحیتوں میں حرکت پیدا ہو جاتی تھی اور وہ تھوڑی دیر کے بعد نہ صرف گرد و پیش سے بلکہ دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو جاتے تھے۔ ان کو بلبل کی آواز، مطرب کے ساز، لہلہاتے مرغزاروں میں حسن و جمال کی دلفریبی نظر آتی تھی۔ ان کی فارسی غزلیں ان کے ذوقِ جمال کی بہترین آئینہ دار ہیں۔

شبلی اپنے بارے میں کہا کرتے تھے کہ لوگ اکبری یا عالم گیری ہیں لیکن میں جہاں گیری ہوں۔

یہ جہانگیر کا ذوقِ جمال تھا جو اُن کے لیے جاذب نظر تھا۔ اِس ذوقِ جمال نے ان کے اندازِ تحریر میں عجب توانائی اور دلکشی پیدا کر دی تھی۔ ان کی تحریر کے ایک ایک حرف سے اس کا اظہار ہوتا ہے۔ دارالمصنفین

---

[1] مکاتیب شبلی، جلد اول، صفحہ ۳۰۲

[2] مکاتیب شبلی، جلد اول، صفحہ ۲۰۱

[3] سفرنامہ، دیباچہ، صفحہ ۲، آگرہ ۱۸۹۴ء

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

میں سیرت النبی کے انتساب کے متعدد مسوّدات موجود ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ الفاظ کے انتخاب میں کس طرح جمالیاتی ذوق سے کام لیتے تھے۔ ان کا یہ ذوق جمال درباری نبوی میں اپنے پورے عروج پر نظر آتا ہے جہاں رسول اکرم ﷺ کے متعلق لکھتے ہیں:-

پیکر آرائے ازل صورت زیبائے ترا

نقش میں سبت وہم از دوق تماشائی کرد

شبلی نے مشرق ومغرب کے علمی پیمانوں کو ایک سانچہ میں ڈھال دیا۔ انھوں نے روایتی طرز پر علوم مشرقی کو حاصل کیا تھا، لیکن اس میں جو کمی تھی اس کا احساس ان کو بار بار مغربی علوم کی طرف متوجہ کرتا تھا۔ انھوں نے مغرب سے اندازِ تحقیق اور طرزِ تنقید حاصل کیا اور اسکو ان کے تبحر علمی نے بڑی دلکش صورت میں پیش کیا، وہ مغرب کی تحقیق کی خوبی اور کمزوری دونوں سے واقف تھے۔ ایک جگہ لکھا تھا:-

''یورپ کی غلط بیانیوں کا ایک دفتر ہے، ان کے ایک ایک حرف کے لیے سینکڑوں ورق الٹنے پڑتے ہیں۔ یہ کم بخت لکھتے تو جھوٹ ہیں لیکن بے پتہ نہیں لکھتے، یہاں ہمارے سیرت نگاروں نے خود بہت بے احتیاطیاں کی ہیں۔''[1]

ایسی صورت میں ان کو مشرقی اور مغربی دونوں ماخذ پر تنقیدی نظر رکھنی پڑتی تھی۔

یہ حقیقت بھی ہمارے سامنے رہنی چاہیے کہ نظر ونگاہ کی یہ وسعت اور تلاش وتحقیق کا یہ جذبہ سرسید کی صحبت میں پیدا ہوا اور یہیں سے اس نے پرورش پائی۔ سرسید پہلے مسلمان مصنف ومفکر تھے جنھوں نے انگلستان کے کتب خانوں میں بیٹھ کر عیسائی مصنفین کے اسلام سے متعلق نظریات کی تردید اور تنقید کی تھی۔ ان کی اس جرأت مندانہ اور عالمانہ جہد وسعی نے صرف شبلی ہی میں نہیں بلکہ بہت سے مصنفین میں عزم اور حوصلہ پیدا کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے صحیح لکھا ہے کہ ''مولانا شبلی کی ساری دماغی تربیت سرسید کی وجہ سے ہوئی۔''[2]

سرسید کا کتب خانہ، جہاں یورپ اور مصر کی جدید ترین مطبوعات موجود تھیں اور جس کی الماریوں کے سامنے شبلی گھنٹوں کھڑے رہتے تھے، استفادہ کیا۔ اور سرسید کا جدید طرز پر علوم اسلامی کا مطالعہ اور اس سے احیاء فکر کا کام لینے کا انداز شبلی پر اثر انداز ہوا۔ ۱۸۹۱ء میں سرسید جب دکن گئے تھے تو شبلی ان کے ساتھ تھے۔

---

[1] مکاتیب شبلی، جلد دوم، صفحہ ۲۴۲

[2] حواشی ابوالکلام آزاد، سید مسیح الحسن، صفحہ ۲۶۲

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

سرسید نے بہت سا پیسہ خرچ کر کے گبن (GIBBON) کی مشہور کتاب DECLINE AND FALL OF THE ROMAN EMPIRE کا اردو میں ترجمہ کرایا تھا۔ شبلی کو کئی بار اس کو پڑھنے کا موقع ملا۔ اس سے شبلی کی تاریخی معلومات اور بصیرت میں بہت اضافہ ہوا۔

شبلی جدید اصولوں کے طمطراق سے متاثر نہیں ہوئے بلکہ ان پر اطمینان سے غور کیا۔ جو اصول عمدہ تھے ان کو اخذ کیا، نہ صرف اخذ کیا بلکہ ان کو اپنی زندگی کا رہبر بنایا۔ نمائشی چیزوں کو چھوڑ دیا۔

شبلی نے اپنے علمی کاموں کا منصوبہ بہت شروع ہی میں بنا لیا تھا۔ اس علمی پروگرام کی تعیین اور دریافت میں کئی احساسات کی کارفرمائی تھی۔ مسلمانوں کی تاریخ اور تہذیب سے متعلق غلط فہمیوں کو دور کرنا اور علوم اسلامی پر بنیادی تصانیف کی تدوین۔

''ترکی میں مشاہیر رجال کے نام سے ایک سلسلۂ تصنیف شروع ہوا تھا جس میں نظام الملک طوسی، مولانا فخر الدین رازی، مولانا رومؒ اور بہت سے بزرگوں کے حالات میں مستقل رسالے شائع ہوئے تھے۔ ان کو دیکھ کر شبلی کو خیال پیدا ہوا کہ ہندستان میں بھی ایسا سلسلہ شروع کیا جائے''۔[1]

''ہیروز آف اسلام'' کا خیال مشاہیر رجال ہی کو دیکھ کر پیدا ہوا۔ لکھتے ہیں:-

''میں علماء کو جس سطح پر لانا چاہتا ہوں۔ اس کے لیے زینے درکار ہیں۔ الغزالی پہلا زینہ ہے۔ دوسرا تاریخ علم کلام، پھر اصلی سطح یعنی علم کلام جدید ہے.....غزالی میں کھیل کھیلتا تو علماء برسوں بلکہ قرنوں کے لیے ہاتھ سے نکل جاتے۔''[2]

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کس طرح شبلی کا ذہن جدید علم کلام کی تدوین کی طرف راغب تھا۔ انھوں نے امام ابوحنیفہؒ، امام غزالیؒ، رومیؒ، مامون الرشید کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ ان کو اپنے علم کلام کی ترتیب و تدوین کے لیے ان متقدمین علماء و مفکرین سے اعتقادی اور فکری سامان فراہم کرنا تھا۔ اس سلسلہ میں وہ امام ابن تیمیہؒ پر بھی کتاب لکھنا چاہتے تھے، مگر اس کے لیے وقت نہ نکال سکے اور ایک مضمون سے آگے نہ بڑھ سکے۔ اس مضمون میں لکھتے ہیں:-

---

[1] مکاتیب شبلی، جلد اول، صفحہ ۳۴-۳۳۴

[2] مکاتیب جلد دوم، صفحہ ۲۰۱

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

''اسلام میں سینکڑوں، ہزاروں بلکہ لاکھوں علماء، فضلاء، مجتہدین، ائمہ فن،، مدبرینِ ملک گذرے ہیں، لیکن رفارمر بہت کم پیدا ہوئے ..... مجدد یا رفامر کے لیے تین شرطیں ضروری ہیں۔

(۱) مذہب یا علم یا سیاست میں کوئی مفید انقلاب پیدا کرے۔

(۲) جو خیال اس کے دل میں آیا ہو، کسی کی تقلید سے نہ آیا ہو بلکہ اجتہاد ہو۔

(۳) جسمانی مصیبتیں اٹھائی ہوں، جان پر کھیلا ہو، سرفروشی کی ہو۔

تیسری شرط اگر ضروری نہ قرار دی جائے تو امام ابوحنیفہؒ، امام غزالیؒ، امام رازیؒ، شاہ ولی اللہؒ صاحب اس دائرہ میں آسکتے ہیں لیکن جو شخص رفامر کا اصل مصداق ہوسکتا ہے وہ علامہ ابن تیمیہ ہے۔''[۱]

شبلی کی علمی دلچسپیوں کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ تاریخ، ادب، الٰہیات، کلام، فلسفہ، فنون جنگ، نصاب ونظامِ تعلیم وغیرہ وغیرہ۔ وہ الندوہ میں علمی خبروں پر زور دیتے تھے اور علمی رجحانات اور علمی رفتار سے باخبر رہتے تھے۔ مولانا احسن مارہروی نے ۱۹۱۵ء میں لکھا تھا:-

''علامہ شبلی کے دورِ ایڈیٹری میں الندوہ میں جس پائے کے مضامین نکلے ان سے اہل ذوق واقف ہیں۔ یہ مضامین اردو ادب کے لیے بہترین سرمایۂ ناز رہیں گے۔''[۲]

شبلی نے جرجی زیدان پر اپنا مضمون رمضان میں لکھا، اس طرح کہ بقول مولانا احسن مارہروی کہ اس کے لیے:-

''ضخیم مجلدات کے ہزاروں صفحات الٹنے پڑے۔ آخر جب نقد ختم ہوئی تو نقد بصارت بھی نذر ہو چکی تھی۔''[۳]

اپنے بیشتر علمی کاموں کی تکمیل کے بعد شبلی سیرت النبیؐ کی طرف یہ کہتے ہوئے متوجہ ہوئے:-

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیم آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتم
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

---

۱ مکالات شبلی، جلد پنجم، صفحہ ۶۳-۶۲
۲ کسوف الشمسین، صفحہ ۱۴
۳ کسوف الشمسین، صفحہ ۳۴

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

انھوں نے مارگولیتھ، نولڈیکی، نکلسن، ولہاوسن وغیرہ کی تصانیف سے اس سلسلہ میں پوری واقفیت حاصل کی۔ مارا گولیتھ کو وہ ''سب سے بڑا عربی داں'' سمجھتے تھے، لیکن ان کو اپنا خیال بدلنا پڑا۔ شبلی کا ماننا تھا کہ سیرت النبی کے مقابلہ کی کتاب سو سال تک بھی نہ لکھی جا سکے گی۔ مولانا محمد علی نے اس کا انگریزی ترجمہ کرنے کا وعدہ کیا تھا۔

مولانا شبلی نعمانی، محمد حسین آزاد، نذیر احمد، حالی اور خود کو اردو کے عناصر اربعہ میں شمار کرتے تھے۔ ان چاروں میں سب سے کم عمر بھی شبلی کی ہی ہوئی۔ یعنی ۵۷ سال، لیکن شبلی کے کارنامے سب سے زیادہ اور متنوع تھے۔ مسدس کے بارے میں سید سلیمان ندوی کی رائے سے پوری طرح اتفاق کیا جا سکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

''پچھلے ساٹھ برس میں ہماری زبان کی نظم ونثر میں جو کتابیں لکھی گئیں۔ ان میں قبول عام اور حیات دوام اگر کسی کو نصیب ہوئی تو وہ مولانا حالی کا مسدس ہے۔''[1]

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ شبلی کی بعض تصانیف اردو لٹریچر میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان سے تحقیق کے نئے رجحانات پیدا ہوتے ہیں اور اسلامی تاریخ وتمدن کو نئے انداز سے پیش کرنے کی روایت قائم ہوتی ہے۔

شبلی کے افکار ورجحانات کا یہ پس منظر پیش نظر ہو تو ان کی ادبی اور تاریخی خدمات کا صحیح جائزہ لیا جا سکتا ہے۔

ادب میں شبلی کا مقام اپنے معاصرین میں سب سے اونچا تھا۔ ان کا فارسی ادب کا مذاق پختہ اور رچا ہوا تھا۔ فارسی شعر فہمی اور شعر گوئی دونوں میں ان کو کمال حاصل تھا۔ ''شعر العجم'' حافظ محمود شیرانی کی تنقید کے باوجود اپنے موضوع پر بے نظیر کتاب ہے۔ مہدی افادی نے صحیح لکھا ہے:-

''یہ تنقید عالیہ (HIGHER CRITICISM) کا بہتر سے بہتر نمونہ ہے۔ جس پر دنیا کی کوئی زبان ناز کر سکتی ہے۔''[2]

یہ فارسی ادب کی تاریخ نہیں ہے بلکہ ان ادبی میلانات اور سماجی رجحانات کا مرقع ہے جن کی

---

[1] مسدس حالی، صدی ایڈیشن ۱۹۲۵ء دہلی، مقدمہ، صفحہ ۳۷

[2] افادات مہدی، گورکھپور، ۱۹۲۳ء، صفحہ ۲۷

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

ترجمانی فارسی اشعار میں ہوئی ہے۔ تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو اس میں بہت سی اہم شخصیتیں رہ گئی ہیں، لیکن جیسا کہ خود مولانا شبلی کہتے تھے ان کا مقصد:-

''شعرا کے کلام پر ریویو کرنا تھا۔''[1]

حالات شعرا کا جمع کرنا پیش نظر نہ تھا اسی لئے بقول خود انھوں نے ''ان ہی کو لیا جو ایک طرزِ خاص رکھتے تھے۔''[2]

شعرالعجم نے ہندوستان میں فارسی زبان کی تاریخ اور مذاق کے قائم رکھنے میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ کہا جاتا تھا کہ مرزا مظہر جانِ جاناں کے ''خریطۂ جواہر''[3] نے فارسی شعر کا ذوق بڑھایا۔ حقیقت یہ ہے کہ شبلی کی شعرالعجم نے فارسی ادب کو ہندوستان کے ادبی سرمایہ کا جزو بنا دیا۔ اس حقیقت کے پیش نظر مولانا ابوالکلام آزاد نے کہا تھا کہ:-

''فارسی شاعری غالبؔ پر نہیں بلکہ شبلی پر ختم ہوتی ہے۔''[4]

مولانا آزاد کی اس رائے سے اتفاق کیا جا سکتا ہے، شعرالعجم میں اشعار کے انتخاب پر نظر ہو اور بعد کی علمی تصانیف سامنے ہوں تو اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح شبلی نے فارسی شاعری کا عطر کشید کر لیا ہے اور کس طرح ادبی رجحانات کو متاثر کیا ہے۔

شبلی اردو اشعار کا بھی ایک انتخاب ترتیب دینا چاہتے تھے۔ اس پر انھوں نے کچھ کام کر بھی لیا تھا، لیکن پھر توجہ دوسرے کاموں کی طرف ہوگئی اور یہ کام رہ گیا۔ اگر یہ انتخاب مکمل ہو جاتا تو نہ صرف اردو شاعری کی تاریخ میں بلکہ اردو مذاق شعری میں بے حد مددگار ثابت ہوتا۔

ادب سے ہٹ کر جب تاریخ کے میدان میں شبلی پر نظر پڑتی ہے تو دنیا ہی دوسری نظر آتی ہے۔ سوز و مستی، جذب و شوق کی جگہ تنقید و تجزیہ، استقصا اور اسماء الرجال کی تحقیق لے لیتی ہے۔ سیرت النبی میں سب سے پہلے انھوں نے روایت اور درایت کے اصولوں کو متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے مغرب کے ان اصولوں کو قبول کیا جو اس تحقیقی میدان میں رہبر و رہنما کا کام انجام دے سکتے تھے۔

---

[1] مکاتیب، جلد دوم، صفحہ ۲۱۵

[2] مکاتیب شبلی، جلد اول، صفحہ ۲۳۲

[3] مطبع مصطفائی کانپور ۱۲۷۱

[4] کاروانِ خیال، صفحہ ۹۴

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

ساتھ ہی شبلی نے اصول اسناد اور اسماء الرجال کی اس طرح تشریح کی کہ جدید تحقیقات کے اصول اس کے دامن میں سما گئے۔ شبلی نے مستشرقین پر جو تنقید کی اور ان کی غلطیوں کی جس طرح گرفت کی، اس سے مصر اور ترکی میں ان تحریکوں کو تقویت پہنچی جو اس میدان میں ابھی پوری طرح ابھر نہیں سکی تھیں۔ جرجی زیدان، مارگولیتھ، نکلسن وغیرہ پر تنقید نے ان ممالک میں خود اعتمادی پیدا کی۔ سیرت کا ترکی ترجمہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان کی تحقیقات کو ممالک اسلامیہ کس احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات کے بعد سیرت النبیؐ دوسری اہم ہندوستانی مذہبی تصنیف ہے جس پر ترکوں نے خاص توجہ کی۔

اسکندریہ کے کتب خانہ کو جلانے کا الزام مستشرقین نے مسلمانوں پر لگایا تھا۔ شبلی نے اس پورے لٹریچر کا بغور مطالعہ کیا۔ گبن، وائٹ، ڈیسائسی، کریل وغیرہ کی تحریروں، SPECTATOR کے پرچے، ENCYCLOPAEDIA کی جلدیں مطالعہ کرنے کے بعد اس بحث میں حصہ لیا اور پر زور دلائل سے ان الزامات کی تردید کرنے کے بعد اپنا مضمون ''کتب خانۂ اسکندریہ'' لکھا اور کہا کہ وہ دن آئے گا جب یورپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ

ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

پھر اسلامی نظامِ حکومت میں اہل ذمہ کی حیثیت اور جزیہ کی نوعیت پر غلط فہمی دور کرنے کے لیے شبلی نے دو رسائل ''الجزیہ'' اور ''حقوق الذمیین'' لکھے تھے۔ انھوں نے فقہ اسلامی کی روشنی میں ان مسائل پر جس طرح بحث کی اس سے بہت سی غلط فہمیاں دور ہو گئیں۔ عربی ممالک میں اس عنوان پر اتنا لٹریچر موجود نہ تھا، نہ کسی نے اس طرح ان مسائل پر روشنی ڈالی تھی۔

اسی طرح اورنگزیب پر شبلی کی تحقیق نے بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا اور بعض ایسے فرامین اور مصادر کی نشاندہی کی جن کی تلاش میں بعد میں بعض محققین کو نکلنا پڑا۔

جب شبلی نے ''المامون'' لکھی تو سرسید کو ان کے طرز تحریر اور اندازِ تحقیق سے بڑی خوشی ہوئی۔ دیباچہ میں انھوں نے لکھا:-

> ''ہماری تاریخیں اس زمانہ کی لکھی ہوئی ہیں جس زمانہ نے تاریخ نویسی کے فن کو پوری طرح ترقی نہیں دی تھی۔ اس لیے ہمارے بزرگوں کے کاموں کے گوہر آب دار کہیں بکھرے پڑے ہوئے ہیں اور کہیں کوڑے کرکٹ میں رلے ملے ہیں۔ ایک نہایت لائق

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

شخص کا کام ہے جوان کو چنے اور لڑی میں پرو کر سجا دے.....ہم کو نہایت خوشی ہے کہ ہمارے دوست مخدوم اور ہمارے مدرسۃ العلوم کے پروفیسر مولانا محمد شبلی نعمانی نے اس کام کا بیڑا اٹھایا ہے اور ایک سلسلہ ہیروز آف اسلام کا لکھنا چاہا ہے۔''[1]

تحقیقی کاوشوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:-

''مصنف نے کوئی بات ایسی نہیں لکھی جس کا حوالہ معتبر ماخذ سے نہ دیا ہو''۔[2]

پھر طرزِ تحریر کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:-

''یہ کتاب اردو زبان میں لکھی گئی ہے اور ایسی صاف وشستہ اور برجستہ عبارت ہے کہ دلی والوں کو بھی اس پر رشک آتا ہوگا۔''[3]

سرسید احمد خاں کی رائے سے پوری طرح سے اتفاق کیا جاسکتا ہے۔ بغور مطالعہ کرنے کے بعد یہی دو خوبیاں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی عباسی خلیفہ کا حال اس طرح نہیں لکھا گیا ہے۔

''النعمان'' اور ''الغزالی'' فقہ وتصوّف کے تاریخی تجزیہ پر مبنی ہیں۔ شبلی کو حضرت امام ابوحنیفہ سے دلی تعلق تھا۔ اس کا اظہار ان کے نام کے ساتھ کے لفظ ''نعمانی'' سے ہوتا ہے۔ لیکن جس چیز نے اس کتاب کی تدوین پر متوجہ کیا وہ فقہ اسلامی کا دفاع تھا۔ دیباچہ میں لکھا ہے:-

''امام ابوحنیفہ کے اجتہادی مسائل تقریباً بارہ سو برس سے تمام ممالک اسلامی میں پھیلے ہوئے ہیں.....ظلم تھا اگر ان کی لائف خود اردو میں نہ لکھی جاتی۔''[4]

امام صاحب کے حالات کے ضمن میں حدیث، اصول حدیث، اجتہاد، پر جو بحث کی ہے وہ بصیرت افروز ہے۔

الغزالی کی طرف وہ تصوّف کے راستے سے نہیں آئے تھے بلکہ علم کلام نے ان کی رہبری کی تھی، لیکن ایک حقیقت کا شبلی نے اعتراف کیا ہے کہ فن اخلاق کے متعلق امام صاحب کے جو کارنامے ہیں سب تصوّف کی بدولت ہیں۔ امام صاحب سے متعلق پروفیسر گوشی اور پروفیسر منک کی تصانیف ان کی نظر میں تھیں۔

---

[1] المامون، دیباچہ، صفحہ ا

[2] المامون، دیباچہ، صفحہ ا

[3] المامون، دیباچہ، صفحہ ا

[4] سیرۃ النعمان، صفحہ ۵

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

''الفاروق''، شبلی کی تحقیق اور تاریخی ژرف نگاہی کا شاہ کار ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلوی کی ازالۃ الخفا عن الخلفاء کے بعد اس نوعیت کا علمی کام منظرِ عام پر نہیں آیا تھا۔

سیرت النبی پر شبلی کی سب سے پہلی کوشش رسالۂ بُعثہ الاسلام ہے جو سرسید کی فرمائش پر لکھا گیا تھا۔ مولانا حمید الدین فراہی نے اس کا ترجمہ فارسی میں کیا۔ سرسید کی سیرت النبیؐ پر خاص توجہ تھی۔ خود سرسید احمد خان کا آخری مضمون ازواجِ مطہرات پر تھا۔ شبلی نے سیرت کے کام کو جس شوق اور جذبہ سے انجام دیا وہ ان کی ادبی زندگی کا سب سے شاندار پہلو ہے۔ زندگی کے آخری لمحات میں بھی ان کی زبان پر ''سیرت سیرت'' تھا۔

''موازنہ انیس و دبیر'' اردو کے تدریسی حلقوں میں، مولانا شبلی کی تمام تصانیف کے درمیان سب سے زیادہ مقبول، ومروّج اور متداول ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موازنہ انیس و دبیر کے علاوہ شبلی نے مستقلاً اور اصالتاً اردو شعر وسخن پر اور کہیں اظہار خیال نہیں کیا ہے۔

اردو تنقید کی تاریخ میں حالی کی ''مقدمۂ شعر وشاعری'' کی طرح ''موازنۂ انیس و دبیر'' کی اہمیت بھی مسلم ہے ایک تو اس لیے کہ یہ اردو میں تقابلی تنقید کی پہلی کتاب ہے اور پہلی مثال ہے۔ دوسرے اس لیے کہ اس کتاب کے ذریعے اردو میں پہلی بار کسی ایک شاعر کو موضوع تحسین بنا کر اس کے کلام پر مفصل تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے مقصد تصنیف پر روشنی ڈالتے ہوئے شبلی نے لکھا ہے:-

> ''مدّت سے ارادہ تھا کہ کسی ممتاز شاعر کے کلام پر تقریظ وتنقید لکھی جائے جس سے اندازہ ہو سکے کہ اردو شاعری باوجود کم مائیگیِ زبان کیا پایہ رکھتی ہے؟ اس غرض کے لیے میر انیس سے زیادہ کوئی موزوں نہیں ہو سکتا تھا، کیونکہ ان کے کلام میں شاعری کے جس قدر اصناف پائے جاتے ہیں اور کسی کے کلام میں نہیں پائے جاتے''۔[1]

حالانکہ اس میں موازنے کا حق ادا کرنے کے بجائے جانب داری سے کام لیا گیا ہے۔ مرثیہ گوئی کی تاریخ نہایت سرسری طور پر بیان کی گئی ہے۔ تفصیلی مباحث کے بجائے طویل مثالوں سے کتاب کی ضخامت بڑھانے کی کوشش کی گئی۔ یہ اعتراضات ایک حد تک بجا ہیں۔ پھر بھی اردو تنقید کے ارتقاء میں ''موازنہ'' کی حیثیت ایک سنگِ میل کی ہے۔

مولانا شبلی نے علم کلام کے میدان میں بھی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ ان کی خدمات انیسویں صدی عیسوی کے نصف ثانی کی ہیں۔ اس زمانے میں یورپ کی سیاسی وتہذیبی بالادستی کی بنا پر مسلمانوں کا ایک طبقہ اپنے مذہبی عقائد کے بارے میں شکوک وشبہات میں مبتلا ہو گیا تھا۔ خاص طور پر مابعد الطبیعاتی عقائد

---

[1] موازنۂ انیس و دبیر- علامہ شبلی نعمانی، انوار المطابع (دیباچہ) صفحہ ۲، ۳

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

مثلاً توحید، رسالت، جنت، دوزخ اور قیامت وغیرہ پر اس کا ایمان برائے نام رہ گیا تھا۔ اس لیے مولانا نے اس طرف بھی توجہ کی اور علم کلام سے متعلق کئی کتابیں لکھیں جن میں ''علم الکلام'' اور ''الکلام'' خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

''علم الکلام'' کا موضوع خود علم کلام نہیں ہے، بلکہ اس کی تاریخ ہے۔ اس میں شبلی نے علم کلام کے آغاز، اس کے نشو ونما کے اسباب اور عہد بہ عہد ارتقاء وغیرہ کا جائزہ لیا ہے۔

''الکلام'' ایک لحاظ سے علم الکلام کا دوسرا حصہ ہے۔ اس میں شبلی نے ایک نئے علم کلام کی بنیاد ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ شبلی کا خیال تھا کہ دور جدید میں قدیم علم کلام مفید نہیں ہوسکتا، بلکہ نئے علم کلام کی ضرورت ہے۔

مستقل تصانیف اور رسائل کے علاوہ شبلی کے بہت سے مقالات اور مضامین ایسے ہیں جن سے تاریخ کی گزرگاہیں روشن ہوگئی ہیں۔

مولانا کا اصل میدان تصنیف و تالیف تھا۔ انھوں نے سیرۃ النبیؐ جیسی ضخیم کتاب بھی لکھی اور مختلف موضوعات پر لاتعداد مضامین بھی قلم بند کئے جن مین سے بعض تو اتنے طویل ہیں کہ مکمل کتاب کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کے ادبی کارنامے بڑے وقیع اور متنوع ہیں۔ ان کا کینوس بہت وسیع ہے۔ اس میں تاریخ بھی ہے، سوانح نگاری بھی، فلسفہ وعلم کلام، بھی ہے، ادبیات بھی ہے، سیاسیات بھی اور نقد وایراد بھی۔ مولانا نے ہر لمحہ خود کو پرورش لوح وقلم میں مصروف رکھا۔ ان میں کتابوں اور مضامین کے علاوہ منظومات بھی ہیں اور احباب، اعزہ اور دیگر مقتدر شخصیات کو لکھے گئے سینکڑوں خطوط بھی، جن میں سے بعضے تو خاصے طویل بھی ہیں اور کسی نہ کسی اہم موضوع سے بحث کرتے ہیں۔

اسی طرح مختلف مواقع پر مولانا نے جو تقاریر کیں اور خطبات دیے ان کی تعداد بھی کافی ہے۔ اگر ہم ان کے علمی آثار کا مجموعی اور بالاستیعاب مطالعہ کریں تو ان سب کا ہمیں ایک ہی محور نظر آتا ہے، اور وہ ہے ''تبلیغ دین اور اشاعت اسلام اور مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی بازیافت۔''

انھوں نے ہر جگہ معلومات کے خزانے لٹائے ہیں اور اسلوب بیان میں شیفتگی کو برقرار رکھا ہے۔

شبلی کے افکار کی معنویت سدا بہار ہے اور ان کی نوکِ قلم سے نکلے ہوئے ہر ہر لفظ کی اہمیت دائمی ہے۔ اسی طرح ان کی شخصیت، فن اور گوناگوں سرگرمیوں کے متعلق جو کچھ صفحۂ قرطاس پر آچکا ہے اس کی وقعت اور افادیت بھی مسلم ہے۔ ان پر تحقیق وتنقید کا سلسلہ تاہنوز جاری ہے اور اس بات کی بجا طور پر توقع کی جاسکتی ہے کہ مستقبل میں بھی جاری رہے گا۔

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

کتابیات

Maulana Azad Library, Aligrh Muslim University

کتابیات

تصانیف شبلی

ادبیات

شعر العجم

حصہ اول (عباس مروزی سے نظامی تک دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ۱۹۸۸ء)

حصہ دوم (عطار سے حافظ ابن یمین تک دارالمصنفین، اعظم گڑھ ۱۹۸۸ء)

حصہ سوم (فغانی شیرازی سے ابوطالب کلیم تک دارالمصنفین، اعظم گڑھ ۱۹۹۱ء)

حصہ چہارم (ایران کی آب وہوا، تمدن اور دیگر اسباب کا فارسی شاعری پر اثر اور شاعری کے تمام اقسام میں سے مثنوی پر بسیط تبصرہ، دارالمصنفین، اعظم گڑھ ۱۹۸۸ء)

حصہ پنجم (قصیدہ غزل اور فارسی زبان کی عشقیہ صوفیانہ اخلاقی اور فلسفیانہ شاعری نقد وتبصرہ دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ۱۹۹۱ء)

موازنۂ انیس ودبی، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی ۱۹۴۹ء

اسلامیات

علم الکلام، مسعود پبلشنگ ہاؤس ۱۹۶۴ء کراچی

الکلام، دارالمصنفین، اعظم گڑھ ۱۹۸۴ء

اسلام کی عالم گیر خدمات، سہیل پبلشنگ ہاؤس دہلی، بات

کتاب الجزیہ، مطبع مجتبائی، لاہور ۱۸۹۱ء

تاریخ

اسلامی حکومت اور ہندوستان میں اس کا تمدنی اثر - الناظر پریس لکھنؤ ۱۹۱۹ء

اورنگزیب عالم گیر پر ایک نظر - اردو مرکز، لاہور ۱۹۵۲ء

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

آئینہ ادب-لاہور ۱۹۷۲ء مع مقدمہ غلام رسول مہر یہ مضامین عالم گیر کے نام سے بھی شائع ہوئے۔

جہانگیر اور توزک جہانگیری-نول کشور، لاہور ب ت

مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم-قومی پریس ۱۹۱۱ء لکھنؤ

۲۷ دسمبر ۱۸۸۷ء، بمقام لکھنؤ پڑھا گیا۔

مضامین عالم گیر-مطبع نظامی، کانپور ۱۹۱۱ء

مضمون کتب خانۂ اسکندریہ پر-مفید عام آگرہ ۱۸۹۴ء

خطبات

خطباتِ شبلی-مرتبہ سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین، اعظم گڑھ (مولانا شبلی کی مختلف علمی و مذہبی وقومی تقریروں کا مجموعہ)

سوانح

الغزالی-دارالمصنفین، اعظم گڑھ ۱۹۵۶ء

الفاروق-حصہ اول اور حصہ دوم دارالمصنفین، اعظم گڑھ ۱۹۵۶ء

حضرت عمر فاروقؓ کی مفصل سوانح عمری۔

المامون-دارالمصنفین، اعظم گڑھ ۱۹۵۷ء

زیب النساء بیگم-نول کشور، پریس، لکھنؤ ب ت

سوانح مولانا روم-(مولانا جلال الدین رومی کی سوانح عمری)=(بہ ترتیب وتقدیم سید عابد علی عابد)، مجلس ترقی اردو، لاہور ۱۹۷۱ء

سیاحت

سفرنامہ روم ومصر وشام-(طبع سوم) رحمانی پریس، دہلی ۱۳۳۵ھ

مقالات ومضامین

رسائل شبلی-مطبع العلوم، علی گڑھ بات

مقالات شبلی-جلد اول (مذہبی) دارالمصنفین، اعظم گڑھ ۱۹۵۴ء)

مقالات شبلی-جلد دوم (ادبی) دارالمصنفین، اعظم گڑھ ۱۹۸۵ء)

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

مقالات شبلی - جلد سوم (تعلیمی) دارالمصنفین، اعظم گڑھ ۱۹۵۵ء)

مقالات شبلی - جلد چہارم (تنقیدی) (بار سوم) دارالمصنفین، اعظم گڑھ ۱۹۵۴ء)

مقالات شبلی - جلد پنجم (تاریخی) حصہ اول دارالمصنفین، اعظم گڑھ ۱۹۵۵ء)

مقالات شبلی - جلد ششم (تاریخی) حصہ دوم دارالمصنفین، اعظم گڑھ ۱۹۵۱ء)

مقالات شبلی - جلد ہفتم (فلسفیانہ) دارالمصنفین، اعظم گڑھ ۱۹۴۵ء)

مقالات شبلی - جلد ہشتم (متفرق) دارالمصنفین، اعظم گڑھ ۱۹۷۲ء)

مکاتیب

مکاتیبِ شبلی حصہ اول، مرتبہ سید سلیمان ندوی دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۱۶ء

مکاتیبِ شبلی حصہ اول طبع دوم، مرتبہ سید سلیمان ندوی دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۲۷ء

طبع سوم، مرتبہ سید سلیمان ندوی دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۵۶ء

طبع چہارم، مرتبہ سید سلیمان ندوی دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۶۶ء

مکاتیبِ شبلی حصہ دوم مرتبہ سید سلیمان ندوی دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۱۷ء

مکاتیبِ شبلی طبع دوم مرتبہ سید سلیمان ندوی دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۲۷ء

مکاتیبِ شبلی حصہ دوم طبع سوم مرتبہ سید سلیمان ندوی دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۳۲ء

مکاتیبِ شبلی طبع چہارم مرتبہ سید سلیمان ندوی دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۷۱ء

مضامین (متفرق رسالوں اور کتابوں میں)

آرمینیا آزاد لکھنؤ ۱۲ر فروری ۱۸۹۶ء

اسلامی حکومتیں اور شفاخانے - محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین علی گڑھ، جلد ۲ شمارہ ۶ (جولائی ۱۸۹۵ء (ص ۲۷۵-۲۹۵)

اسلامی کتب خانے - رسائل شبلی، امرتسر، روز بازار اسٹیم پریس ۱۹۱۱ء (۱۸-۴۲)

اسلامی کتب خانے - مقالاتِ شبلی (جلد ششم) دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۵۱ء (ص ۱۵۲-۱۷۵)

الجزیہ مقالاتِ شبلی - (جلد اول) دارالمصنفین، اعظم گڑھ ۱۹۲۳ء (ص ۲۳۷-۲۳۸)

المعتزلہ والاعتزال مقالاتِ شبلی - (جلد پنجم) دارالمصنفین، اعظم گڑھ ۱۹۳۴ء (ص ۵-۸)

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

اورنگزیب عالم گیر ایک نظر البصیر- چنیوٹ (عالم گیر نمبر) ص ۸۶
ایک اور آفتاب عالم غروب ہوگیا- الندوہ لکھنؤ جلد ۶ شمارہ ۳ (اپریل) ۱۹۰۹ء (ص ۳-۲۴)
تحفۃ الہند- (ہندی صنایع بدائع) الندوہ لکھنؤ (فروری) ۱۹۱۱ء
تزک جہانگیری اور جہانگیر- الندوہ لکھنؤ جلد ۷ شمارہ ۲ (ص ۷-۲۹) (فروری) ۱۹۱۰ء
جزیہ اور اسلام- مولانا شبلی کے تاریخی مضامین مرتبہ عبدالرحمٰن شوق (لاہور، ملک دین محمد ب ت (ص ۱۱۷-۱۲۷)
جہانگیر اور تزک جہانگیری مقالات شبلی (جلد چہارم) دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۳۴ء (ص ۸۲-۱۱۴)
جہانگیر اور تزک جہانگیری- مقالات شبلی (حصہ اول) آسی پریس لکھنؤ ب ت (۱۵۳-۱۸۸)
حقوق الزمیین- محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین علی گڑھ جلد ۳ شمارہ ۴ (اپریل) ۱۸۹۶ء (ص ۱۱۶-۱۲۳)
زیب النساء- الندوہ لکھنؤ جلد ۶ شمارہ ۹ (اکتوبر) ۱۹۰۹ء (ص ۴-۱۴)
کتب خانہ اسکندریہ- رسائل شبلی امرتسر روز بازار اسٹیم پریس ۱۹۱۱ء (ص ۱۲۴-۱۹۱)
مسلمانوں کی پولیٹکل کروٹ- مسلم گزٹ لکھنؤ جلد ا شمارہ ؟ (۱۲ر فروری ۱۹۱۲ء)
(قسط دوم) ،، ،، ،، ۴ مارچ ۱۹۱۲ء
(قسط سوم) ،، ،، ،، ۹ر اکتوبر ۱۹۱۲ء
ہندو مسلم اتحاد، (قسط ۴)
مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم- مقالاتِ شبلی (جلد سوم) دارالمصنفین، اعظم گڑھ ۱۹۲۳ء (صفحہ ۱-۲۶)
تیلنکس اور مسلمان- محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین علی گڑھ جل ۲ شمارہ ۸ (اگست) ۱۸۹۵ء ص ۳۲۶-۳۳۲

مطالعۂ شبلی

۱۔ آثار و اقدار (رشید احمد صدیقی)- اصغر عباس، لبرٹی آرٹ پریس، دہلی ۱۹۸۴ء
۲۔ ادب اور تنقید- اسلوب احمد انصاری، سنگم پبلیشرز، الہ آباد ۱۹۶۸ء
۳۔ ادبی نثر کا ارتقاء- شہناز انجم، پروگریسو بکس، لاہور ۱۹۸۹ء
۴۔ اردو ادب کے معمار (شبلی)- ظفر احمد صدیقی، سروچی پرنٹرس، دہلی ۱۹۹۳ء
۵۔ اردو ادب کی تنقیدی تاریخ- سید احتشام حسین، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی ۲۰۰۱ء چوتھا ایڈیشن

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

۶۔اردو کے اسالیب بیان-محی الدین قادری زور، اعظم اسٹیم پریس، حیدرآباد ۱۹۴۰ء
۷۔اردو اسالیب نثر-امیر اللہ خاں شاہین، جمال پرنٹنگ پریس، جامع مسجد دہلی ۱۹۷۷ء
۸۔اردو تنقید پر ایک نظر-کلیم الدین احمد، پٹنہ لیتھو پریس، پٹنہ ۱۹۸۳ء
۹۔اردو تنقید کا ارتقاء-عبادت بریلوی، انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی ۱۹۶۱ء
۱۰۔تحقیق کا فن-گیان چند جین، اتر پردیش اردو اکاڈمی ۱۹۹۰ء لکھنؤ
۱۱۔تنقید اور عملی تنقید-سید احتشام حسین، ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ ۱۹۶۱ء
۱۲۔تنقید کیا ہے؟-آل احمد سرور لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹر مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نئی دہلی) جنوری ۱۹۹۰ء
۱۳۔جدید اردو تنقید اصول و نظریات-شارب ردولوی، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ تیسرا ایڈیشن ۱۹۸۱ء
۱۴۔چند ہم عصر-مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو، علی گڑھ ۱۹۵۷ء
۱۵۔حیات شبلی-سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین، اعظم گڑھ ۱۹۷۰ء
۱۶۔داستانِ تاریخ اردو-حامد حسن قادری، کلکتہ آفسیٹ پرنٹرس نئی دہلی ۱۹۹۵ء پانچواں ایڈیشن
۱۷۔درسِ بلاغت-قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی ۱۹۹۷ء تیسرا ایڈیشن
۱۸۔شبلی ایک دبستان-آفتاب احمد صدیقی، مکتبہ عارفین، ڈھاکہ ۱۹۸۲ء
۱۹۔شبلی بحیثیت مؤرخ-اختر وقار عظیم، ناپبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی ۱۹۷۹ء
۲۰۔شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں-عبداللطیف اعظمی، شبلی اکیڈمی، دہلی ۱۹۴۵ء
۲۱۔شبلی معاندانہ تنقید کی روشنی میں-شہاب الدین دسنوی انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی ۱۹۸۱ء
۲۲۔شبلی نامہ-شیخ محمد اکرام-تاج آفس
۲۳۔شبلی نقادوں کی نظر میں-شہناز صدیقی، الیاس ٹریڈرس، حیدرآباد ۱۹۷۶ء
۲۴۔شعر، غیر شعر اور نثر-شمس الرحمٰن فاروقی، کیشور کاشن، الہ آباد اکتوبر ۱۹۹۸ء (دوسری اشاعت)
۲۵۔عملی تنقید جلد اول حصہ اول شعر و غزل-کلیم الدین احمد، کتاب غزل پٹنہ ۱۹۶۳ء
۲۶۔کسوف الشمسین-احسن مارہروی، نظامی پریس، بدایوں ۱۹۱۵ء (مولانا شبلی اور مولانا حالی کا مرثیہ جو اصلاً غمِ شبلی اور ماتمِ حالی کے عنوان سے لکھا گیا تھا)
۲۷۔مسرت سے بصیرت تک-آل احمد سرور، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی ۱۹۷۴ء

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University

۲۸۔نظر اور نظریے-آلِ احمد سرور، مکتبہ جامعہ، علی گڑھ ۱۹۷۳ء

۲۹۔ نئے تناظر-وزیر آغا، اردو رائٹرس گلڈ، الہ آباد ۱۹۷۹ء

۳۰۔ یادگارِ شبلی-شیخ محمد اکرام، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۷۱ء

۳۱۔Encyclopaedia of Islam vol.8 اردو دائرۂ معارف اسلامیہ زیر اہتمام دانش گاہ پنجاب لاہور

شعبۂ اردو دائرۃ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور

اخصوصی شمارہ

۱۔ادیب-شبلی نمبر ستمبر ۱۹۶۰ء، علی گڑھ جامعہ اردو جلد ۶ شمارہ ۹

۲۔البصیر-شبلی نمبر جون-دسمبر ۱۹۵۷ء حصہ اردو، اسلامیہ کالج، چنیوٹ

۳۔فکر و نظر-شبلی نمبر جون ۱۹۹۶ء لیتھو آفسیٹ پرنٹرس، علی گڑھ

Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University